

# **DAMAGE BOOK**

UNIVERSAL  
LIBRARY

**OU\_188329**

UNIVERSAL  
LIBRARY



**OSMANIA UNIVERSITY LIBRARY**

Call No. ۴۱۸ ی ی Accession No. ۸۲۷۹

Author کبیر تنکا ۸۲۷۹

Title سیر المفسر (مجلد اول)

This book should be returned on or before the date last marked below.



Checked 1969

## فہرست مضامین

Checked 1970

| صفحہ | مضمون                     | نمبر شمار | صفحہ | مضمون                         | نمبر شمار |
|------|---------------------------|-----------|------|-------------------------------|-----------|
| ۷۱   | میرامن دہلوی              | ۱۱        | ۲    | دیباچہ                        | ۱         |
| ۷۲   | سیردوسرے درویش کی         |           | ۷    | تمہید                         | ۲         |
| ۷۹   | مولوی شیخ حفیظ الدین احمد | ۱۲        | "    | اُردو ہندوستان کی مشترکہ زبان | "         |
| "    | میر شیر علی افشوس         | ۱۳        | ۲۲   | رسم الخط                      | "         |
| ۸۱   | انتخاب از ترجمہ گلستاں    |           | ۲۹   | لٹریچر                        | "         |
| ۸۲   | پہلا دیباچہ               |           | ۳۵   | اُردو کی پیدائش               | ۳         |
| ۸۷   | سید انشا اللہ خاں انشا    | ۱۴        | ۴۴   | نثر مرزا رفیع                 | "         |
| ۸۹   | تصانیف                    |           | ۴۶   | اُردو کا عالم طفولیت          | ۴         |
| ۹۷   | مختلف زبانیں جانتے تھے    |           | ۴۹   | پہلا دور                      | ۵         |
| ۹۸   | لطائف                     |           | ۵۱   | میر محمد عطاء حسین خاں تحسین  | ۶         |
| ۹۹   | انجام امتحان ہوا          |           | "    | ڈاکٹر جان گلکراٹسٹ            | ۷         |
| ۱۰۴  | مولوی شاہ رفیع الدین      | ۱۵        | ۵۴   | سید حمید بخش حیدری            | ۸         |
| ۱۰۶  | مولوی شاہ علیہ لغاورد     | ۱۶        | ۵۶   | نوند آرائش محفل (پہلا قسط)    | "         |
| ۱۰۷  | مولوی نذیر احمد کی رائے   |           | ۶۰   | میر ذوالعلی لطف               | ۹         |
| ۱۰۷  | ترجمہ القرآن پر           |           | ۶۴   | انتخاب از گلشن ہند            | "         |
| ۱۱۰  | مولوی اسماعیل دہلوی       | ۱۷        | "    | اشفہ                          | "         |
| ۱۱۲  | انتخاب از تقویت الایمان   |           | ۶۷   | حسن                           | "         |
| ۱۱۷  | نہال چند لاہوری           | ۱۸        | ۷۰   | میر بہادر علی حسینی           | ۱۰        |

| نمبر شمار | مضمون                   | صفحہ | نمبر شمار | مضمون                        | صفحہ |
|-----------|-------------------------|------|-----------|------------------------------|------|
|           | نمونہ از مذہب عشق       | ۱۱۸  |           | تقریظ لکھنے کا ڈھنگ          | ۱۷۴  |
| ۱۹        | میرزا کاظم علی جوان     | ۱۱۹  |           | نثر اردو                     | ۱۸۱  |
| ۲۰        | سری للو لال کوی         | ۱۲۰  |           | تصنیفات نثر اردو             | ۱۸۲  |
| ۲۱        | مولوی اکرام علی         | ۱۲۱  |           | مولانا حالی کی رائے مرزا     | ۱۸۳  |
|           | نمونہ از اخوان الصفا    | ۱۲۲  |           | کی طرز تحریر پر              | ۱۸۴  |
| ۲۲        | منظر علی ولہ            | ۱۳۳  |           | دیباچہ سراج المعرفت          | ۱۸۶  |
|           | نمونہ از بقیال بحیسی    | ۱۳۴  |           | مولانا ندیم احمد کی رائے     | ۱۸۸  |
| ۲۳        | مولوی امانت اللہ        | ۱۳۵  |           | مرزا کی اردو شاعری پر        | ۱۸۹  |
| ۲۴        | منشی مینی نرائن         | ۱۳۶  |           | اور اس کا جواب ڈاکٹر         | ۱۸۹  |
| ۲۵        | میرزا جان طیش           | "    |           | عبدالرحمن کی طرف سے          | ۱۹۰  |
| ۲۶        | محمد خلیل اللہ خاں اشک  | "    | ۳۲        | ماسٹر رام چندر               | ۱۹۲  |
| ۲۷        | خاتمہ                   | "    |           | حال اقلیدس مشہور مہندس       | ۱۹۳  |
| ۲۸        | دوسرا دور               | ۱۳۸  |           | یونانی کا                    | ۱۹۳  |
| ۲۹        | فقیر محمد خاں گویا      | ۱۴۵  |           | حال والیکسی جی مہاراج        | ۱۹۵  |
|           | بستان حکمت کا نمونہ     | ۱۴۶  | ۳۳        | مولانا غلام امام شہید        | ۱۹۶  |
| ۳۰        | مرزا حجب علی بیگ سرور   | ۱۴۹  |           | رقعہ تننیت و تعزیت آمیز      | ۱۹۸  |
|           | طوطا خزینہ ناجا عالم کا | ۱۵۱  |           | آج کل کے رومنہ کی تعریف      | ۱۹۹  |
|           | گلزار سرور              | ۱۵۲  | ۳۴        | خان بہادر منشی غلام خوشہ بخت | ۲۰۴  |
|           | نمونہ از شمشیر خانی     | ۱۵۴  | ۳۵        | منشی عبدالحکیم               | ۲۱۴  |
| ۳۱        | مرزا اسد اللہ خاں غالب  | ۱۵۵  | ۳۶        | منشی امیر احمد مینائی        | ۲۱۶  |
|           |                         |      | ۳۷        | خاتمہ                        | ۲۲۳  |

# سیرا میں لمصنفین (جلد اول)

جس میں

نثرانِ اُردو کے حالات زندگی اور اُردو زبان کی عہدِ بعد کی ترقی و تبدیلی

کا ذکر کیا گیا ہے

از

جناب مولوی محمد یحییٰ صاحب تنہابی (علیگ)

مترجم شاعرانہ خیالات و تاریخ مغربی یورپ

جس کو

مینسجر دارالاشاعت غازی آباد

نے

مکتوباً لطیف دہلی میں چھپوا کر شائع کیا

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ  
 عَمْدًا وَنَصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِهِ الْکَرِیْمِ

## دیباچہ

»(\*)«

آج سے دس برس قبل یعنی ۱۹۱۲ء میں جبکہ راقم لکھنؤ میں اقامت گزیر تھا  
 خیال پیدا ہوا کہ ”آب حیات“ کے نمونہ پر جو تاریخ نظم اردو کی مقبول کتاب  
 ہے شہر اردو کی تاریخ لکھی جائے، یا بالفاظ دیگر شہر اردو کی باکمال کا تذکرہ  
 تحریر کیا جائے، چنانچہ مصنفین اردو کے حالات زندگی کی جستجو و امنگیر ہوئی،  
 لیکن اسی زمانہ کے قریب قریب جنگ یورپ چھڑ گئی اور سب لوگوں کی توجہ  
 لڑائی کی خبروں کی طرف منعطف ہو گئی، کسی چیز کی جانب نہ وہ التفات رہا اور  
 نہ وہ سرگرمی، بلکہ شب و روز جنگی خبروں کے معلوم کرنے میں وہ انہماک ہو گیا  
 کہ تصنیف و تالیف سے بھی مطلق دلچسپی نہ رہی، یہ حال نہ صرف میرا تھا بلکہ گرد  
 و پیش کے سب لوگوں کو اسی معنی میں مبتلا دیکھتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ دنوں تک  
 اس قسم کی تصنیف کا خیال رہا اور پھر ایسا نیا نیا ہو گیا کہ ۱۹۲۳ء تک بھول کر  
 بھی یاد نہ آیا۔ آخر کار جون ۱۹۲۳ء میں پھر خیال رفتہ رفتہ دل میں جھپکی لی اور اس مرتبہ  
 مصمم قصد کر لیا کہ جو کچھ ہوا و جس طرح ہوا اپنے پُرانے خیال کو عملی جامہ پہناؤں،  
 اگر حسب خواہش حالات بہم نہ پہنچیں یا کتابیں دستیاب نہ ہوں تو جس قدر  
 حالات فراہم ہو سکیں اور جس قدر کتابیں مل سکیں اور ان سے جیسی کچھ کتاب مرتب

ہو سکے پبلک کی خدمت میں پیش کر دوں۔  
 ظاہر ہے کہ ایسی کتاب کے لئے ایک بڑے کتب خانہ کی ضرورت ہے  
 غازی آباد جیسے مقام میں وہ کہاں؟ تاہم دلی کی قربت نے میری مشکل کو  
 کسی قدر آسان کر دیا اور مجھے بہت سا مواد وہاں سے مل گیا، پھر بھی دل  
 کی آرزو دل میں ہی رہی یعنی جن جن کتابوں کے دیکھنے کو جی ترستا تھا وہ  
 دستیاب نہ ہوئیں۔ ناچار جو کچھ میسر ہوا اُس پر قناعت کی گئی۔ پس کتاب موجودہ  
 شکل میں ہدیہ ناظرین ہے۔

خدا کا شکر ہے کہ اب اُردو جو کس میسر کی حالت میں تھی، اہل ملک کی  
 چیت اور پیاری زبان ہوتی جاتی ہے، پہلے انگریزی تعلیم یافتہ اُردو میں لکھنا یا  
 پڑھنا خلافِ شان سمجھتے تھے اور اُردو رسائل و اخبارات پر ایک نظر ڈالت  
 گناہ جانتے تھے لیکن اب وہ حال نہیں رہا۔ نئی نئی کتابیں لکھنے اور پڑھنے  
 کا شوق پیدا ہو گیا ہے اور ہم اپنی زبان کو جملہ اقسام کی کتابوں سے مالا مال دیکھنا  
 چاہتے ہیں۔ چنانچہ اس مقصد کو پیش نظر رکھ کر اس کتاب میں اہل ملک کے سامنے  
 اپنی زبان کی عمدہ کی ترقی و تبدیلی کا ایک خاکہ کھینچا گیا ہے، اگرچہ اس سے  
 ضمناً تاریخ اُردو کی تکمیل بھی مقصود ہے جو اب تک نامتو چلی آتی تھی اور کسی اہل  
 نے ہنوز اس طرف توجہ نہ کی تھی۔

آسمان بابر امانت تو انست کشید قرعہ فال بنام من دیوانہ زدند  
 اس کتاب میں تین دور قائم کیے گئے ہیں، پہلا دور ۱۷۹۸ء سے ۱۸۳۶ء تک  
 تک، دوسرا دور ۱۸۳۶ء سے ۱۸۵۷ء تک اور تیسرا دور ۱۸۵۷ء سے ۱۹۱۴ء  
 تک ہے۔ چوتھا دور ۱۹۱۴ء سے شروع ہو جاتا ہے، لیکن ابھی یہ نہیں کہا جاسکتا  
 کہ کب ختم ہوگا۔ یہ دور دو درجہ حاضر ہے اور اس دور کے مصنفین کس درجہ اور

کس پایہ کے ہونگے، زمانہ آگے چل کر بتائیگا۔ ابھی ان مصنفین کی ابتدا ہے اور خدا بہتر جانتا ہے کہ ان لوگوں کی انتہا کیسی ہوگی۔ فی الحال یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان مصنفین کے حالات سے قطع نظر کی جائے۔ اس بارے میں مولوی عبدالحق بی۔ اے سکرٹری انجمن نرتی اردو اور مولوی عبدالرزاق مصنف البراکہ و نظام الملک طوسی میرے ہمنیال ہیں۔ اگرچہ بعض دوستوں کا یہ بھی اصرار ہے کہ دورِ حاضرہ کے مصنفین کے حالات ضرور داخل کتاب ہوں، راقم کو افسوس ہے کہ وہ اس مشورہ سے فائدہ نہ اٹھاسکا اور ان کے حالات قلمبند کرنے سے قاصر رہا۔ نہ اس وجہ سے کہ ان کے حالات میسر نہ آ سکے بلکہ اس لحاظ سے کہ موجودہ مصنفین کو اپنی تصنیفات پر تنقیدی نظر شاید ناگوار خاطر ہو اور ان کے ہواخواہان و مدح خواں بے لطفی و بد مزگی پیدا کریں۔ پہلے اور دوسرے دور کے مصنفین کے حالات زندگی امتدادِ زمانہ نے ہماری دسترس سے باہر کر دیے ہیں، اس لیے نہایت مختصر اور نہایت قلیل حالات درج ہو سکے جس کا سبب افسوس ہے، تاہم امید ہے کہ اس کتاب کی اشاعت پر ہمارے ناظرین میں تحقیق و تفتیش کی تحریک پیدا ہو جائیگی اور وہ اس کمی کو دور کرنے کی سعی یلین فرمائیں گے، اور ان کی توجہ سے کامل یقین ہے کہ ہم آئندہ نہ صرف موجودہ مصنفین کے حالات زندگی بالتفصیل زیرِ قلم لاس دیکھیں گے بلکہ توقع کی جاتی ہے کہ آئندہ ان دونوں دوروں کے مصنفین کی تعداد میں بھی اضافہ ہو جائیگا۔

تیسرے دور کے مصنفین کے حالات حتیٰ الامکان جس قدر فراہم ہو سکے تحریر کیے گئے ہیں۔ چونکہ یہ سب اصحاب اب سے تیس برس پیشتر زندہ تھے اور بعضوں کے انتقال کو تو صرف دس سال ہی ہوئے ہیں اور

اُن میں حضرت "سُر" اب تک خدا کے فضل سے زندہ اور صحیح و سلامت ہیں، لہذا ان حضرات کے حالاتِ زندگی معلوم کرنا یا ہم پہنچانا دشوار نہ ہوا البتہ "سُر" کے حالاتِ زندگی بہت وقت اور مشکل سے دستیاب ہوئے اور وہ بھی حسبِ منشاء نہ ملے۔

مجھے اس کتاب کے لکھنے میں جو مشکلات پیش آئیں اُن کو میرا دل ہی خوب جانتا ہے۔ ہم میں بعض اصحابِ عنایت ایندوی سے ایسے سعید ہیں جنہوں نے اپنے باپ کے بھی حالاتِ زندگی فراہم کرنے میں دریغ کیا اور اس قدر تکلیف گوارا نہ کی کہ اپنے باپ کے سوانحِ تحریر فراہم کر دیتے۔ راقم کو بطائفِ اکیلِ ٹال دیا۔ بعض اصحاب نے دوسرے بزرگوں کے حالات جن سے وہ واقف تھے قلب بند کرنے میں کوتاہی فرمائی اور جواب لکھنا کسرِ شان سمجھا۔ ہمارے ملک میں گو علمی مذاق روز بروز زیادہ ہوتا جاتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہمسامی ایک صدی تک اس قابل نہ ہوں گے جو مہذب ممالک کے اہل علم کی مہسری تو کیا اُن کی کامل تقلید ہی کر سکیں مجھ کو شرم آتی ہے کہ میں اپنے ہموطن بھائیوں کی علمی عدمِ توجہ کی شکایت کر رہا ہوں لیکن واقعات مجبور کرتے ہیں کہ میں اس شکایت کو زبان پر لاؤں اور اُس کرم گستری اور توجہ کا فکر یہ ادا کروں جو میرے عزیز ہموطنوں کے برعکس ایک شریف امریکن نے مجھ پر مبذول کی۔ وہ جو ہذا:-

راقم نے "سٹر ایمنسن" کی "تایخ مغربی یورپ" کا ترجمہ اُردو میں کیا تھا لیکن کتاب مذکور کا ترجمہ قانوناً بلا اجازتِ اصل مصنف شائع نہیں کیا جاسکتا تھا چنانچہ صاحبِ موصوف کو ایک خط بغرضِ حصولِ اجازت امریکہ بھیجا اور نیز اُن کے حالاتِ زندگی اُن سے طلب کیے اور فلسفہِ تاریخ کے متعلق کتابوں کے نام اور ملنے کا پتہ دریافت کیا۔ "سٹر ابن سن" نے نہ صرف اجازتِ اشاعت ترجمہ فراہم کی بلکہ اپنے

حالاتِ زندگی بھی مجھے شکر گزار کیا بلکہ فلسفہٴ تاریخ پر اور نیز تاریخِ یورپ پر چار  
پانچ ضخیم کتابیں اپنی تصنیف شدہ عنایت فرمائیں۔ انوس ہے کہ تاریخ مغربی یورپ  
ابھی طبع نہیں ہو سکی تاہم یہ واقعہ آواز بلند کدھر ہے کہ ہمارے عزیز مہوطن توسیعِ زبان  
و اشاعتِ علم سے کہاں تک گریز کرتے ہیں، اور متمدن ممالک کے اہل علم اپنے علمی  
مذاق کو وسعت دینے میں کہاں تک غیر ملکیوں کی بھی امداد کرتے ہیں ۷

چراغِ مردہ کجا شمعِ آفتاب کجا

بہیں تفاوت رہ از کجاست تا کجا

شکایت کے دوش بدوش مجھے اپنے اُن احباب کا شکریہ بھی ادا کرنا چاہیے  
جنہوں نے اس کتاب کی تالیف و تدوین میں میری امداد فرمائی۔ سب سے زیادہ لائقِ  
تحتیں و تشکر شیخ محمد اسماعیل صاحبِ احمدی بانی تہی ہیں جنہوں نے تیسرے دور  
کے اکثر مصنفین کے حالاتِ زندگی مطبوعہ و غیر مطبوعہ کا بہت سا مواد مجھے ہم پہنچایا۔  
مولوی عبدالحی صاحب بی۔ اے سکرٹری انجمن ترقی اُردو اور نگ آباد دکن، مولوی  
ظفر الملک ایڈیٹر الناظر لکھنؤ، مولوی بشیر الدین احمد صاحب دہلوی اور باہرام دیال  
صاحب فنانشل سکرٹری ریاست جاوہر بھی میرے دلی شکریہ کے مستحق ہیں جنہوں نے  
مجھے کتابیں ہم پہنچائیں یا اُن کے دستیاب ہونے کے وسائل بتائے یا ضروری مضامین  
نقل کر کر دیا کیے +

محمد یحییٰ تہنابی۔ اے (ملک)

{ غازی آباد  
۱۴ ستمبر ۱۹۲۲ء }

# تمہید

## اُردو ہندوستان کی مشترکہ زبان ہے

ایک مکمل زبان کے لیے کیا کیا چیزیں ضروری ہیں؟ ذرا غور کرنے سے معلوم ہو جائیگا کہ ایسی زبان کے الفاظ میں صورتی حیثیت سے حسب ذیل باتیں ہونی چاہئیں:-

- (۱) اُن کا تلفظ آسان ہو (۲) اُن کے مشتقات آسانی سے بن سکیں
  - (۳) وہ دوسرے الفاظ کے ساتھ آسانی سے ملائے جاسکیں۔
- منفوی حیثیت سے جیسا کہ ”مل“ نے کہا ہے، اس نظام علامہ میں دو باتیں ضروری ہیں:-

- (۱) ہر اسمِ مکرہ کے اپنی جگہ پر مستقل متعین معنی ہونے چاہئیں۔
- (۲) حسب ضرورت ہر مفہوم کے لیے ایک نام مخصوص ہو، یعنی ہر خیال، ہر جذبہ، ہر حالتِ غرض ہر چھوٹی سے چھوٹی کیفیت کے لیے جسے دماغ محسوس کر سکے ایک نام ہو۔ یہ صاف ظاہر ہے کہ مذکورہ بالا شرطیں صرف ترقی یافتہ ہی زبان سے پوری ہو سکتی ہیں، اور زبان کی ترقی اُس قوم کی، جو اُسے بولتی ہے، دماغی ترقی کے متناسب ہوتی ہے، اُن قوموں کی زبان جو تمدن کے اعلیٰ مدارج پر ہیں، لازماً اُن قوموں کی زبانوں سے زیادہ ترقی یافتہ ہوتی ہے جو تمدن کے اُس زینہ پر نہیں ہیں۔

مؤخر الذکر قوموں کی زبانیں قدرتنا ناقص اور کم مایہ ہوتی ہیں، اُن کا سرمایہ الفاظ اس قدر وسیع نہیں ہوتا کہ تمدن قومیں اپنے اعلیٰ خیالات و جذبات کا اظہار اُس کے ذریعہ کر سکیں، غور کرو کہ دنیا کی غیر مہذب اور نیم تمدن قوموں کی زبانوں کی کم مائیگی کا کیا حال ہے؟

اب دیکھو کہ اُردو زبان میں ان امور کی کیا حیثیت ہے؟ ہندی کی اصل کا تائید میں کوئی قطعی پتہ نہیں، تاہم ماہرین زبان کے اجماع عام کی بنا پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہندی دراصل شمالی ہند کی متعدد ابتدائی زبانوں کا ایک مجموعی نام تھا تا کہ وہ مشرقی و مغربی پراکرت زبانوں سے متمایز رہ سکے، یہ ایک قابلِ لحاظ امر ہے کہ وہ زبان جسے ہم آج ہندی کہتے ہیں وہ سنسکرت کی ایک شاخ نہیں بلکہ ہندوستان کے قدیم و اہلی باشندوں کی زبان جو حقیقت میں وہ سنسکرت سے بہت پہلے موجود تھی، اس کے ساتھ ساتھ رہی اور اس کے بعد تک باقی رہی۔ ”سٹریٹ ہیمر“ آجہانی جنہوں نے ہندوستانی زبانوں کا خاص طور پر مطالعہ کیا ہے، کہتے ہیں:-

”سنسکرت عام لوگوں کے لیے نہ تھی، ہر جگہ مقامی زبانیں بولی جاتی تھیں جو سنسکرت سے قبل تھیں، اُس کے ساتھ قائم رہیں اور بعد تک باقی رہیں۔“

مشہور فرہنگ نویس ڈاکٹر فیملین نے اپنی لغت کے دیباچہ میں لکھا ہے:-  
 ”یہ بالکل ممکن ہے کہ آج کل دہقانی ہندی زبان کم و بیش تغیر و تبدل کے ساتھ موجودہ ناخواندہ باشندوں کے ناخواندہ اسلاف کی دہقانی ہندی ہو۔“

لسانیاتی تجربات بتاتے ہیں کہ رفتہ رفتہ اس پراکرت یا ہندی نے

جو ملک کے باشندوں کی سب سے قدیم زبان تھی دو صورتیں اختیار کر لیں۔ ایک صورت ہندوستان میں متحد آئی ہوئی زبانوں کے باہمی اختلاط سے پیدا ہوئی، انگریزوں کے آنے سے قبل ہندوستان میں بہت سی قومیں آئیں مثلاً آریں، ”یونانی“، ”سیتھین“، ”عرب“، ”مغل“ اور ”افغان“ یہ سب اپنے ساتھ اپنی اپنی زبانیں لائیں، لیکن ان میں سے کوئی زبان بھی اتنی قوت نہ رکھتی تھی کہ ملک کی مروجہ زبان کو مٹا سکتی۔ قدرتی طور پر نتیجہ یہ ہوا کہ باہمی اختلاط شروع ہو گیا۔ ہر ایک دوسرے سے اثر پذیر ہونے لگی ایک زبان دوسری میں جذب ہونا شروع ہوئی۔ اس قدیم پراکرت کی ایک صورت ”سنسکرت“، ”زند“، ”یونانی“، ”سیتھین“، ”عربی“، ”ترکی“ اور فارسی زبانوں کے خارجی اثرات کو جذب کرنے لگی، ان میں سے ہر زبان کے حدود اثر اس رقبہ زمین تک محدود تھے جو اس قوم کے زیر اثر ہوتا تھا۔ چنانچہ اسلامی اثران میں سب سے زیادہ نمایاں اور وسیع تھا۔ پراکرت کی یہ صورت موجودہ بول چال میں ہندوستانی یا اردو کے نام سے موسوم ہے۔

پراکرت کی دوسری صورت دیہات میں محدود رہی اور اس لیے اُسے بیگانہ اثرات سے آلودہ ہونے کے بہت کم مواقع ملے، خارجی اثر کو اُس نے بہت کم قبول کیا، اور تھوڑا بہت جو کچھ کیا وہ بھی سنسکرت تک محدود رہا، پراکرت کی یہ خالص صورت موجودہ ہندی کے نام سے پجاری جاتی ہے۔

اصل میں اردو اور ہندی دو مختلف زبانیں نہیں ہیں بلکہ ایک ہی ماں کی دو بیٹیاں ہیں اردو اپنی زندگی کی ہر منزل پر مختلف ضروریات و حالات کے لحاظ سے اپنی اصلاح و ہستی کے لیے اور تہذیب و تمدن کے گونا گوں ذرائع سے اپنی غذا حاصل کرنے کے لیے بدلتی رہی برعکس اس کے ہندی ان اثرات سے پاک و بے آمیز رہی۔ سچ یہ ہے کہ کوئی زبان خارجی اثرات سے بالکل پاک نہیں رہ سکتی۔ تاہم بلا کسی نا انصافی کے یہ کہا جاسکتا ہے کہ سنسکرت

یونانی، ایرانی، عربی، ترکی، اور فارسی اثرات کی آمیزش و اختلاط سے جو پراکرت پیدا ہوئی، اسی درخت کی اُردو ایک قلم ہے اور ہندی صرف سنسکرت کی آمیزش کے ساتھ شمالی ہند کی قدیم اور خالص زبانوں کی ایک یادگار ہے۔  
مختصر یہ کہ حقائق ذیل ناقابل انکار ہیں:-

(۱) آریں قوم کے آنے سے قبل ہندوستان میں متعدد زبانیں مروج تھیں جنکا عام نام پراکرت تھا۔

(۲) سمرجی پراکرت کی وہ صورت تھی جو سرسینا (نواح متھرا کا علاقہ) میں بولی جاتی تھی۔  
(۳) ہندی، اصطلاح میں ایک فارسی لفظ ہے جس کے دو مختلف معنی ہیں۔ وسیع معنی میں اس میں وہ سب زبانیں شامل ہیں جو ہندوستان میں بولی جاتی تھیں۔ محدود معنی میں اس سے ”سمرجی“ یا ”پراکرت“ کی وہ صورت مراد تھی جو شمالی و مشرقی زبان تھی اور جس سے غیر ممالک کے باشندے اول اول دو چار ہوئے۔

(۴) شمالی ہند کی اس ہندی زبان نے رفتہ رفتہ دو مختلف صورتیں اختیار کیں، ایک ناقص جامد اور بے آمیز رہی، دوسری نے نہایت آزادی سے خارجی اثرات کو جذب کیا اور دوسری زبان سے اختلاط قبول کیا۔

(۵) اول الذکر صورت کا قدیم نام ہندی ہی قائم رہا، مؤخر الذکر اُردو کے لقب موسوم ہوئی۔

نتیجہ اب بالکل صاف ہے۔ اُردو جو مختلف تمدن و تہذیب کا مرکز اچھ رہی ہے اور مختلف آریائی اور سامی زبانوں کا عطر ہے ذریعہ تعلیم کے لیے نہایت موزوں ہے اور ملک کی دیگر زبانوں کی بہ نسبت علمی خیالات کے اظہار اور تمدن کی ضروریات کے لیے زیادہ مناسب و بہتر ہے۔

اُردو زبان کا ذخیرہ بھی کثیر ہے۔ ایرانی، یونانی، فارسی، ترکی، عربی اور درجائے

حال میں) انگریزی زبانوں کے مشتقات بے شمار ہیں جو سنسکرت اور قدیم زبان کے الفاظ سے خلط ملط ہو گئے ہیں۔ اس سے جدید مصطلحات کے ڈھالنے میں بڑی آسانی پیدا ہو گئی ہیں۔ جدید مغربی علوم کا اردو مصنف نہایت آسانی سے عربی و سنسکرت، فارسی و انگریزی کے وسیع ذرائع سے کام لے سکتا ہے، بغیر اسکے کہ اپنی خاص زبان کے حسن و خوبی کے پہلو کو نظر انداز کرے۔

ہندوستانی کی بڑی خوبی اس کا عالمگیر ہونا ہے جس کا مقابلہ ہندوستان کی کوئی دوسری زبان نہیں کر سکتی۔ مرہٹی کشمیری، گجراتی بہاریں اور تامل اودھ میں ایسی ہی اجنبی معلوم ہونگی جیسی کہ افریقہ کی بنتو زبان۔ برعکس اس کے ہندوستانی جیسا کہ ہر شخص اس کا تجربہ کر سکتا ہے ہندوستان کے طول و عرض میں بلکہ بیرون ہند کے اکثر مقامات مثلاً عدن، بندر سعید، مالٹا وغیرہ میں ہر جگہ سمجھی جاتی ہے، ہندوستان کی دیگر زبانیں، معاف کیا جائے میر انشا کسی کا استحضار نہیں ہے، زیادہ سے زیادہ صوبہ وار زبانیں ہیں۔ ہندوستانی ہی صرف ایسی زبان ہے جو ہر صوبہ میں بولی اور سمجھی جاسکتی ہے۔ ہندوستانی زبان کا ایک منقول حصہ ہندوستان کی زبان میں شامل ہے، اور یہی سبب ہے کہ اُن صوبوں کے باشندے بھی جہاں ہندوستانی عام طور پر نہیں بولی جاتی اُسکو بالکل ہی اجنبی زبان محسوس نہیں کرتے۔

یہاں ہندوستانی زبان کے متعلق دو ایک یورپین محققین کے خیالات کا پیش کرنا مناسب موقع ہو گا جن سے مذکورہ بالا نتائج پر مزید روشنی پڑے گی۔ جارج کیمبل مصنف انڈیا اینڈ اسٹامٹ بی، نے ہندوستان کی مشترک تعلیمی زبان کے بارہ میں ایک طویل مضمون لکھا ہے:-

”ہندوستانی، ملک کے اکثر طبقوں میں عام طور پر بولی جاتی ہے اور اس سے

زیادہ عام طور پر یہ سمجھی جاتی ہے مسلمان جن کی کہیں زیادہ تعداد ہندوستان میں آئی

اور جنہوں نے اپنی تحریری زبان کو ایک حد تک فارسی رکھا، بول چال میں عام طور پر ہندوستانی ہی کو استعمال کرتے تھے، البتہ انہوں نے اس میں بیرونی الفاظ کی ایک کثیر تعداد داخل کر دی ہے جیسا کہ ہم کبھی وقتاً فوقتاً انگریزی الفاظ کی آمیزش کرنی پڑتی ہے اور آئندہ کرنی پڑیگی۔“

”ان لوگوں کے لیے بھی جو ہندوستانی اچھی طرح نہیں سمجھتے ایک ایسی زبان کا انتخاب کر لینا جس کو ان کے گرد و پیش کے لوگ عموماً بولتے ہوں اور جس کا ایک بڑا حصہ ہندوستان کی تمام زبانوں میں شامل ہے (یعنی ہندوستانی زبان) کہیں زیادہ آسان جو بہ نسبت اس کے کہ وہ ایک ایسی زبان سیکھیں جو بالکل ہی غیر مانوس اور اجنبی ہو۔“

میں یہ تجویز کرتا ہوں کہ تمام اعلیٰ مدارس میں ..... ہندوستانی ہی عام زبان بنی جائے اور زبانیں بھی جہاں تک ضرورت ہو سکھائی جائیں ..... بغیر کسی عام مشترک زبان کے ترقی کرنا محال ہے، اور اگر جیسا کہ میرا خیال ہے انگریزی کو عام بنانا خارج از بحث ہے تو ہندوستانی ہی جہاں تک ممکن ہو، عام و مشترک بنانا بہت بڑا مقصد ہونا چاہیے، بنگالی زبان کے موافق بھی اُس صوبہ میں جہاں کی یہ خاص زبان ہے دلائل پیش کیے جاسکتے ہیں، لیکن حقیقت ہندوستانی تمام طبقات میں اس قدر عام ہے کہ کسی کو اُس کے مقابلہ میں پیش کرنا میرے خیال میں مناسب نہ ہوگا۔“

ایک دوسرے موقع پر اسی مصنف نے لکھا ہے :-

”ہندوستانی، جیسا کہ میں نے کہا ہے ہندوستان کی مشترک زبان ہے، اس حیثیت سے تمام اعلیٰ طبقات میں بلکہ میں یہ کہوں گا کہ تمام اونٹنے طبقات میں بھی (سپاہی، ملازم وغیرہ) تمام پھلانوں اور ہندوستان میں رہنے والے تمام یورپیوں میں عام طور پر بولی جاتی ہے اور اس میں قبول الفاظ کی ایک ایسی عجیب خصوصیت ہے کہ میں نے کسی اور زبان میں نہیں دیکھا۔ اگر کسی لفظ کا بہ آسانی معقول ترجمہ ہندوستانی میں نہ ہو سکے تو اُس کی بجائے کسی

طویل فقرے کی ضرورت نہیں، فوراً ہی وہ لفظ ہندوستانی میں شامل کر لیا جاتا ہے، خواہ وہ فارسی، عربی، پرتگالی، یا انگریزی ہی کیوں نہ ہو۔ اس طریقے کی سہولت اور سہولت مند حیثیت انگیز ہے۔ ہم ہندوستانی کو ہر ضرورت کے لیے استعمال کر سکتے ہیں۔“

میسوگرین ڈی ٹیسی، مشہور فرانسیسی عالم نے ۱۹۰۳ء میں لکھا کہ ”اوپر بیان کردہ آف اورنٹیل لنگویج پر اس میں ہندوستانی زبان پر ایک لکچر دیا تھا، اُس کے بعض اقتباسات ہم ذیل میں درج کرتے ہیں:-

”اُردو نے ہندوستان میں وہی مرتبہ حاصل کیا ہے جو فرانسیسی زبان نے یورپ میں۔ یہ وہ زبان ہے جو بہ کثرت استعمال میں رہتی ہے، یہ عدالت اور شہر دونوں میں استعمال ہوتی ہے، اہل علم اپنی تصنیفات اور شعرا اپنی غزلیں اسی زبان میں لکھتے ہیں۔ یورپین سے گفتگو کا وسیلہ بھی ایک زبان ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ہندو لوگ اُردو ہر جگہ نہیں سمجھتے مگر یہی صورت تو تمام ملک کی زبانوں کے ساتھ ہوتی ہے۔ برٹین (جو فرانس ہی کا ایک صوبہ ہے) کے کسان خواہ پراونسل ہوں یا الساشین، فرانسیسی زبان نہیں سمجھتے، تو کیا یہ اس بات کی دلیل قرار پاسکتی ہے کہ فرانسیسی صوبہ کی عدالتوں اور سرکاری دفاتر میں نہ استعمال کی جائے؟“

”اُردو ہندوستان کے ہر قصبہ و قریہ میں سمجھی جاتی ہے، باوجودیکہ وہاں اور بھی زبانیں بولی جاتی ہیں، شمالی مغربی صوبہ اور اودھ کی تو یہ خاص زبان ہے، یہ صرف ہندوستان کے اندر ہی محدود نہیں ہے بلکہ بلوچستان اور دیگر ممالک میں جو ہند سے ملتی ہیں سمجھی جاتی ہے، یہ امر مشہور و معروف سیاحوں کے بیان سے پایہ ثبوت کو پہنچ چکا ہے۔“

جے ہیمز، مصنف انڈین فلا لوجی کا حسب ذیل بیان ہندوستانی زبانوں کے عمیق مطالعہ کا نتیجہ ہے۔

”میں اس کو (اُردو) مختلف گروہوں کی بڑی اور وسیع زبان کی نہایت ہی ترقی یافتہ اور تمدن صورت خیال کرتا ہوں، صرف یہی نہیں کہ یہ ایک فصیح سلیس اور وسیع زبان ہے

بلکہ اس میں دادی گنگا کی بسنے والی قوموں کی زبان کی پہلی ترقی ظاہر ہو سکتی ہے (رسالہ بنگال ایسیایٹک سوسائٹی جلد ۳۵ صفحہ ۱۸۶۶ء صفحہ ۱۰)

۳۔ ایسے زمانہ میں جبکہ ہندو مسلم اتحاد اور ہندوستانی قوموں کے باہمی میل جول کا غلغلہ بچ رہا ہے یہ یاد رکھنا بہتر ہو گا کہ اُردو اسلامی حکومت کی یادگار نہیں بلکہ ہندو مسلم یکجہتی کی علامت ہے۔ ایک طرف تو عربی و فارسی کے درمیان اور دوسری جانب سنسکرت و پراکرت کے مابین یہ ایک معقول رابطہ ہے۔ ہر زبان کے خزانہ میں خاص اجزاء ضرور دوہوتے ہیں، اسما اور افعال، بقیہ چیزیں ثانوی اور ضمنی ہوتی ہیں۔ اب اگر دیکھا جائے تو اُردو کے تمام اسما و یا تو عربی ہیں یا فارسی اور تمام افعال سنسکرت یا پراکرت اہل سے ہیں۔ آنا، جانا، چلنا، بولنا، مارنا، مرنا، کھانا، پینا، اٹھنا، اُٹھنا، بیٹھنا، بٹھانا، یہ ایسے الفاظ ہیں جن سے کوئی شخص بھی احتراز نہیں کر سکتا۔ برعکس اس کے غیر زبان کے الفاظ مثلاً جنگل، مال، میدان، مکان، حال، کاغذ، تماشہ، سال، دروازہ، سرکار، لشکار، چاؤ ایسے الفاظ ہیں جن کے استعمال سے کسی جاہل و بھٹائی کے لیے بھی بچنا ویسا ہی محال ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ اتحاد و یا تاریخی کی روح تھی جس نے ہندو اور مسلمان دونوں کو ترغیب دی کہ اپنی اپنی زبانیں چھوڑ کر ایسی زبان اختیار کریں جو اصل میں ہندوستانی ہو لیکن اسکی نشوونما خارجی ذرائع پر ہوئی اور باہمی اتحاد و ہمہ روی کی اس روح کا عملی نتیجہ تھی اور آج بھی وہ وفاداری کے ساتھ اُس روح کو ظاہر کر رہی ہے۔

اگرچہ پیشتر یہ ظاہر کیا جا چکا ہے کہ اُردو اور ہندی دراصل ایک ہی بولی کے دو نام ہیں یہ دو الگ الگ زبانیں نہیں ہیں، تاہم بالتفصیل ہم اس امر کا پھر اعادہ کرتے ہیں۔

لہو دونوں کی صرف و نحو میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ مصدر دونوں میں ایک ہیں اشتقاق کے قاعدے یکساں ہیں، جملوں میں لفظوں کی ترتیب ایک ہے، تاکید وغیرہ کے طریقے یکساں ہیں، سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں الفاظ ایسے ہیں جو اُردو میں بھی ہیں اور

ہندی میں بھی۔ ہندی کے حمایتی کہتے ہیں کہ عربی فارسی ملی ہوئی ہندی اُردو ہے، اُردو کے طرفداروں کا قول ہے کہ سنسکرت ملی ہوئی اُردو کو ہندی کہتے ہیں۔ ان دعووں سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ حقیقت میں اُردو اور ہندی ایک ہیں صرف نام کا ابر بھیر ہے، یورپ لوں کی تیز نگاہیں پہلے ہی اس راز تک پہنچ گئی تھیں، اُنہوں نے دونوں کا نام ”ہندوستانی“ رکھ کر یہ جھگڑا چکانا چاہا تھا مگر نام بدلنے سے کام نہ چلا۔ ✓

اول یہ یاد دینا ضروری ہے کہ اُردو کے زور بچڑھنے سے پہلے شمالی ہندوستان میں برج بھاشا کا راج تھا۔ ہما تلسی واس کی بے نظیر کتاب ”رام چرت مانس“ جو دنیا میں رامائن کے نام سے مشہور ہے اسی زبان میں ہے۔ یہ اکبری عہد میں لکھی گئی تھی مگر آج بھی شاعری اسے آنکھوں سے لگاتی ہے اور عقیدت اسے پوجتی ہے، میں اس مقدس کتاب سے کچھ چوپائیاں سناتا ہوں اور برج بھاشا کا نمونہ دکھاتا ہوں۔ سیتا جی کے باپ راجہ جنگ نے عہد کیا تھا کہ جس کی میں اتنی طاقت ہو کہ وہ شیوجی کی کمان چڑھا دے اُس کے ساتھ اپنی بیٹی کا بیاہ رچائیں گے۔ سو میر کیا گیا۔ دو دروڑ سے راجہ مہاراجا اپنا زور اور اپنی قسمت آزمائی کے لیے اُٹے مگر کوئی اس کمان کو اپنی جگہ سے سرکا بھی نہ سکا۔ یہ دیکھ کر راجہ جنگ نے اُن سب کو مخاطب کر کے کہا:-

|                            |                                 |
|----------------------------|---------------------------------|
| کسمو کا ہے یہ لاج نہ بھاوا | کا ہو نہ شکر چا پ چڑھاوا        |
| کو کسی کو یہ نفع نہ بھایا  | کسی نے شکر (کی) کمان چڑھائی     |
| رہا چڑھاؤں تو رب بھائی     | تل بھر بھومی نہ سکیو چھڑائی     |
| رہا چڑھانا توڑنا بھائی     | تل بھر زین نہ سکے چھڑا          |
| تجھو آتش بج گرہ جابھو      | لکھا نہ بد ہی بیدری بیابو       |
| چھوڑ آس اپنے اپنے گھر جاؤ  | لکھا نہ خدا (نے) بیدری (کا) بیا |

جو جنتیوں بن بہت بھی بھائی      تو پرن گز کر تیونہ ہنسائی  
 جو جانتا میں باد زمین (کو) بھائی      تو عہد کر کے کرتا میں نہ ہنسی  
 جنگ بچن سن سب زناری      دیکھ جانکی بھئے دکھاری  
 جنگ (کے) لفظ سن (کے) مدعیاں      دیکھ (کے) جانکی (کو) ہوئے بخیدہ

یہ بھی برج بھاشا یا پڑانی ہندی۔ ظاہر ہے کہ آجکل کے شریف ہندو ہوں یا مسلمان اس زبان میں بات چیت نہیں کرتے ہیں اور ہندی کے پجاری بھی اس زبان کو تمام ہندوستان کی زبان بنانا نہیں چاہتے ہیں، آجکل جس ہندی کا زور ہے اُسے ”کھڑی بولی“ کہتے ہیں۔ آئندہ جہاں کہیں ہم ہندی کا لفظ استعمال کریں گے وہاں اسی ”کھڑی بولی“ سے مراد ہوگی۔ اب آجکل کی ہندی کا نمونہ دیکھیے۔ اس وقت ورتمان اخبار کا ۱۵ اکتوبر کا پرچہ میسر سامنے ہے، اس کی عبارت دو مقاموں سے نقل کرتا ہوں۔ شکل لفظوں کے معنی اُن کے سامنے برکیٹ میں لکھ دیے ہیں۔

(۱) کانپور کے بازار میں جو ولایتی مال آگیا ہے اُس کا کوئی خریدار نظر نہیں آتا۔ اگر منچسٹر والے بیٹہ کاٹ کر واپس کر لیں تو بڑی کرپا (مہربانی) ہو۔ کانپور والے ایسی ہی ایک درخواست لکھ کر بھیجنے والے ہیں۔

(۲) ”سکھ جات (ذات) نے ثابت کر دیا کہ پرتگیہ (عہد) کر کے اُسے اس پرکا (طرح) نہایا (نبا) جاتا ہے۔ اپنا بلدان دیکر اپنے ادھکار (حقوق) اس پرکار (طرح) پر اپت (مائل) کیے جاتے ہیں۔ حقوق حاصل کرنے میں قربانی اس طرح دی جاتی ہے..... سرکار اب گرد و دوارے کے جھگڑے نہٹانے کے لیے ایک بل (Bill) بنانے والی ہے۔ جہاں تک اس بل کے حالات ابھی تک پرکاشت (شائع) ہو چکے ہیں اُن سے پتہ چلتا ہے کہ گرد و دوار بل سکھوں کی ساری اشائوں (امیدوں) پر پانی پھیرنے

والا ہوگا۔..... اس بل میں ایک اور دوش (نقص) ہے، اور وہ یہ ہے کہ اُس کے تینوں ممبروں کو تنخواہ سرکار دیگی، سرکار سے تنخواہ پانے والے آدمی اُس بات کا بھول (یقین) رکھنا کہ وہ اُس موقع پر بھی سکھوں کی بھلائی کرے گا جس سے (دقت) گورنمنٹ کے بے خوف) اور سکھوں کے فائدے کا پریشاں (سوال) اُبھرتا (پیش) ہوگا ہر آنکھ (فضول) ہے۔ ہم سراسر دیکھتے ہیں کہ سرکار سے تنخواہ پانے یا منسٹر بننے کے بعد لوگوں کو ماڈریٹ (Moderate) سبھاؤں تک سے استغفا دینا پڑا ہے..... کیسے آشا (امید) کریں کہ اتنی زبردست بہادر اور اپنے دھارمک (مذہبی) سدھانتوں (اصول) کے سامنے پرانوں (جانوں) کو بھی کچھ نہ سمجھنے والی جات (ذات) کے فائدے کے مقابل میں وہ (وہ) اپنی تنخواہ تنہا (اور) سرکار کے رعب داب کی تنک (ذرا) بھی پروا نہ کرینگے۔

اس پرچے میں سیتلا پرشاد ویشنوی کی ایک نظم بھی چھپی ہے۔ اس کے ابتدائی دو شعر لکھتا ہوں۔

ابر دین خم ہو آنکھوں میں حرکت دُکئی      کیا جانے موت آئی ہو کس بے قصو کی  
حب وطن کی دے ہوں میں مست ہوا      حاجت مجھے نہیں ہے شرابِ ظہور کی  
اسی اخبار کے ۱۸ اکتوبر کے پرچے میں راجہ رام جیسوال کی ایک نظم ہے اس کے بھی دو شعر سن لیجیے۔

بچے سہیہ کی آجکل ہو رہی ہے      اُسیوگ دہارا پیریل ہو رہی ہے  
اکالی توڑتے نہیں کال سے بھی      گورنمنٹ کیوں بے عقل ہو رہی ہے  
اب تو اُردو ہندی کا فرق سمجھ میں آگیا ہوگا حقیقت میں دونوں زبانیں بالکل ایک ہیں اگر کچھ فرق ہے تو یہ کہ:-

۱۔ اُردو میں فارسی عربی کے لفظ زیادہ ہیں، سنسکرت لفظ کم ہیں، اور جو

ہیں بی ان کی صورت کچھ نہ کچھ بدل گئی ہے، ہندی میں اس کا اُن ہے۔ فارسی عربی کے لفظ کم اور سنسکرت کے زیادہ ہیں اور ان میں سے اکثر اپنی اصل شکل میں ہیں (اُن لفظوں کا ذکر نہیں جو دونوں زبانوں میں مشترک ہیں)

(۲) محاورے، کہاوتیں، مثلیں وغیرہ اُردو میں زیادہ تر فارسی اور کچھ عربی سے ترجمہ ہو کر آئیں اور ہندی میں زیادہ سنسکرت سے۔

(۳) اُردو لکھنے والوں کو جب کسی خیال کے لیے بول چال کی زبان میں کوئی لفظ نہیں ملتا تو وہ فارسی یا عربی لفظ لکھ دیتے ہیں۔ ہندی لکھنے والے ایسے موقعوں پر سنسکرت لفظوں سے کام چلاتے ہیں۔

(۴) اُردو میں علمی اصطلاحیں عربی فارسی سے لیتے ہیں اور ہندی میں سنسکرت سے (۵) اُردو میں جب عبارت کو بہت شاندار بنانا اپنی قابلیت دکھانا چاہتے ہیں تو عربی لفظ فارسی ترکیبیں اور عربی فارسی کے شعر اور کہاوتیں وغیرہ نقل کرتے ہیں اور ہندی میں سنسکرت سے مدد لیتے ہیں۔

(۶) اُردو میں استعارے، تشبیس، تلمیحیں وغیرہ عربی اور فارسی ادبیات سے لی گئی ہیں اور ہندی میں سنسکرت لٹریچر سے۔

(۷) اُردو شاعری میں فارسی کا عود قص مستعمل ہے اور ہندی شاعری میں سنسکرت کا۔ (۸) اُردو فارسی حروف میں لکھی جاتی ہے اور ہندی ناگری حروف میں۔ یہی سب کا زیادہ کھلا ہوا فرق ہے۔

ان اختلافات کے دور کرنے کے لیے ترتیباً تدبیریں پیش کی جاتی ہیں۔ اگر ان پر عمل کیا جائے تو رفتہ رفتہ ایک مدت کے بعد وہ دن بھی آ جائیگا کہ یہ دونوں زبانیں ملکر ایک ہو جائیں گی۔

(۱) جب ایک ہی بات کے لیے دو لفظ ملیں تو اسے ترجیح دی جائے جسے زیادہ

آدمی بغیر سمجھائے ہوئے سمجھ سکتے ہوں۔ اس کا ذرا بھی خیال نہ کیا جائے کہ وہ لفظ عربی ہے یا فارسی، سنسکرت ہے یا پراکرت۔ دوسرے اگر لوگ ”عام طور پر“ کسی لفظ کا غلط تلفظ کرنے لگے ہوں تو اُس کو صحیح کرنے کی کوشش نہ کی جائے۔ میری مراد ایسے لفظوں سے ہے جیسے کھیت، برات، بھاگن، توج، نباہ، سنار، چاند، لالین، اردلی، کہ اصل میں کشتیر، بریاترا، بھاگنتر (نون غنہ) نفوذ، نرباہ، سنورنڑکار (نون غنہ) چنڈر، لینٹرن، آرڈرلی ہیں۔ اسی طرح اگر لوگ عام طور پر کسی لفظ سے وہ معنی مراد لینے لگیں گے جس کے لیے وہ لفظ بنایا نہیں گیا تھا تو ہم کو وہی عام فہم معنی مراد لینا چاہیے۔ مثلاً ٹکرا کے معنی جھگڑا، روزگار کے معنی نوکری یا پیشہ، خفیض کے معنی شرمندہ، مغزور کے معنی گھمنڈ، قضا کے معنی موت، عطار کے معنی دوا فروش حجام کے معنی نالی ہی لینا چاہیے، گوکہ عربی اور فارسی میں ان لفظوں کے معنی کچھ اور ہیں۔

(۲) جو محاورے، مثلیں، کہاوتیں لوگوں کی زبانوں پر چڑھ گئی ہیں انہیں سب لوگ استعمال کریں اور اُن محاوروں وغیرہ سے پرہیز کریں جن کا سمجھنے والا لائق نہیں ہو۔ ایک آدمی ہو۔

(۳) نئے خیال اکثر نئی چیزیں دیکھنے یا نئی زبان سیکھنے سے پیدا ہوتے ہیں۔ اگر کسی خیال کے لیے ہمارے پاس لفظ نہ ہوں تو ہمیں نہ سنسکرت کی طرف دوڑنا چاہیے نہ عربی فارسی کی طرف۔ پہلے ہمیں ہندوستان کی دوسری زبانوں کو ٹوٹنا چاہیے اور جہاں کہیں ہمارے کام کا لفظ ملے اُسے لے لینا چاہیے۔ اس ذریعہ سے اردو ہند کی اور ان کی دوسری زبانوں میں میل جول بھی بڑھتا رہیگا اور ہماری زبان کو تمام ہندوستان کی زبان بننے میں زیادہ آسانی ہوگی۔ اگر ہندوستانی زبانوں کا خزانہ اُس لفظ سے خالی ہو تو جس ملک سے وہ نئی چیز آئی ہے یا جس زبان نے وہ نیا خیال ہمارے دل

میں پیدا کیا ہے اُسی سے ہم لفظ بھی لے لیں۔ اب اگر ایک بات کے لیے کئی کئی لفظ آجائیں تو کچھ دن کے بعد دیکھنا چاہیے کہ کونسا لفظ سب سے زیادہ رواج پا گیا ہے اور اُس کو اختیار کر لینا چاہیے۔ ایک صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ وہ نئی چیز ہمیں نے بنائی ہو یا وہ نیا خیال ہمارے ہی دل میں پیدا ہوا ہو، ایسی حالت میں ہم کو ایک نیا لفظ بھی گھڑ لینا چاہیے۔ یہ اس سے بدرجہا بہتر ہے کہ ہم عربی یا سنسکرت کا ایک نہایت مشکل لفظ ڈھونڈ لائیں اور اُسے کسی خاص مفہوم کے لیے استعمال کرنے لگیں مگر کسی دوسری زبان سے لفظ لینے یا نیا لفظ گھڑنے میں یہ خیال ضرور رکھنا چاہیے کہ اُس کی آواز ہماری زبان کے الفاظ سے ملتی جلتی ہوئی ہو، اور ضرورت ہو تو اُس کی صورت میں ایسی تبدیلی کر دیں کہ جب وہ ہمارے لفظوں کی صف میں بیٹھے تو اجنبی نہ معلوم ہو۔

(۴) اس اختلاف کو مٹانے کی وہی تدبیر ہے جو ہم نے ابھی بیان کی، ہماری غرض یہ ہے کہ نہ اُردو لکھنے والے صرف عربی و فارسی ہی سے ہمیشہ مدد لیں اور نہ ہندی لکھنے والے صرف سنسکرت ہی سے۔ نہ انہیں سنسکرت سے ”اسہیوگ“ کرنا چاہیے اور نہ انہیں عربی و فارسی سے ”ترک موالات“۔

(۵) جو لوگ صحیح ذوق رکھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ مشکل لفظوں اور مشکل ترکیبوں کی بھرمار سے نہ عبارت کی شان بڑھتی ہے نہ لکھنے والے کی قابلیت ظاہر ہوتی ہے۔ عربی فارسی یا سنسکرت کے لفظ اور فقرے لکھ دینے سے اُردو یا ہندی کی واقفیت کیسے ثابت ہوگی جن لوگوں کو عربی، فارسی یا سنسکرت میں قابلیت کا دعویٰ ہو وہ انہی زبانوں میں اپنا زور قلم دکھائیں۔ بیچارے اُردو یا ہندی کو کیوں تکلیف دیتے ہیں۔ زبان کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ آسان سے آسان لفظوں میں مشکل سے مشکل اور نازک سے نازک مطلب ادا کر دیا جائے۔ اب رہا اپنی زبان میں دوسری زبانوں کی کہانیاں، مثلثیں اور اشعار وغیرہ نقل کرنا تو جیسی عربی و فارسی، جیسی سنسکرت ویدی پر اکرت، بلکہ

آپ کا جی چاہے تو انگریزی و فرانسیسی، لاطینی و جرمنی، عبرانی و سریانی، چینی و جاپانی عبارت بھی نقل کیجیے مطلب صرف وہی سمجھیں گے جو ان زبانوں سے واقف ہیں۔ ہاں یہاں میں پھر کہوں گا کہ اُردو کے لیے عربی و فارسی اور ہندی کے لیے سنسکرت کو مخصوص کر دینا ٹھیک نہیں۔ اُردو میں سنسکرت کے قول نقل کیجئے اور ہندی میں عربی و فارسی کے۔

✓ (۶) استعارہ، تشبیہ، تلمیح وغیرہ زبان کے زیور ہیں۔ اس طرح کا سامان جتنا زیادہ ہوگا اتنی ہی زبان میں خوبصورتی، لوح، اختصار اور ادائے مطلب کی قابلیت بڑھ جائیگی، اس لیے میری رائے ہے کہ جو تشبیہیں اور استعارے وغیرہ اب تک اُردو سے مخصوص ہیں، ہندی والے بھی اپنے یہاں رواج دیں اور جو ہندی سے مخصوص ہیں وہ اُردو میں لائے جائیں۔ اس طرح دونوں زبانوں میں کچھ خوبیاں بڑھ جائیں گی اور یہ اختلاف بھی رفتہ رفتہ دور ہو جائیگا۔ کہ

(۷) عرصہ کے متعلق اُردو اور ہندی نظموں کے مطالعہ سے ایک بات سمجھ میں آتی ہے اور وہ یہ ہے کہ اُردو میں ہندی کی وہ بحریں لانا چاہیے جن میں روانی کے ساتھ شعر موزوں ہو سکتے ہوں، اور ہندی گوہوں کو اُردو کی بحرؤں سے پرہیز نہ کرنا چاہیے۔ بلکہ میرا تو خیال ہے کہ ”کھڑی بولی“ کی شاعری کے لیے اُردو کی بحرِ پُرانی ہندی بحرؤں سے زیادہ موزوں ہیں میرے اس بیان کا ثبوت یہ ہے کہ آجکل کھڑی بولی کی جو نظمیں پُرانی ہندی بحرؤں میں کہی گئی ہیں وہ کتنی بے مزہ اور روکھی پھکی ہیں۔ تنقید کا عیب ان میں قدم قدم پر موجود ہے اور روانی اور اثر نام کو نہیں ہے۔ ہندی کے بعض شاعروں نے یہ راز سمجھ لیا ہے اور اپنی روش بدلی ہے خلاصہ اس تحریر کا یہ ہے کہ اُردو لکھو تو کو ششقی کرو کہ تمہارا مطلب ہندی جاننے والے بھی سمجھ سکیں اور ہندی لکھو تو وہ زبان اختیار کرو جو اُردو جاننے والوں کے لیے بھی مشکل نہ ہو، اُردو ہندی کے ملکر ایک ہو جانے کی سب سے بہتر تدبیر یہی ہے۔ یہ نکتہ بھی یاد رکھو کہ جو بولتے ہو وہی لکھو، کسی مصنوعی زبان کو رواج دینا فطرت سے لڑنا ہے۔

## رسم الخط

(۸) حروف کا فرق اصل میں سب سے بڑا فرق ہے، میں خود فارسی حروف پسند کرتا ہوں اس لیے اُردو کی موجودہ تحریر پر جو اعتراض کیے گئے ہیں اُن پر ایک نظر ڈالنا چاہتا ہوں۔ ناگری حروف کے طرفدار فارسی تحریر میں یہ نقص نکالتے ہیں کہ اس میں ایک ہی لفظ کو کئی طرح پڑھ سکتے ہیں، ظاہر میں یہ اعتراض بہت وزنی معلوم ہوتا ہے، لیکن اس کا وزن بہت گھٹ جاتا ہے جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ حقیقت میں یہ وقت بہت کم پیش آتی ہے، اتنی کم کہ الشاذ کا المعدوم کا حکم رکھتی ہے۔ ممکن ہے کہ اگر تنہا ایک لفظ یا ایک فقرہ کہیں لکھا ہو تو اُس کے پڑھنے میں کبھی غلطی ہو جائے مگر بالعموم لفظ کسی جملے میں اور فقرہ کی عبارت میں ہوتا ہے اور اُس لفظ کے گرد و پیش کے لفظ اور اس فقرہ کے آس پاس کے فقرے اس کے پڑھنے میں مدد دیتے ہیں۔ ایک بات اور بھی ہے جسے میں ایک مثال دیکھ کر سمجھاؤں گا۔ فرض کیجیے کہ میں لفظ ”خط“ لکھا ہوا ہے، اسے تین طرح پڑھ سکتے ہیں ’خَط‘، ’خُط‘، ’خَطْ‘ مگر ’خُطْ‘ اور ’خَطْ‘ سے ہمارے کان آشنا نہیں اور ’خَطْ‘ پہلے سے ہمارے ذہن میں موجود ہے۔ اس لیے جہاں کہیں ہم ’خط‘ لکھا ہوا دیکھیں گے اُسے بلا تامل ’خط‘ پڑھیں گے۔ اگر کبھی ہمارا ذہن جھٹک کر ’خُط‘ یا ’خَطْ‘ کی طرف چلا جاتا ہے تو یہ خیال کہ جاری زبان میں ’خُط‘ یا ’خَطْ‘ کوئی لفظ نہیں ہے اُسے سیدھے رستے پر لگا دیتا ہے۔ پھر اگر لفظوں پر فقط اور اعراب لگا دیے جائیں تو الگ الگ لفظوں کے پڑھنے میں کبھی غلطی نہیں ہو سکتی، اب خط شکست وہ ناگہی تحریر میں بھی اتنا ہی مشکل ہے جتنا فارسی تحریر میں، اس کے پڑھنے کے لیے دونوں صورتوں میں کافی مشق اور مہارت کی ضرورت ہے۔ اُس کے علاوہ میرا تو خیال ہے کہ اُردو کی اُس تحریر کا جس پر اعراب نہ لگے ہوں ناگری سے نیک کیفیت سے مقابلہ کرنا چاہیے کیونکہ کبھی اصل میں بے اعراب کی ناگری تحریر ہے جس طرح

عجالت کے خیال سے کیتھی میں پائی اور ماترا وغیرہ نہیں لگاتے ہیں اسی طرح اردو میں زیر، زبر، پیش وغیرہ نہیں دیتے۔ اور جس طرح کیتھی کو بغیر پائی اور ماترے کے صرف قرینے سے صحیح پڑھ سکتے ہیں اسی طرح اردو کو بغیر اعراب کے۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ غلطی کا احتمال کیتھی میں اردو سے کہیں زیادہ ہے۔ اگر بغیر اعراب کے اردو میں ایک لفظ بائچ طرح پر پڑھا جاسکتا ہے تو کیتھی میں دس طرح پر۔

اردو کی تحریر پر دوسرا اعتراض یہ ہے کہ اُس کا سیکھنا مشکل ہے۔ یہ سچ ہے کہ ہندی لکھنا اردو لکھنے سے جلد آجاتا ہے۔ سیرا خیال ہے کہ معمولی آدمی ہندی لکھتا تین دن میں اور اردو لکھنا ایک ہفتے میں سیکھ سکتا ہے۔ لیکن، اب ذرا اس بات پر یوں نظر کر دو کہ اگر ایک آدمی میں برس تک برابر اردو حروف میں لکھتا رہے اور دوسرا ہندی حروف میں تو کون کتنا زیادہ لکھ ڈالے گا اور سچ کو کہ ابتدا میں جو چار دن کا نقصان ہوا تھا اس کے بدلے میں کتنا نفع ہوگا۔ ہے یہ کہ اردو میں لکھنے کا وہ ڈھنگ اختیار کیا گیا ہے جو مختصر نویسی کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔ اُس کی بہت بڑی خوبی یہ ہے کہ لکھنے میں وقت بھی کم لگتا ہے اور کاغذ بھی اور کون عقلمند ہوگا جو اس محبت پسندی اور اقتصادی کشمکش کے زمانہ میں وقت اور کاغذ کی یہ بچت نظر انداز کر دینگا۔ اس مقام پر مجھے یہ بھی بتادینا چاہیے کہ آجکل کچھ لوگ اردو رسم الخط میں ایسی اصلاحیں سوچ رہے ہیں کہ اعراب کی ضرورت ہی باقی نہ رہے یا اگر رہے تو بہت کم اور جو لکھا گیا ہے اس کے سوا کچھ اور نہ پڑھا جاسکے جس وقت یہ ہلکا پس مکمل ہو جائیں گی اُس وقت شاید کسی زبان کی تحریر اردو کی تحریر کا مقابلہ نہ کر سکے گی۔<sup>۱</sup> حقیقت میں اردو کی تحریر میں اگر کوئی وقت ہے تو یہ کہ بعض آوازوں کے لیے کئی کئی حروف استعمال کیے جاتے ہیں۔ ا۔ ح، ت۔ ط، س۔ ث، ص، ز۔ ذ، ض۔ ظ۔ ہ۔ ح، ان میں سے ہر مجموعے کے حروف اردو میں ایک ہی آواز ظاہر کرتے ہیں (عربی کا ذکر نہیں) جن آوازوں کے لیے ث، ح، ذ، ص، ص، ط، ظ، ح یہ آٹھ حروف

ایجاد کیے گئے ہیں وہ ہماری زبان میں موجود نہیں ہیں، اس لیے بظاہر یہ فیصلہ بالکل صحیح معلوم ہوتا ہے کہ یہ حرف اُردو کے حروفِ تہجی سے خارج کر دیے جائیں، مگر جہاں تحریر کی آسانی اہم نکالنا چاہتی ہے وہاں بعض وجہیں اُن کی سفارش بھی کرتی ہیں۔ اول تو جن لفظوں میں یہ حرف آجاتے ہیں وہ اپنی اصل کا پتہ دیتے ہیں۔ اور یہ اتنی بڑی خوبی ہے کہ کوئی علم اللسان کا ماہر اس کے مقابلے میں تحریر کی آسانی کی کچھ بھی پروا نہ کرے گا۔ اُردو کے بعض لفظوں کا اِلا اُن کے تلفظ کے مطابق نہیں ہے مثلاً ”بالکل“ ”خواہش“ مگر ان میں بھی یہی خوبی موجود ہے۔ انگریزی الفاظ میں بھی بعض حروفِ محض اصل کا پتہ دینے کے لیے قائم رکھے گئے ہیں ورنہ تلفظ کے لحاظ سے اُن حروف کی اِلا میں کچھ ضرورت نہ تھی دوسرے بہت سے لفظ جو تلفظ میں یکساں اور معنی میں مختلف ہیں جب لکھ دیے جاتے ہیں تو اپنے معنی آپ بتاتے ہیں۔ جیسے ثواب + صواب۔ نال + نقل۔ نذیر + نظیر وغیرہ یہ بھی ایسی خوبی ہے کہ نظر انداز نہیں کی جاسکتی۔ ۱

۲۔ یہ بات بھی غور کرنے کے قابل ہے کہ اُردو کا موجودہ طرزِ تحریر وہ ہے جو بہت خفیف سے تغیر کے ساتھ ایشیا کے کئی ملکوں یورپ کے بعض خطوں اور افریقہ کے زیادہ حصے میں رائج ہے، اس لیے اگر ملک کی مشترکہ زبان کے لیے ہم اسی کو اختیار کر لیں تو جہاں اُردو زبان ہندوستان کی مختلف قوموں کو ایک کر سکتی ہے وہاں اُردو کی تحریر بھی مختلف ملکوں سے اتحاد پیدا کرنے کا ایک ذریعہ بن سکتی ہے۔ یہ ایسی صفت ہے جو ہندوستانی زبانوں میں اُردو کے سوا کسی کو نصیب نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ اتحاد ہی نے اُردو کا بیج بویا اتحاد ہی نے اسے سینچا، اتحاد ہی کی ہوا میں یہ پودا پھپکا، پھولا، پھلا اور ایک چمنزارِ خوشبو ہو گیا۔ اس کے سائے میں اتحاد کی کیفیت ہے۔ اس کی ہوا میں اتحاد کا اثر ہے اور اب بھی اُسے سرسبز رکھنے کے لیے اتحاد ہی کی آبیاری کی ضرورت ہے۔

رسم الخط پر اب ہم حقیقہً نظر ڈالتے ہیں کیونکہ اب تک جو کچھ لکھا گیا تھا وہ سطحی

طور پر جو خیالات دہن میں آگئے تھے تحریک دہے گئے تھے۔ لیکن عالم علم اللسان اس مضمون کو کس نظر سے دیکھے گا وہ بھی ہم ذیل میں درج کرتے ہیں اور بعض جگہ اگر ہم اپنے کسی خیال کا دیگر الفاظ میں اعادہ کریں تو قابل معافی تصور کیے جائیں۔  
 کسی رسم خط کے محاسن و معائب دو طریقے سے پرکھے جاسکتے ہیں:  
 (۱) بلحاظ خواندگی۔ (۲) بلحاظ کتابت۔

ہم ان دونوں پہلوؤں پر علیحدہ علیحدہ غور کرتے ہیں۔  
 ماہرین لسانیات (فلا لوجسٹ) گروہ کا اتفاق ہے کہ ہر مکمل نظام تہجی میں (۱) ہر علیحدہ مفرد آواز کو ادا کرنے کے لیے ایک علیحدہ اور مستقل حرف (کیرکٹر) ہونا چاہیے اور مفرد اصوات کے علاوہ اور کسی آواز کو علیحدہ مستقل حرف سے نہ ادا ہونا چاہیے۔ (۲) جو اصوات مفردہ اصلاً ایک ہوں، ان کے طول و اختصار بستی و بلندی و دیگر تغیرات حالت کے ادا کرنے کے لیے مستقل حروف نہیں بلکہ مختلف حرکات یا اعراب ہونے چاہئیں۔  
 ہر ابجد یا نظام تہجی کے تمام حروف ان آوازوں کے جوہر لینے میں پیدا ہوتی ہیں، مرئی نشانات ہوتے ہیں، یہ حرف تحریری زبان سے متعلق ہوتے ہیں، اور آوازیں تقریری زبان سے حروف بجائیہ کی خاص غرض یہ ہوتی ہے کہ تقریری زبان کو آنکھوں کے سامنے موزوں علامات کے ذریعہ سے لے آئیں، اس لیے حروف بجائیہ کی خوبیوں کا معیار صرف یہ ہے کہ وہ کس صحت و احتیاط کے ساتھ اصوات کی ترجمانی و نمایندگی کرتے ہیں غیر ضروری حروف کی افراط اور مرکب حروف علت یا مرکب در مرکب حروف کا مجمع ہونا کسی ابجد کے حسن و خوبی کی دلیل نہیں ہو سکتی بلکہ اس کے قبح و نقص کے ثوابہ سے ہے۔

اس معیار پر پرکھنے کے بعد اردو نظام تہجی اپنے حریفوں سے نہایت آسانی سے بازی لیجاتا ہے، اس میں تمام بڑی، چھوٹی، مفرد آوازوں کو ادا کرنے کے لیے مفرد حروف علت و مفرد حروف صحیحہ کی صورت میں حروف و نشانات موجود ہیں لیکن ساتھ ہی

ساتھ مرکب حرف علت اور مرکب حروف صحیح کی آوازیں کے ظاہر کرنے کے لیے کوئی حرف نہیں ہے۔ ناگری نظام تہجی کے مرکب حرف علت اور مرکب حروف صحیح کی آوازیں کو ظاہر کرنے کے لیے پیچیدہ اور غیر ضروری حروف ایجاد کر کے اردو نظام تہجی کو خواہ مخواہ دشوار بنایا گیا ہے۔ نہ دوسم کے حروف یعنی ابتدائی دثنوی قرار دیکر اس پر غیر ضروری بار ڈالا گیا ہے۔

اردو نظام ہجائی میں حسب ذیل وزن آوازیں ہیں:-

(۱) تین اصلی حروف علت ہیں جو کسی طلمدہ حرف سے نہیں بلکہ نشانات سے ظاہر ہوتے ہیں، ان نشانات کے نام فتح، ضمہ، وکسرہ ہیں۔ (۲) تین ویسے ہی کیسٹنکٹر پڑے جانے والے حروف علت ہیں جو ماقبل آہستہ پڑے جانے والے حروف علت کے بعد ہی آتے ہیں۔ مثلاً الف ساکن ماقبل مفتوح سے لمبی آواز پیدا ہوتی ہے جیسے چال اور سال میں۔ اسی طرح واؤ ساکن ماقبل مضموم سے ایسی آواز پیدا ہوتی ہے جیسے نور اور طور میں۔ اسی طرح یائے ساکن ماقبل مکسور سے ایسی آواز پیدا ہوتی ہے جیسے نیل اور فیل میں۔

(۳) دو لمبے ہوئے حروف علت، واؤ ساکن، ماقبل مفتوح سے ایسی آواز پیدا ہوگی جیسے غور اور جور میں۔ اسی طرح یائے ساکن ماقبل مفتوح سے ایسی آواز پیدا ہوگی جیسے قیصر میں۔

(۴) دو فارسی حروف ہیں جو مجہول کہلاتے ہیں۔ (۱) واؤ مجہول جیسے شور میں (۲) یاء مجہول جیسے تیل میں۔

اصل میں اردو نظام تہجی کا ماخذ عربی ہے لیکن گھمینی یا آخا ذی کا ملکہ جو اردو زبان کی شہرت میں داخل ہے رسم الخط کے سلسلہ میں بھی ظاہر ہوا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اردو نظام تہجی عربی، فارسی اور سنسکرت نظامت ابجدی کا گلدستہ بن گیا اور علاوہ اس کے بہت سے غیر عربی انسل حرف بھی شامل ہو گئے۔ جیسے پ، ت، چ، ٹ، گ، اور ہائے دوچشمی۔

ان محسن ترکیبی کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ اردو نظام تہجی، صوتی حیثیت سے اتنا مکمل بن گیا جتنا کسی انسانی زبان کے لیے ایک ممکن تھا۔ عربی حروف تہجی پر بحث کرتے ہوئے مسلم نپٹن نے کہا ہے کہ مکمل زبان وہ ہے جس میں ہر وہ خیال جو انسانی دماغ میں آسکتا ہے، نہایت صفائی اور زور کے ساتھ ایک مخصوص لفظ کے ذریعہ سے ظاہر کیا جاسکے۔ خیالات اگر سادہ ہوں تو الفاظ بھی سادہ اور اگر خیالات مشکل ہوں تو وہ بھی مشکل۔ اسی اصول کی بنا پر کئی کم خط وہ ہے جس میں اسی زبان کی ہر آواز کے لیے ایک مخصوص نشان ہو۔ اس لحاظ سے قدیم فارسی درجہ کمال کے قریب تر ہے، لیکن عربی نظام تہجی جسے تمام اسلامی قوموں نے اختیار کیا ہے، عربی لکھنے کے لیے اس درجہ تکمل ہے کہ ایک حرف بھی بغیر دشواری محسوس کیے ہوئے لکھایا بڑھایا نہیں جاسکتا۔

مسٹر مومون کے یہ خیالات اردو نظام تہجی پر بھی حرف بحرف چپاں ہوتے ہیں۔ اب اس مسئلہ کو کتابت کے نقطہ نظر سے دیکھو، ایک ضروری امر جبہ و مخارج نظام تہجید میں نظر انداز کر دیا جاتا ہے یہ ہے کہ تحریری نشانات دو قسم کے ہوتے ہیں۔ حروف علت اور حروف صحیح۔ حروف علت تمام قسم کی آوازیں کی بنیاد ہیں، اور حروف صحیح کے آثار چڑھاؤ کو بتانے میں حروف صحیح اصوات طبعی کی نیابت کرتے اور ان کے باہمی تغیرات کو ظاہر کرتے ہیں۔ حروف علت کو کوئی اپنی مستقل آواز نہیں رکھتا بلکہ اس کا کام حروف صحیح کے تلفظ میں مدد دینا ہے اور بس۔ دیگر زبانوں نے ان دونوں قسم کے حروف کے درمیان اس امتیاز کو نظر انداز کر دیا ہے، لیکن اردو نے حرف علت کو کوئی مستقل حرف یہ تسلیم کر کے اس امتیاز کو قائم رکھا ہے، اس لحاظ سے کوئی زبان اسکی مہسری کا دعویٰ نہیں کر سکتی۔ اس میں حروف علت حروف سے نہیں بلکہ صرف اعراب سے ظاہر ہوتے ہیں، حروف علت بذات خود مستقل آوازیں نہیں ہیں بلکہ محض اصوات کے لب و لہجہ، آثار چڑھاؤ میں مدد دیتے ہیں۔ اردو کو حروف علت کو بحیثیت حروف کے کوئی جگہ نہیں دیتی بلکہ صرف نشانات سے انہیں ظاہر کرتی

ہے اور یہ بالکل بجا ہے۔

یہ اعتراض کہ معمولی تحریریں نشانات نہ ہونے سے ایک ہی لفظ مختلف طریقوں سے پڑھا جاسکتا ہے بالکل بے بنیاد ہے، جیسا کہ ایک مشہور عالم نے کہا ہے کہ ان نشانات کے حذف کر دینے سے پڑھنے والے میں اس قدر ملکہ و مہارت ہو جاتی ہے کہ وہ نشانات کی مدد بغیر پڑھ کے یہ نشانات اس غمن سے نہیں حذف کیے جاتے کہ مبتدی یا وہ لوگ جو زبان سے نا آشنا ہیں جھنک جائیں۔<sup>۱</sup> اردو طرزِ تحریر میں ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ پڑھنے اور لکھنے میں کم محنت صرف ہو۔ اردو طالب علم کی ترقی تعلیم کا یہ ایک جزو ہے کہ وہ بلا نشانات کے بھی صحیح لکھ پڑھ سکے اور اس میں شبہ نہیں کہ جلد ہی وہ ایسا کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ لیکن ہندی کا طریقہ تحریر کوئی ایسی تعلیم نہیں دیتا۔ ہندی عبارت سے کوئی منترہ (نشان) ہٹا دو اور سچا رہ ہندی کا طالب علم اندسے کی طرح بے بس ولا چار ہو جاتا ہے۔<sup>۲</sup>

یہ خیال کہ اردو خط شکست اس قدر مشکل اور بے قاعدہ ہے کہ پڑھنا دشوار ہے بالکل طفلانہ ہے۔ ہر زبان کے روزمرہ کی طرح ہر طرزِ تحریر کی ایک رواں اور شکست صورت بھی ہے، اردو میں یہ کوئی انوکھی بات نہیں ہے، اس کا قاعدہ اُس کے رواں ہونے ہی میں ہے۔ اور اس کا استعمال صرف اُن کے لیے ہے جو اردو زبان سے بخوبی واقف ہیں۔

۴ اردو کتابت ایک طرح کی مختصر نویسی ہے، ہر حرف کی پوری شکل کے علاوہ ایک مختصر صورت بھی ہوتی ہے اور یہ انہی مختصر صورتوں کو جوڑ کر لفظ بنانے کا طریقہ ہی ہے جس نے اردو کو لکھنا اس قدر سہل کر دیا ہے۔ اس سے حسبِ ذیل فوائد ہیں:-

(۱) جگہ کی کفایت (۲) وقت کی کفایت (۳) لکھنے والے اور پڑھنے والے دونوں کے لیے قوت (انرجی) کی کفایت۔

اردو رسم خط تھوڑے تغیر کے ساتھ تمام اسلامی ممالک میں رائج ہے۔ بنگال کے

مشرقی سرے سے لیکر مغرب میں طرابلس اور مراکش تک استعمال کیا جاتا ہے۔ ایک ایسے رسم الخط کے استعمال کرنے میں جو نہ صرف ہندوستان بلکہ افغانستان، بلوچستان، اسلامی ترکستان، ایران، عراق، عرب، شام، فلسطین، ترکی، مصر اور افریقہ کی بعض دیگر ریاستوں میں بھی رائج ہے جو بین الاقوامی فوائد میں وہ ایسے کم نہیں کہ نظر انداز کیے جاسکیں۔

## لٹریچر

غیر اردو داں طبقہ کا عام خیال ہے کہ اردو زبان کوئی قابل ذکر لٹریچر نہیں رکھتی۔ اردو زبان کے بعض بڑے ماہرین مثلاً سر چارلس لائل اور سر چارلس گرین بھی اس خیال سے صاف اور پر زور طریقہ اختلاف نہیں ظاہر کرتے۔ یہ یقین گواہی دے گا کہ عام ہے لیکن حقیقت و اہلیت سے کوسوں دور ہے۔

یہ سچ ہے کہ ترقی یافتہ مغربی زبانوں کے مقابلہ میں اردو کوئی وسیع علم ادب نہیں رکھتی لیکن ہندوستان کی ملکی زبانوں کے لحاظ سے اردو کو بے مایہ کہا جائے تو یہ دعویٰ نہایت آسانی کے ساتھ غلط ثابت کیا جاسکتا ہے۔ لٹریچر کی وسعت کوئی مستقل بالذات شے نہیں ہے بلکہ اضافی شے ہے جبکہ اندازہ اور زبانوں کی نسبت سے ہی ہو سکتا ہے۔ اس بنا پر دنیا کی کوئی زبان قطعی طور پر وسیع و سرایہ دار نہیں کہی جاسکتی۔

سرایہ ادب کو دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ (۱) اہل (۲) نقل۔ اصل سے مراد مجتہدانہ مضامین ہیں، نقل میں وہ ذخیرہ شامل ہے جو دوسرے لٹریچر سے ترجمہ، تالیف و تلخیص کے ذریعہ حاصل کیا جاتا ہے۔ اب اردو لٹریچر پر ان دونوں پہلوؤں سے غور کرو۔

پہلے نقل کو، نظم و ڈراما میں دنیا کی بہت سی زبانوں نے اردو میں جگہ پائی ہے۔ ہومر کی ایلیڈ، جمابھارت، رامائن (معنفہ و المیکی اور تلسی داس) کالیداس کی شکنتلا، پیکلبر (میگہ دوت) اور دوسری قصینض، بلطن کی فردوس گم گشتہ (پیرا ڈائنڈ لاسٹ) اور ٹیگور

کی گیتا بھلی، چترا، نیز و دیگر تصانیف اُردو داں حضرات کی نظر سے آسانی گزر سکتی ہیں۔  
 شیکسپیر کو غالباً ان میں سب سے زیادہ مقبولیت کا درجہ حاصل ہے۔ اس کے بہت سے  
 ناموں کا ترجمہ ہو چکا ہے جو انہیں پرکھتے جاتے ہیں اخیلو، خون ناحق (ریلیٹ) ہنغین  
 (لنگ لیر) (دی ٹیمپسٹ) بزم فانی (رومیا اور جولیت) انگشتری (سمبلان) دلفروش  
 (دی مرچنٹ آف وینس) مرید شک (ڈنٹز ٹیل) شہید ناز (مشیر فار مشیر) بھول بھلیاں  
 (دی کامیڈی آف ایررز) اور ازیولاٹنگ اسٹ عرصہ سے اُردو میں موجود ہیں شیرڈن  
 کے بعض نامک مثلاً اسیر حرص (پزیرد) سو فوکلس اور سیفو، وینیٹی اور گیلے، لانگ  
 فیلو اور ساؤدی، شیلے اور بائرن اور ورڈس ورثہ اور ٹینیسن کی اکثر جدید نظمیں  
 اُردو میں آگئی ہیں۔

ناول یا فائنہ نگاری میں ریٹالڈ کے بعد جس کی تصنیفوں میں ہندوستانی نوجوانوں  
 کے لیے جادو بھرا ہے، اسکاٹ میری گریلی اور کانن ڈائل مقبول ترین مصنفین میں سے ہیں  
 ان کی بہت سی تصنیفات کے اُردو ترجمے وادی گنگا میں کہیں زیادہ کچپی کے ساتھ پڑھے  
 جاتے ہیں، بہ نسبت اسکے کہ ان کے خاص وطن سواحل طیمز پر پڑھی جاتی ہوں۔ بینکم چندر  
 کی تقریباً تمام تصنیفیں اور ٹیگور کے اکثر قصے بھی اُردو میں ترجمہ ہو چکے ہیں۔ آر ایل سٹون  
 رائڈر میگروڈ، اسکر وائلڈ، برنرڈشا اور ایچ جی ویلز بھی مقبول ہو رہے ہیں۔  
 نثر لکھنے والوں میں میکالے اور کارلائل، اسمائلز اور لیویک اُردو داں طبقہ میں  
 روشناس ہو چکے ہیں۔

فلسفہ اور علم النفس میں افلاطون کے متعدد مکالمے، ارسطو کی تصانیف اور  
 چانکیہ کے نصاب کے انتخابات، سینکا کے خیالات (رٹلکشنز) برہکلی کے مبادی و  
 مکالمات، لیبان کی روح الاجتماع (دی کراؤڈ) اور فلسفہ انقلاب لائم (سائیکا لوجی آف  
 دی ایوولوشن آف پیپلز) نیز بیکن، ہیوم، کینٹ، مل، ہابز جیمز اور اسٹوٹ

کی تصانیف کے حصے اردو میں ہیں۔

تاریخ ویرمن پلوٹمارک کی مشاہیر یونان و رومہ (لائبزر آف ایسینٹ گرکس  
ایڈرومنز) تحیکر اور شویل کی تاریخ یورپ (جنرل ہسٹری آف یورپ) ڈوزی کی  
اسلاک اسپن، ویلس کی تاریخ روس (ریشیا) ایسٹ کی نیپولین اعظم (نیپولین)  
گرین ہسٹری آف دی انگلش میل، ونسنٹ اسمتھ، ہند قدیم (این شینٹ انڈیا)  
الفنسٹن کی تاریخ ہندوستان (ہسٹری آف انڈیا) میلکم کی تاریخ ایران (ہسٹری آف  
پرشیا) اور گین کی رومن امپائر کے حصے قابل ذکر ہیں جن سے اسی پایہ اور مرتبہ کی اور تصانیف  
کی تشریح ہو سکتی ہے۔

سیاسیات و اقتصادیات کے میدان میں ذیل کے نام کافی ہونگے:-

ارسطو کی پالیٹکس، مل کی آزادی (لبرٹی) معلم السیاست (ریپرنٹینٹو گورنمنٹ)  
اور سیاست مدن (پولیٹیکل اکائی) بل کی قوانین دولت (لاز آف ولیم) مارلے کی علم السیاست  
(کمیا دلی) اور رینی سینز، کرزن کی پرشیا، مینرہی کی ڈیوٹیز آف مین، شوستر کی فقاریان  
(اسٹریٹلنگ آف پرشیا) بلنٹ کی فیوچر آف اسلام، وینبری کی مستقبل اسلام  
(فیوچر آف اسلام) نیز سیلے ویٹھلی، ولسن و پولک، جوج و جونیوز، مارشل و  
مارسین کے بعض حصے۔

علم السیاست (پولیٹیکل سائنس) کے ساتھ ساتھ فلسفیانہ تاریخ کا شعبہ بھی ہے اور اس  
شعبہ میں بکل کی تاریخ تمدن، ہسٹری آف سیولیزیشن، گوڈنٹ کی تمدن انگلستان،  
سویلریشن ان انگلینڈ لی بان کی تمدن عرب (سویلریشن آف دی عرب) تمدن ہند  
سویلریشن آف انڈیا کی کئی کی تاریخ اخلاق یورپ (یورپین مارلز) ڈریپر کی نیکمپول  
ڈولپمنٹ آف یورپ اور دت کی تہذیب قدیم ہندوستان (ایسٹ انڈین سویلریشن)  
کے ترجمے بنائے جاسکتے ہیں۔

تعلیم میں ٹاڈ وغیرہ کی چھوٹی چھوٹی کتابوں کے علاوہ اُردو، اسپنسرزین، فزیکل سٹائلز می، ہربرٹ، اور مانٹی سوری کی تصانیف نئے آشنا نہیں ہے۔

سائنس میں ڈریپر کی معرکہ مذہب و سائنس (کانفلکٹ بٹون ریجین اینڈ سائنس) جیسے عام طرز کے کئی مقبول رسالوں کے علاوہ اُردو داں طبقہ ڈارون اور ویلینس، ہیکل اور ہیکس، لائل اور لیکی، ٹنڈال اور بوس، کلون اور میکسول، کروکس اور لاج کے انکشافات و تصنیفات سے معقول حد تک آشنا ہے۔

قانون، فقہ، اور طبی کتابوں کے تراجم کا ذکر کرنا بے سود ہے۔ کیونکہ ان مضامین کی بہت سی کتابیں بمقتضائے ضرورت اُردو میں منتقل ہو کر آگئی ہیں۔

یہ واضح رہے کہ فہرست بالا میں جامعیت و استقصاء کا خیال بالکل نہیں رکھا گیا ہے جو نام جب بتا دے اس کے لکھ دیے گئے ہیں تاکہ ناظرین کے ذہن میں ایک خاکہ قائم ہو جائے کہ اُردو لٹریچر غیر زبانوں کے خزانے سے کس قدر بہرہ یاب ہے، ان کی مکمل فہرست تیار کرنے کے لیے سینکڑوں صفحے چاہئیں۔

ایک دوسرا امر قابلِ لحاظ یہ ہے کہ فہرست بالا صرف مغربی لٹریچر تک محدود ہے اس کے علاوہ مسلمانوں کے لٹریچر کا سارا عربی و فارسی خزانہ اور ہندوؤں کی سنسکرت و ہندی کا خزانہ ایک حد تک اُردو میں آگیا ہے۔ قرآن شریف، گیتا، پران، مہابھارت اور رامائن میں سے ہر ایک کے اُردو میں متعدد ترجمے ہیں، پیغمبر اسلام، حضرت مسیح سری کرشن، سری رامچندر، گوتم بودھ، گرو نانک اور کبیر داس کی سوانح و تعلیمات، ہندو سنیا سی اور جوگیوں مثلاً وشنیشہ، اہل معرفت و صوفی شعرا مثلاً مولانا رومی اور حافظ، معلم اخلاق والہیات مثلاً سعدی و غزالی۔ رزمیہ شعراء مثلاً فردوسی، فلسفی مثلاً ابی سینا، مورخین مثلاً ابن خلدون، ابن خلکان اور فرشتہ کی تصانیف اُردو لٹریچر کے خزانہ میں بعض بہترین جواہرات میں سے ہیں۔

۱۔ مجتہدانہ و طبعزاد تصانیف پر طویل گفتگو کی ضرورت نہیں، ان کے لیے کوئی ایسا مادی معیار قائم نہیں کیا جاسکتا، جس پر مختلف مصنفین کی خوبیاں پرکھی جاسکیں صرف مذاق سلیم ہی اس کا فیصلہ کر سکتا ہے۔ شعرا کے طبقہ میں تیسرے و درجہ، غالب و حالی، انیس و دبیر، آتش و داغ اپنے اپنے رنگ میں روح شاعری کے بہترین نمونے ہیں۔ حال ہی میں اکبر الہ آبادی کا نام سب سے زیادہ نمایاں حیثیت رکھتا ہے، اُن کے کلام میں دقت نظر اور حکیمانہ نکتہ سنجی کے ساتھ ظرافت و شوخی کا امتزاج دنیا کے شاعری کا ایک بے مثل معجزہ ہے۔ اُن کے بعد اقبال کا نمبر آتا ہے جو ایک عرصہ سے بھگوت گیتا کے انداز پر اپنا پر قوت فلسفہ عمل دنیا کے سامنے حیرت انگیز بلند خیالی و اثر کے ساتھ پیش کر رہے ہیں۔ اُن کی بعض فارسی نظموں کا ترجمہ کمبیرج کے فاضل پروفیسر نکولسن نے انگریزی میں کیا ہے۔ اُن کے بعد حسرت دریا صُن ہیں جو کسی دوسری زبان کے شعراء سے کمتر نہیں رکھے جاسکتے۔ ناول یا فسانہ نگاری میں مولوی نذیر احمد، مرزا رسوا، عبدالحلیم شرر رتن ناتھ سرشار، راشد الخیری، خواجہ حسن نظامی، پریم چند کی کت ہیں پڑھنے ہی سے تعلق رکھتی ہیں۔ پُرانے قصبے کہانی کی کتابوں کا تو کچھ ذکر ہی نہیں۔ ان میں بہت سی کتابوں کا انگریزی اور ہندی میں ترجمہ ہو گیا ہے۔

سچیدہ نثر نویسوں میں اردو سرسید احمد، مولوی نذیر احمد، محمد حسین آزاد، چراغ علی، حالی، شبلی، کرامت حسین، سید سلیمان اور ابوالکلام آزاد پر بجا فخر کر سکتی ہے، محمد حسین آزاد کی شاعرانہ نثر اور نازک خیالی اعجاز سے کم نہیں، نذیر احمد کو اردو، فارسی، و عربی زبان پر ایک حیرت انگیز قدرت حاصل تھی شبلی ایک بلند پایہ مورخ تھے لیکن بحیثیت ایک ادیب اور نقاد کے اُن کی عظمت کا پایہ اور بھی بلند تھا۔ سیرۃ نبوی (چھ جلدوں میں) اُن کے علی فضل و کمال کی بجائے خود ایک ناقابل انکار

شہادت ہے۔ شعر الجم (۵ جلدوں میں) جیسی جامع و مانع تصنیف نے مشہور مشرق پر فیسر براؤن کو ان کا گرویدہ بنا دیا ہے، پروفیسر موصوف نے اپنی کتاب لٹریچر ہسٹری آف پریشیا (تاریخ ادبیات ایران) کی تیسری جلد میں اس سے بہت سے اقتباسات نقل کیے ہیں۔ کرامت حسین (حجۃ اللہ آباد ہائیکورٹ) لسانیات اور علم المعاشرت کے ممتاز عالم تھے، سلیمان، شبلی کے تاریخی و علمی ترکہ کے وارث ہوئے ہیں اور نہایت سرگرمی کے ساتھ اپنے پیشرو کے نقش قدم پر چل رہے ہیں، جہاں تک مذہب، فقہ اور تقویٰ کا تعلق ہے اُردو لٹریچر کا خزانہ قطعاً بے مایہ نہیں۔

پچھلے چند سال کے اندر اُردو لٹریچر کی اشاعت و تبلیغ کے لیے تین مرکز قائم ہوئے ہیں۔ ان میں سب سے بڑا اور التراجم عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن ہے، جہاں تمام مفید مضامین مثلاً تاریخ، علم المعیشت، منطق، اخلاقیات، نفسیات، مابعد الطبیعیات، اقتصادیات، ریاضیات، علم الحیات، طبیعیات، علم کیمیا وغیرہ کی انگریزی کتابوں کے تالیف و ترجمہ کا کام نہایت تیزی کے ساتھ ہوتا ہے۔ دوسرا مرکز انجمن ترقی اُردو ہے جس کا صدر دفتر اورنگ آباد دکن ہے، اس انجمن نے اب تک کئی درجن کتابیں بالخصوص مغربی علوم و فنون مثلاً علم الحيوانات، علم طبقات الارض، علم النفس، علم نباتات اور علم المعاشرت کے متعلق شائع کی ہیں، ان کے علاوہ ایک تیسرا مرکز مجلس دارالمصنفین یا شبلی اکاڈمی ہے جو اپنے بانی کے نام سے موسوم ہے اور جبکہ دفتر اعظم گڑھ (صوبہ متحدہ) میں ہے، اس کا تعلق زیادہ مشرقی علوم و فنون سے ہے، تاہم اُس نے یوپی فلاسفہ اور علمائے نفسیات مثلاً بریکلے اور لیبان کے متعلق بھی چند کتابیں شائع کی ہیں۔

غرض ان واقعات و مشاہدات کا مطالعہ تمام غیر متعصب ظہن کو سمجھائیے کیلئے کافی ہو کہ اُردو لٹریچر کو غیر معمولی طور پر وسیع اور مکمل نہ تو تاہم اس قدر مفلس و بے مایہ بھی نہیں ہو جتنا عموماً خیال کیا جاتا ہے اور ہندوستان کی دیگر زبانوں کے مقابل میں تو اپنی ہستی برقرار رکھنے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے۔

# مصنفین

## اردو کی پیدائش

جب دو صاحبِ زبانِ قومیں ایک دوسرے سے ملتی جلتی ہیں اور آپس میں رشتہ اتحاد و ارتباط قائم ہوتا ہے تو قانونِ فطرت کے مطابق اخلاق، مذہب، زبان، طریقہ و دو باش، ادب و آداب، لباس اور دیگر شاعری پر ایک دوسرے کا اثر نامعلوم طریقہ سے شروع ہو جاتا ہے اور رفتہ رفتہ یہ اثر کچھ دنوں میں ایک صورت اختیار کر لیتا ہے اور سب کو نظر آنے لگتا ہے، اس قاعدہ کلی میں کوئی استثناء نہیں جن لوگوں نے تاریخِ عالم کا مطالعہ کیا ہے وہ اس امر کی بھی شہادت دے سکتے ہیں کہ ایسی حالت میں دیگر امور متذکرہ بالا کی نسبت دونوں قوموں کی زبان پر خصوصاً زیادہ اثر پڑتا ہے کیونکہ اظہارِ مطالب کیلئے ہر شخص وہ لفظ استعمال کرنے کی قدرتا کو شش کرتا ہے جسکو دوسری قوم کا فرد باسانی سمجھ لے اور یہ جب ہی ممکن ہے کہ آخر الذکر قوم کی زبان کا لفظ بولا جائے۔ اس طریقہ سے دونوں قوموں کے افراد روزمرہ کے کاروبار چلانے کے لیے کچھ الفاظ ایک دوسرے کی زبان کے سیکھ لیتے ہیں اور یہ سلسلہ برابر جاری رہتا ہے یہاں تک کہ ایک زبان کے بہت سے الفاظ دوسری زبان کے اصلی الفاظ بن جاتے ہیں۔

انگریزی زبان جو آج کل مخزنِ علوم و فنون بنی ہوئی ہے، اس میں اردو سے لیکر لاطینی و یونانی زبانوں تک کے الفاظ پائے جاتے ہیں۔ علاوہ ایزین زبان ہونے کے اس کی

وجہ یہ بھی ہے کہ انگریزوں کو دنیا کی تمام قوموں سے خوب ملنے بچنے کا واسطہ رہا ہے اس لیے ان قوموں کی زبانوں کے بہت سے الفاظ مجسّمہ اُن کی زبان میں داخل ہو گئے ہیں اور ہوتے جاتے ہیں۔ پس ہماری زبان کی ابتداء اُسی وقت سے ہو گئی تھی جب سے کہ مسلمان اس ملک میں داخل ہونے شروع ہو گئے تھے۔ یہ صحیح ہے کہ وہ زبان جو اُس وقت ہندو اور مسلمان بے عرض ادا سے ملتا بولتے تھے اُردو نہیں کہلائی جاسکتی، تاہم اختلاط الفاظ کی بنیاد پڑ چکی تھی اور یہی اختلاط الفاظ آگے چلکر ہماری زبان کی پیدائش کا باعث ہوا۔

اپو ریخان بیرونی نے جو علامۃ البیرونی کے نام سے موسوم ہوا جبکہ شمار دربار غزنوی کے افاضل و اکابر میں ہے ہندوؤں کی قدیم علمی درسگاہوں میں طالب علمی کر کے سنسکرت حاصل کی، اور ہندوؤں کے علوم عربی میں اور عربوں کے علوم سنسکرت میں منتقل کیے اور برسوں اُن شہروں میں رہ کر جہاں اسلام کا نام دشنام بھی نہ تھا یہاں کی مروجہ زبانیں سیکھیں۔ اُسی عہد سے وابستہ فارسی کا مشہور شاعر مسعود سعد سلمان ہے جس کی نسبت تذکرہ مجمع الفصحاء میں لکھا ہے ”وے راسہ دیوان بودند تازی، ہندی، پارسی“ اور مولانا شبلی کھٹے ہیں ”تمام تذکرے متفق اللفظ ہیں کہ ہندی زبان میں اُنس نے ایک دیوان لکھا تھا“ یہ غزنویوں کے عہدِ اذلیل کا ایک نامور مسلمان شاعر تھا وہ لاہور میں پیدا ہوا تھا، اگرچہ خاندانی لحاظ سے وہ عجمی تھا تاہم اُس نے اپنے وطن ولادت کی زبان میں بھی ایک دیوان مرتب کر ڈالا۔

مسعودی عین جبکہ شہاب الدین غوری نے راسے پتھور پر فتح پائی تو چاند کوئی ایک نامی شاعر نے پر مٹی راج راسو لکھا۔ اس کتاب کے ہر صفحہ میں فارسی، عربی کے کئی کئی لفظ نظر آتے ہیں۔ اگر محمود غزنوی کے وقت کی نظم یا نثر مل جائے تو اُس میں بھی عربی فارسی کے الفاظ پائے جائیں۔

کشمیر کے حکمران سلطان زین العابدین نے جو فارسی کے علاوہ ہندی اور بھتی زبانوں میں بھی پورا دخل رکھتا تھا، فارسی کتابوں کا ترجمہ ہندی میں اور بہت سی ہندی کتابوں کا ترجمہ

فارسی میں کرایا۔ اور سب سے پہلے اُسی کے حکم سے مہا بھارت اور راج ترنگنی (قدیم تاریخ کشمیر) کا ترجمہ فارسی میں ہوا۔ اسی عہد کے قریب قریب امیر خسرو نے جو ۱۲۵۳ء میں فوت ہوئے خالق باری تصنیف کی۔ یہ کتاب بازار میں عام طور پر فروخت ہوتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ اس کا سبب تصنیف یہ ہے کہ جو طلباء فارسی سیکھنے کا شوق رکھتے ہوں اس کو پڑھیں کیونکہ اس میں اکثر فارسی، عربی الفاظ کا ترجمہ یہاں کی اُس وقت کی عام اور مرصعہ زبان میں کیا گیا ہے، نمونہ کے طور پر ایک شعر کافی ہے ۵

بایا برادر آؤرے بھائی      بنشیں مادر بیٹہ ری مائی

اُس وقت سے لیکر انیسویں صدی عیسوی کے اختتام تک یہ کتاب مبتدی طلباء کی وظیفہ زبان برہی ہے، البتہ بیسویں صدی کے آغاز سے اس کی کساد بازاری ہو گئی ہے اور وجہ صرف یہ ہے کہ اب فارسی زبان حاصل کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہی۔

امیر خسرو آنکھوں کا ایک مجرب نسخہ دوہروں کی بحر میں اس طرح لکھتے ہیں کہ:-

لود، پھٹکری، مُردہ سنگ      ہلدی، زیرہ، ایک ایک ٹنگ

افیون چنا بھر، مرچیں چار      اُرد برابر مٹھوتا ڈار،

پوست کے پانی پوٹلی کرے      تر ت پیڑ نیمنوں کی ہرے

ظاہر ہے کہ اس عہد میں مسلمانوں کی زبان بھی آپس کے تعلقات کی بنا پر ضرور برہن بھاشا ہو گئی جبکہ وہ آدمی اپنی اور آدمی اُن کی ملا کر ٹوٹی چوٹی بولتے ہونگے۔ ان زبانوں کی کوئی نشہ تصنیف نہیں ملتی۔ البتہ امیر خسرو کی ایک غزل جن کا مطلع ہے ۵

ز حال مسکس مکن تغافل، دورائے میناں بنائے بتیاں

کہ تاب ہجراں ندرم احوال نہ لیہو کا ہے لگائے چھتیاں

اور ہیلیاں، مگر نیاں اور گیت پتہ دیتے ہیں کہ سنہ ہجری میں یہاں کے مسلمان خاصی بھاشا بولتے ہونگے۔ بلکہ اس سے یہ بھی نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ مسلمان بھی اُس وقت یہیں کی

زبان کو اپنی زبان سمجھنے لگے تھے اہم اس زبان کو کس شوق اور محبت سے بولتے تھے پیشک  
ہندوؤں کی نسبت اُن کی زبان پر فارسی عربی الفاظ زیادہ آجاتے ہونگے لیکن جتنا یہاں رہنا  
سہنا اور استقلال زیادہ ہوتا گیا اتنا ہی روز بروز فارسی ترکی نے ضعف اور یہاں کی زبان  
نے زور پکڑا ہوگا۔

پندرہ صدی عیسوی میں جبکہ سکندر لودی سریر آرائے سلطنت تھا اول کا بیٹھ  
فارسی پڑھ کر شاہی دفتر میں داخل ہوئے اور عربی فارسی کے الفاظ اُن کی زبانوں پر بکثرت  
آنے لگے۔ اور اسی سکندر لودی کے زمانہ میں کبیر شاعر بنارس کے رہنے والے علم میں  
اُن پڑھتے۔ گرد و مانند کے چیلے ہو کر ایسے ہوئے کہ خود کبیر پنجپوں کا مست محکلا، اُن کے  
دوہروں میں فارسی عربی کے الفاظ بکثرت موجود ہیں۔ مثلاً

دین گویا دُپنی سے دنی نہ آو با تھ      پیر کہاڑی ماریو گا پھل اپنے با تھ  
کبیر سر پر سر آہی کیوں سو کھچھین      کوچ نکارا سانس کا بابت ہون رین  
گرد و نانک کی تصنیفات میں بھی جو سنیہ شیعہ کے بعد فوت ہوئے عربی فارسی کے الفاظ  
پائے جاتے ہیں:-

ساس ماس سب جو تمہارا      تو کھل پیارا      نانک شاعر ابوکست ہی      بچے پر دُر گارا  
جو چیزیں وظیفہ عبادت کے طور پر ہیں اُن میں بھی الفاظ مذکورہ اسی کثرت سے ہیں جب سچی  
کے دو فقرے ملاحظہ ہوں:-

دارن جاؤں اُن انک پار      تو سد سلامت جی ز نیکار

سولہویں صدی عیسوی میں کہ شیر شاہی عہد تھا ملک محمد جالندی نے پدم اوت  
کی داستان نظم کی اور یہ التزام کیا کہ فارسی عربی کا ایک لفظ نہیں آنے دیا اور بحر بھی ہندی  
رکھی ہے، اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمان اس ملک میں رہ کر یہاں کی زبان کو کس  
پیارے بولنے لگے تھے۔ بعد ازاں اکبر کے عہد سے جبکہ مسلمان ہندوؤں سے شیر و شکر ہو گئے

یہ نوبت پہنچی کہ ہندو مشرفا بلکہ راجہ ہمارا جہاں لیاں ہینکر اور فارسی ہوکر فخر کرنے لگے جسطرح کہ آجکل انگریزی بولنے اور انگریزی لباس پہننے پر فخر کیا جاتا ہے۔

سترھویں صدی عیسوی میں یا باتلسی واس برہمن نے جو ضلع باندہ کے رہنے والے تھے اور پنڈت اور شاعر اور فقیر تھے، رامائن کو بھاشا میں اس طرح ترجمہ کیا کہ یہ لائانی کتاب مطبوع خاص و عام ہوئی۔ ان کے دوہروں میں بہت اور کتاب مذکور میں کہیں کہیں فارسی عربی کے الفاظ موجود ہیں۔

سندھ کے سیوک محل چلے سوامی کچھ پاپ گہر تر و ترو بن و باگ و برڈیرادیو لنگا گہر سو اس بجن ہٹ بولے کئی بھنگ کچھ کچھ رام انیک گریب نواجے لوک بید بربر دبراج گئی گریب گرام نرناگر پنڈت مولے ملین جاگر مایا کو لے کر لے بے ماتھے تلہ لگس کیے کوئی نہ چھتے اسی زمانہ میں سور داس جی نے سری کرشن جی کے ذکر سے اپنے کلام کو مقبول کیا و عام کیا۔ ان کی تصنیف میں شاید کوئی شعر ہوگا جو فارسی عربی لفظ سے خالی ہوگا۔ پس اس سے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ جب یہ بزرگان مذہب اپنے دوہروں میں فارسی لفظ بول جاتے تھے تو گفتگو میں عام ہندو لوگ کیا کچھ اس سے زیادہ نہ بولے ہوں گے، سور داس جی کہتے ہیں :-

مایا دام دہن و نسا، باندھوں ہولاس سراج سنت سبھی جانت ہوں، تو نہ آئیو باج  
کھیت بہت کا ہے تم تانے سنبن نئی آواج دیو نہ جات پار اتر آئے، جابت چڑھیں چہاچ  
یہجے پار امار سور کوں، ہمارا ج بچاچ نہیں کرت کہت پرہوتم سو، سد گریب نواج  
رفہ رفتہ شاہجھاں کے زمانہ میں شہر اور شہر نیا تعمیر ہو کر نئی دلی دار السلطنت ہوئی،

بادشاہ اور ارکان دولت زیادہ تر دہاں رہنے لگے۔ اہل سیف، اہل قلم، اہل حرفہ اور تجارت وغیرہ ملک ملک اور شہر کے آدمی ایک جگہ جمع ہوئے۔ ترکی میں اردو بازار لشکر کو کہتے ہیں۔ اردوئے شاہی اور دربار میں ملے جملے الفاظ زیادہ بولے جاتے تھے۔ وہاں کی بولی کا نام اردو ہو گیا،

اور یہ زبان خاص و عام میں شاہجہاں کے اردو کی طرف منسوب و مشہور ہو گئی۔

سننا جاتا ہے کہ ہماری زبان کو ریختہ بھی کہتے ہیں، یہ لفظ ہمارے کانوں کو غیر مانوس اور اجنبی معلوم ہوتا ہے تاہم متقدمین اور متاخرین شعراء نے اردو کی بجائے لفظ ریختہ اشعار میں لکھا ہے۔ سید تقی میر فرماتے ہیں ۵

خوگر نہیں کچھ یوں ہی ہم ریختہ گوئی کے معشوق جو تھا اپنا باشندہ دکن کا تھا  
اُن کے ہم عصر قائم بھی کہتے ہیں :- ۵

قائم میں غزل طور کیا ریختہ ورنہ اک بات کچھ سی بزبان دکنی تھی  
متاخرین میں مرزا غالب کا ارشاد ہے :- ۵

ریختے کے ہمتی اُستاد نہیں ہو غالب کہتے ہیں اگلے زمانہ میں کوئی تیر بھی تھا  
یا یہ جو کہے کہ ریختہ کیونکہ ہوشکافری گفتہ غالب ایک بار پڑھکے اُس نے کہ یوں

نواب مرزا داغ اور اُن کے ہم عصروں کے یہاں ریختہ متردک ہو گیا اور ہماری زبان کا نام صرف ”اردو“ رہ گیا۔ چنانچہ داغ نے ایک جگہ فخر یہ کہا ہے :- ۵

اردو ہے جس کا نام ہیں جاننے ہیں داغ ہندوستان میں مہوم ہماری زبان کی ہر  
ایک اور شعر ہے ۵

نہیں کھیلے داغ یا رونے کہد کہ آتی ہے اردو زبان آتے آتے

نسیم دہلوی شاگرد حکیم مومن خاں یوں نغمہ سرا ہیں :- ۵

نسیم دہلوی ہم موجد بانفصاحت ہیں کوئی اردو کو کیا جانے کہ جیسا ہم سمجھتے ہیں

اردو کو پہلے ریختہ اس وجہ سے کہتے تھے کہ مختلف زبانوں نے اسے ریختہ کیا ہے۔ جیسے دیوا

کو اینٹ، ہٹی، چونا، سفیدی وغیرہ پختہ کرتے ہیں، یا یہ کہ ریختہ کے معنی ہیں گری پڑی

پریشان چیز، چونکہ اس میں الفاظ پریشان جمع ہیں اس لیے اسے ریختہ کہتے تھے اور

یہ سبب ہے کہ اس میں عربی، فارسی، ترکی وغیرہ کئی زبانوں کے الفاظ شامل ہیں اور اب

انگریزی بھی داخل ہوتی جاتی ہے، اور ایک وقت ہو گا کہ عربی فارسی کی طرح انگریزی زبان بھی قابض ہو جائیگی اور شاید وہ وقت بسرعت تمام قریب آ رہا ہے۔

اُردو کی ابتدائی تصنیفات نظم سے شروع ہوئیں اگرچہ فطرت بھی اسی کی تقفنی رہی ہے کہ ادب اور علم کی ابتدا ہمیشہ نظم سے ہوتی آئی ہے، کیونکہ ایک وحشی قوم جو کھٹنا پڑھنا نہیں جانتی ہمیشہ اپنے بزرگوں کی روایات، رسم و رواج اور اُن کی شجاعت و بے صالت کو جس کو اُس قوم کی تاریخ سمجھنا چاہیے اپنی قوم کے بھاٹ اور کیشتر کے ذریعہ گیتوں اور راگ راگینوں میں محفوظ رکھتی آئی ہے چنانچہ یہی بھاٹ اور کیشتر تھے جنہوں نے نہ صرف یورپ بلکہ چین، تبت، اور تاتار اور اسی طرح ہندو سندھ، بلوچستان مغربی ایشیا، جزائر بحر اسود، مصر، مغربی افریقہ، شمالی امریکہ، جنوبی امریکہ اور جزائر بحر الکاہل کے مطبوع و مقبول افسانہ ہائے قدیم کو محفوظ رکھا۔ پس علم کی سب سے پہلی بنیاد ہمیشہ شاعری اور اکثر اوقات قافیہ بندی سے پڑتی ہے، ایک وحشی کے کانوں کے لیے یہ الفاظ کی زبردست و عجیب ترنم پیدا کرتی اور خوش آئند معلوم ہوتی ہے، لیکن یہ حالات ہماری زبان پر منطبق نہیں ہوتے کیونکہ اس کے بولنے والے اُن پڑھ اور وحشی نہ تھے بلکہ ایک طرف سنسکرت اور بھاشا کے خزانوں کی کنجی ہاتھ میں لیے ہوئے تھے اور دوسری طرف عربی، فارسی کے گنجینوں کو سینوں میں نہاں رکھتے تھے، تاہم نتیجہ ہی برآمد ہوا کہ اُردو کی تصنیفات کی ابتدا نظم سے ہوئی۔ ہمارے نزدیک اس کی وجہ یہ ہے کہ مطالب ضروری کی سب کارروائی فارسی میں ہوتی تھی۔ اُردو نہ صرف کسی کو اصلاً توجہ نہ تھی اور اُردو کے اُس وقت اہل زبان جو ذی استعداد ہوتے تھے وہ اُردو کی شاعری کو بھی فخر نہ سمجھتے تھے کچھ کہنا ہوتا تھا تو فارسی میں کہتے تھے، البتہ عوام ان س موزوں طبع دل کی ہوس پوری کرنے کو جو مسخہ میں آتا تھا کئے جاتے تھے اور اس طرح ابتدا شعر و شاعری سے ہو گئی۔

نواز نام ایک مصنف نے فرخ سیر کے عہد میں شکنتلا کا ترجمہ بھاشا میں کیا اور اردو کو محروم رکھا۔ لہذا یہ بات قابلِ افسوس ہے کہ سنسکرت اور بھاشا سے باوجود قدرت کوئی فائدہ ہندوؤں اور مسلمانوں نے اپنی مشترکہ زبان کو نہیں پہنچایا اور وہ اسلوبِ بیاں اور مادہ صحیفۂ فطرت کے مناظر جن سے سنسکرت اور بھاشا کی نظمیں مالا مال ہیں اُن سے اردو مجلس نظر آتی ہے۔ البتہ فارس کی انشا پر دازمی کے گلزارِ جا بجا کھلے ہوئے ہیں۔ اس میں شکنتلا کہ نظمِ اردو کے آغاز میں سنسکرت کی تقلید ضرور کی گئی۔ سنسکرت میں ایک لفظ کے کئی معنی ہیں اسی واسطے اس میں اور برج بھاشا اس کی شاخ میں دو معنیں الفاظ اور ایہام پر دوسروں کی بنیاد ہوتی تھی، فارسی میں صنعت ہے مگر کم۔ اردو میں پہلے پہلے شعر کی بنا و اسی پر رکھی گئی اور دورِ اول کے شعراء میں وہی قانون جاری رہا۔ اس عہد کے چند شعرا بطور نمونہ پیشکش ہیں ۷

|                                           |                                          |
|-------------------------------------------|------------------------------------------|
| لامِ مستعلیق کا ہوا اُس بیتِ خوشخط کی زلف | ہم تو کافر ہوں اگر بندے ہوں اسلام کے     |
| کیوں نہ وہم سے وہمِ باغی                  | قد ہو جس کا نہال کی مانند                |
| توجہ دریا کے پار جاتا ہے                  | دل مرادار وار جاتا ہے                    |
| تم دیکھو یا نہ دیکھو ہم کو سلام کرنا      | یہ تو قدیم ہی سے سر پر ہمارے کرہ         |
| نہیں محتاجِ زیور کا جسے خوبیِ خلادیک      | کہ آخِ بد نہا لگتا ہے دیکھو چاند کو گہنا |

لیکن جس چیز کی اردو میں نقل کرنی چاہیے تھی اُس سے قاطبۂ اعراض کیا گیا۔ دلی نے عالمگیر کے عہد میں نظمِ اردو کی ابتدا کی اور محمد شاہ رنگیلے کے زمانہ میں جبکہ عیش و عشرت کی بہار تھی اور اردو شاعری کا ستارہ چمک رہا تھا فارسی کا تتبع اختیار کیا اور غزل میں رنگ اڑانا شروع کیا، اور شاعروں نے بھی اُس کی دیکھا دیکھی فارسی کے خاکے اردو میں اتار کر غزل خوانیاں شروع کر دیں اور قصیدے لکھنے لگے، چنانچہ ہمارے یہاں نئے نئے اسلوبِ بیاں، عمدہ عمدہ تراکیب الفاظ، تشبیہ و استعارات بکثرت موجود ہیں لیکن

مصطلحات علمی سے ہماری زبان نا آشنا رہی کیونکہ اُس عہد میں علوم و فنون، تاریخ و فلسفہ و ریاضی وغیرہ کا چرچا نہ تھا۔ الغرض یہی سلسلہ اب تک جاری رہا اور کسی کو یہ خیال نہ آیا کہ اس پک ڈنڈی کو چھوڑ کر ایک دوسری شاہراہ اختیار کریں اور آنکھ بند کیے اگلی بحیرہ کیل کے پیچھے چلتے رہے، آخر کار انگریزی علم ادب نے ہماری آنکھیں کھولیں اور آزاد و حالی نے ایک علیحدہ روش اختیار کی جس پر آج کل ہمارے نوجوان شعراء جادہ بیانی گر رہے ہیں اور مترجمین مصطلحات علمی بہم پہنچا رہے ہیں۔

اُردو زبان کی طبیعت ایسی لطیف و راقع ہوئی ہے کہ ہر زبان سے مل جُل جاتی ہے سنسکرت آئی اُس سے مل گئی، عربی فارسی آئی اُسے بسم اللہ خیر مقدم کہا۔ اب انگریزی لفاظ کو اس طرح جگہ دے رہی ہے گویا اُس کے انتظار میں بیٹھی تھی، اس کی اس لطیفی اور آسانی کی وجہ سے یہ ملکی زبان ہو گئی ہے۔ کشمیر سے راس کمار تک اور بنگال سے سندھ تک اُردو بولی یا سمجھی جاتی ہے۔ اس قلیل عرصہ میں جب سے کہ دلی نے اپنی پہلی غزل اُردو میں تصنیف کی جس کو سواد سو برس کا زمانہ گزرا۔ آج تک جو کچھ ہوا وہ کسی تحریک یا ارادہ سے نہیں ہوا تاہم اُردو کی ترقی نمایاں اور روز افزوں ہے، بلاشبہ یہ رفتار دوسری ترقی یافتہ زبانوں کے مقابلہ میں نسبتاً بہت کم ہے لیکن یہ اس کے ابتدائی مدارج ہیں اور دوسری زبانیں اپنی ترقی مکمل کر چکی ہیں۔ انگریزی زبان نے اپنا موجودہ علم ادب جو مٹی مدی سے بیسویں صدی تک یعنی ایک ہزار چھ سو برس میں پیدا کیا ہے، جبکہ کل قوم اور حکومت انگلشیہ برابر اس کی ترقی کے لیے کوشاں رہی ہیں، تو کیا یہ تعجب خیز امر نہیں ہے کہ اُردو نے بغیر کسی امداد اور وسیلہ کے اس قدر جلد ایک معتد بہ علم ادب بہم پہنچا لیا۔

افسوس ہے کہ نظم اُردو کے ساتھ ساتھ شرا اُردو کی ابتدائیں ہوئی بلکہ ایک عرصہ کے بعد

مولوی حبیب الرحمن خاں شروانی اپنے ایک خط مورخہ ۱۰ ستمبر ۱۹۰۷ء میں تحریر فرماتے ہیں کہ ”ایک صاحبِ اثر اُردو کی تاریخ لکھ رہے ہیں، انکو عبد شاہجہانی تک کی شریں دستیاب ہو چکی ہیں۔“ ۱۲ تنقہ۔

محمد شاہ کے عہد میں فقہی تخلص ایک بزرگ نے ۱۱۳۵ھ ہجری میں وہ مجلس لکھی اس کے دیباچہ میں وہ سبب تالیف لکھتے ہیں اور غالباً ہی نثر اردو کی پہلی تصنیف ہے۔ ”پھر دل میں گزرا کہ ایسے کام کو عقل چاہیے کامل اور مدد کسوطرف کی جوئے شامل کیونکہ بے تائید بھدی اور بے مدد جناب احمدی“ یہ مشکل صورت پذیر نہ ہو دے اور گو ہر مراد رشتہ امید میں نہ آوے لہذا کوئی اس صنعت کا نہیں ہوا۔ مختصر اور اب تک ترجمہ فارسی عبارت ہندی نثر نہیں ہوا مستمع ہیں اس اندیشہ عین میں غوطہ کھایا اور بیابان تامل و تدبیر میں سرگشتہ ہوا لیکن راہ مقصود کی نہ پائی۔ ناگاہ نسیم عنایت النبی دل افکار پر بہتر از میں آ۔ یہ بات آئینہ خاطر میں منہ دکھلائی“

میر کی شہسواری شعلہ معشوق کے مضمون کو بھی مرزا رفیع السودا نے نثر میں لکھا ہے (دیکھنا ۱۱۹۵ھ ہجری سے ۱۱۹۶ھ تک ہے) اُس کا انداز بالکل یہی ہے جو سودا کی کلیات کے دیباچہ کا ہے۔

**نثر مرزا رفیع** ”ضمیمہ نثر پر آئینہ داران معنی کے مبرہن ہو کہ محض عنایت حق تعالیٰ کی ہے جو طوطی ناطقہ شیریں سخن ہو پس یہ چند مصرع کہ از قبیل بختہ دُر ریختہ خاتمہ دوزبان اپنی سے صنم کا غنڈ پر تحریر پائے۔ لازم ہے کہ تحویل سخن سامعہ بخان روزگار کر دیں۔ تاز بانی ان شخص کی ہمیشہ مورخین و آفرین رہوں“

یہ قیمت قدر شناسا ہی سے پہنچے ہے ہم در نہ دنیا میں خند بھی نہیں گوہر ہے کم مضمون سینہ میں بیش از مرغ اسیر نہیں کہ ہو بیچ نفس کے جس وقت زبان پر آیا فریادِ بے گناہ ہے واسطے گوشِ داورس کے۔ غرض جن بل سخن کا دُر منصفی زینت لب ہے سررشتہ حسن معانی کا اس کلام کے، اُس سے انصاف طلب ہے۔ اگر حق تعالیٰ نے صبح کا غنڈ سفید کی مانند شام سیاہ کرنے کو یہ خاک را غلق کیا ہے تو ہر انسان کے فانی دماغ میں چراغ ہوش دیا ہے۔ چاہیے کہ دیکھ کر نکتہ چینی کرے در نہ گزند زہر آلود سے بے اجل کا ہے کو مرے“

اس تصنیف سے تخمیناً تیس برس کے بعد جب میر انشا اللہ خاں اور مرزا جانجاہ  
منظر کی دلی میں ملاقات ہوئی ہے۔ اُس گفتگو کے چند فقرے بھی قابلِ غور ہیں۔ سید انشا  
مرزا جانجاہ سے فرماتے ہیں:-

”ابتداءً بن صلب سے تا اوائل ربیع الاول و اوائل ربیع الثانی سے الی الآن -  
اشتیاقِ مالایطاق تقبیلِ عتبہ عالیہ نہ بجدے تھا کہ سلکِ عزیر و تقریر میں منتظم ہو سکے -  
لہذا بے واسطہ وسیلہ حاضر ہوا ہوں“

مرزا صاحب جواب میں فرماتے ہیں:-

”اپنے تئیں کوں بھی بد و طفلی سے ہتھیں ایسے اشخاص کے ساتھ موانست اور  
مجالست رہ چکی ہے“

یہ وہ زمانہ ہے جبکہ بزمِ شعراء کے تین دور ختم ہو چکے ہیں۔ اگرچہ میر تقی میر  
اور مرزا رفیع السودا چراغِ سحری ہیں لیکن اُن کی گرم نفسی اور آتش بیانی ہر محبت اور  
ہر حلے کو گرما رہی ہے، اور چوتھے دور کے شعراء کے قہقروں کی آواز دور سے پہنچ سکتی  
دے رہی ہے کہ اب آئے اور اب آئے۔

بائیں ہمہ اُردو میں اس وقت نثر کی کوئی قابلِ ذکر کتاب ایسی نہیں لکھی گئی جس سے  
زبان کی تبدیلیوں کا سلسلہ معلوم ہوتا، کیونکہ اُردو کی انشاء پر دازی اور ترقی اور وسعت فقط  
شعرا کی زبان پر مبنی اور عرصہ تک یہی حال رہا۔ آخر تیرہویں صدی ہجری کے شروع میں  
کئی قدرتی سامان جمع ہو گئے اور سب سے مقدم سبب اسکی عام فہمی تھی۔ چونکہ ہر شخص مجتہد  
تھا۔ اس لیے نثر لکھنے والوں کو بھی اسی میں داہ واہ لینے کا شوق ہوا۔

## اُردو کا عالم طُفولیت

ادھر تو یہ چو نچال لڑکا شرار کے جلسوں میں اور اُمراء کے درباروں میں اپنے بچپن کی شوخیوں سے سب کے دل بہلا رہا تھا، اُدھر دانائے فزنگ جو کلکتہ میں فورٹ ولیم کے قلعہ پر دور بین لگائے بیٹھا تھا، اُس نے دیکھا۔ نظر باز تار گیا کہ لڑکا ہونہار ہے مگر تربیت چاہتا ہے۔ تجویز ہوئی کہ جس ملک پر حکمرانی کرتے ہیں اُنکی زبان کھینی واجب ہے،

(آب حیات)

تیرھویں صدی ہجری اور تقریباً اُنیسویں صدی عیسوی کے آغاز سے شر اُردو کی حقیقت ابتدا ہوئی ہے جبکہ میر محمد عطا حسین خاں تھتین نے چار درویش کا قصہ اُردو میں لکھ کر نو طرزِ مرصع نام رکھا۔ شجاع الدولہ کے عہد میں تصنیف شروع ہوئی ۱۲۹۸ھ/۱۸۸۱ء نواب آصف الدولہ کے عہد میں ختم ہوئی۔ اسی زمانہ میں بعد لارڈ ولزلی گورنر جنرل ڈاکٹر جان گلکرائسٹ کے ماتحت فورٹ ولیم کے مدرس میں اُردو کتابوں کی تصنیف اور تالیف کا شیر تر قائم کیا گیا۔ اور اُردو کی تربیت کا سہرا صاحبانِ ذی شان ہی کے سر پر صاحبِ تذکرہ گلشنِ ہند نے سیر تقی میر کے حال میں جبکہ شعبۂ تصنیف و تالیف کے اہتمام کے لیے کسی لائقِ اہلِ زباں کی ضرورت تھی الفاظِ ذیل میں یوں تصویر کھینچی ہے:-

”جن ایام میں کہ درخواست صاحبِ عالیشان کی، زبانِ دانانِ رنجینہ کے مقدسے میں کلکتے سے لکھنؤ گئی تو پہلے کرنیل اسکاٹ صاحب کے روبرو تقریبِ تیر کی ہوئی لیکن علتِ پیری سے یہ بیچارے جھول کے محمول ہوئے اور نو جوانِ نوشق، مرتبی گرمی سے قوتِ بدنی کے، مقبول ہوئے، زمانہ خوش طبعوں سے نہیں خالی ہے، اکثر اہل لکھنؤ پکارتے تھے کہ

۱۔ میر شیر علی افنوس کی طرف اشارہ ہے، جو سفارشِ نواب سرفراز الدولہ حسن رضا خاں نائب

نواب آصف الدولہ اس جگہ پر مامور کیے گئے۔ ۱۲۔

کلکتے میں شاعری کی جادو خواست حتمی ہے، کس واسطے کہ یہ جانتے سب اہل تیز ہیں کہ آج بھی بوڑھے کے سامنے نوجوان غور سے میں موزید ہیں۔ اب بھی جو بوجہ تنکنت معنی کا جبر ثقیل طبع سے ترازو کر کے وہ دکھاتا ہے جو ان اگر گوہ بوقبیس ہے تو تحمل سے اُس کے کمر خڑا ہے۔“

بہر حال اس جگہ کے لیے میر شیر علی افسوس کا انتخاب ہوا اور افسوس ہے کہ میر صاحب ہماری بد قسمتی سے منتخب نہ ہوئے۔ ورنہ کیا عجب ہے کہ وہ نثر میں کوئی ایسی یادگار چھوڑ جاتے جو ان کی نظم کی طرح مقبول خاص و عام ہوتی، اور اہل زباں اُسے سر اور آنکھوں پر رکھتے۔ فورٹ ولیم کے شعبہ تصنیف و تالیف کی طرف سے میر شیر علی افسوس نے ۱۷۹۹ء میں باغ اُردو اور ۱۸۰۲ء میں آرائش محفل لکھی۔ میر اسن دہلوی نے ۱۸۰۲ء میں باغ و بہار آراستہ کیا اور انہی دنوں میں اخلاق محسنی کا ترجمہ لکھا اور بیتال یکپی جو محمد شاہ کے زمانہ میں سنسکرت سے بھاشا میں آئی تھی۔ اب عام فہم اُردو ہو کر ناگری میں لکھی گئی اور ۱۸۰۸ء میں منظر علی دلائے اُردو میں لکھی۔ لیکن بقول آزاد اس نقارہ فخر کی آواز کو کوئی دبا نہیں سکتا کہ میر انشا اللہ خاں پہلے شخص ہیں جنہوں نے ۱۸۰۲ء میں قواعد اُردو لکھ کر ایجا دکی ہنسی میں ظرافت کے چھول کھلائے۔

زبان اُردو کی عام فہمی دیکھ کر مذہب نے بھی اپنی برکت کا ہاتھ اسکے سر پر رکھا یعنی ۱۸۰۲ء میں مولوی شاہ عبدالقادر صاحب نے قرآن شریف کا ترجمہ اُردو میں کیا۔ اس کے بعد مولوی اسماعیل صاحب نے بعض رسالے عام اہل اسلام کی فہمائش کے لیے اُردو میں لکھے الغرض اپنی آسانی کے وصف سے اُردو نے آہستہ آہستہ فارسی کو پیچھے ہٹانا اور اپنا قدم آگے بڑھانا شروع کیا۔ چنانچہ ۱۸۰۳ء سے سرکاری دفتر بھی اُردو ہونے شروع ہوئے چند سال کے بعد کل دفتروں میں اُردو زبان ہو گئی۔ اسی سہ ماہ میں اخباروں کو آزادی حاصل ہوئی۔ ۱۸۰۳ء میں اُردو کا اخبار دلی میں جاری ہوا اور یہ اس زبان میں پہلا اخبار تھا، جو

آزاد کے والد مولوی محمد یاقر کے قلم سے نکلا۔ اور دو براؤں اپنی اس کارگزاری کے بعد ختم ہو گیا۔

اس کے بعد دوسرے دور کا آغاز ہوا اور ۱۳۳۵ء کے قریب فقیر محمد خاں گویا نے انوارِ سیلی کا ترجمہ اردو میں کیا جس کا نام بستانِ حکمت رکھا۔ بعد ازاں ۱۳۳۶ء میں میرزا رجب علی سرور نے فناۃ البحائب تحریر فرمایا اور چند اور قسطے لکھے۔ مرزا غالب مرحوم نے باوجود اس کے کہ فارسی زبان کے دلدادہ تھے اور اپنی تمام عمر فارسی میں قادر الکلام ہونے پر صرف کی تھی، زمانہ کی رفتار دیکھ کر خطوط نویسی کا وہ طریقہ ایجاد کیا جس کا نتیجہ بھی آج تک کما حقہ کسی سے نہیں ہوا اور لمبے لمبے القاب و آداب کی جگہ نہایت مختصر القاب و آداب کی بنیاد ڈالی، ان کے خطوط میں وہ حظِ اولیٰ لطف ہے کہ عمدہ سے عمدہ افسانے اور ناول ان پر قربان ہیں، حالانکہ روزمرہ کی باتیں ہیں مگر اندازِ تحریر اس قدر دلچسپ ہے کہ برابر یہی جی چاہتا ہے کہ انہیں پڑھے جاؤ طبیعت کو سیری نہیں ہوتی۔ یہ خطوط کتاب کی شکل میں جمع ہو کر اول عود ہندی کے نام سے اور بقیہ خطوط اردوئے معلّے کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ اسی زمانہ میں مولانا غلام امام شہید نے انشائے بہار بے خزاں اور خان بہادر منشی غلام غوث بے خبر نے جو غالب مرحوم سے دوستانہ تعلقات رکھتے تھے خونتائے جگر اور فغان بے خبر دو کتابیں تصنیف فرمائیں اور اس طرح دوسرے دور کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ زبان کے ابتدائی مراحل کے لحاظ سے جو کچھ ہوا عنایت ہوا اور نہ دو چار کتابوں کی تصنیف کسی دور کے لیے ضرور باعثِ ننگ و شرم ہے۔ اگر غور سے نظر ڈالی جائے تو دوسرے دور سے پہلا دور بہت بہتر تھا۔ پہلے دور کا خاتمہ یقین دلاتا تھا کہ دوسرے دور ضرور بہتر ہو گا لیکن ردِ عمل کا قانون جو دنیا کی تمام اشیاء پر جاری و ساری ہو یاں بھی اپنا اثر ظاہر کیے بغیر نہ رہ سکا اور اردو اپنے عالمِ طفولیت سے ایک قدم آگے نہ بڑھ سکی، البتہ دوسرے دور کی کمی کو تیسرے دور نے بحسن و جودہ پورا کر دیا اور اردو کا عالمِ طفولیت ختم ہو کر عنفوانِ شباب کے آثار ظاہر کرنے لگا جس کا ذکر ہم آئندہ جگہ کریں گے۔

# پہلا دور

(۱۹۸۰ء سے ۱۸۳۶ء تک)

آج نثر اردو کے بالکل اصحاب کا پہلا طبقہ منعقد ہوتا ہے نظم اردو کا تیسرا دور ختم ہو چکا ہے اور استادان فن اپنی شیریں کلامی اور سخن سنجی سے سب کو اپنا گردیدہ کر چکے ہیں، چوتھے دور کے بادہ خوار تھخانہ اردو میں اپنی اپنی جگہ آن بیٹھے ہیں اور غزل و قصیدہ کی شرابِ ارغوانی کے خم کے خم کندہ تھارہے ہیں اور سامعین کو اپنے دل آویز نغموں سے مست الست بنا رہے ہیں، ان اصحاب کی ترمزہ پرداز یوں، ظرافت اور نکتہ چینیوں نے ایک عالم کو مسخر کر لیا ہے اور ایک شخص بھی ایسا نظر نہیں آتا جو ان کا اثر پذیر اور دلگیر نہ ہو، شکر کی طرف کسی کو مطلق توجہ نہیں، جس کو دیکھیے نظم میں کوس لمن الملک الیوم بجا رہا ہے اور ہمہ دانی کا دعویٰ کر رہا ہے۔ سید انشا، اللہ خاں انشا کہ جن کی طبیعت ہمہ گیر واقع ہوئی ہے اور لافِ زبان دانی اُن اصحاب سے سننے کی تحمل نہیں ہے جو زبان اور اہل زبان سے کوسوں دور ہیں اُن کی نہائش اور اُن کی غلطیوں کو طشت از بام کرنے کے لیے دریائے لطافت جو دراصل قواعد اردو ہے فارسی زبان میں تحریر کرتے ہیں، اور ایک داستان اردو میں لکھتے ہیں جس میں عربی فارسی کا ایک لفظ بھی استعمال نہیں کیا۔ ادھر میرا تمن کلکتہ میں بیٹھ کر اپنی منشا اور شستہ زبان میں وہ دھچپ قصہ تحریر کرتے ہیں جو یاسع و بہار کے نام سے موسوم ہے اور جس کی ادنیٰ صفت یہ ہے کہ زبان کے اس قدر تغیر و تبدل کے باوجود اب بھی اُس سے بہتر زبان میں اُس قصہ کا لکھا جانا ممکن نہیں ہے، اس پہلے دور میں یہ دو اصحاب بالکل نظر آتے ہیں۔ اگرچہ لمبا طر زمانہ تصنیف میر محمد عطا حسین خاں تحسین کے سرپراد ولایت کا تاج نظر آتا ہے اور چار درویش کا قصہ موسوم بہ نو طرز مرصع ۱۲۸۲ھ ہجری میں تصنیف ہو کر

فردغ پاتا ہے تا ہم باغ و بہار جو ۱۸۳۲ء میں آراستہ ہوئی مقبولیت کے پھولوں کا ہار پہنے ہوئے ہے۔ مصرع قبول خاطر و لطف سخن خدا واداست۔

فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے مشہور نثار اپنی اپنی کوششوں کے لحاظ سے شکر کے مستحق ہیں، اُردو بشر کے ایوانِ عظیم الشان کی بنیاد رکھنے میں جس قدر روٹے اور نگرینوں کی ضرورت ہے وہ اُن کا قلم آج ہتیا کر رہا ہے۔ یہ نگرینے عمارت کی بنیاد پختہ کرنے کیلئے آج جواہر رینوں سے زیادہ قیمتی ہیں جنکی ضرورت تکمیل عمارت کے بعد محض زیب و آرائش کے لیے ہوگی۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا خاندان بھی اس ہونہار بچے کے سر پر اپنا دستِ شفقت رکھتا ہے اور مذہبی تقدس کے ساتھ اسکو بھی پاکیزہ زندگی کی دعا دیتا ہے، خدا کرے یہ بچہ خوب بڑھے، چھوٹے اور پھلے۔ آمین یا رب العالمین۔

(نوٹ: بابت صفحہ گزشتہ) ۱۵۱۵ میں اُن چند علی گڑھیوں کی ذکر کرنا ضروری سمجھتے ہیں جو اسی دور میں لکھی گئی ہیں لیکن گردشِ زمانہ سے ہندوستان میں نامہ الوجود میں اور انڈیا آف انسائیریری لندن کی الماریوں کو زیب دے رہی ہیں، اگر کسی صاحب کے پاس موجود ہیں تو براہِ کرم راقمِ آفم کو مطلع فرمائیں اور اُن کے اقتباسات سے براہِ اندو ذکر کریں، نیز اُن کے مصنفین کے حالات بھی جو کچھ معلوم ہوں تحریر فرمائیں تاکہ طبعِ دوم میں تلافیِ مافات ہو سکے۔

### جغرافیہ

۱۔ خلاصہ علم الارض (مع انگریزی) کلکتہ ۱۸۳۳ء

۲۔ مرآۃ الاقالیم کلکتہ ۱۸۳۶ء صفحات ۱۸۰

### علم المعاشرت

۱۔ اقبالِ فرنگ، بیانِ عادات و آداب

و احوالِ فرنگ۔ از نواب اقبال الدولہ بھاؤ

کلکتہ ۱۸۳۳ء

### کتب نجوم و ہیت

۱۔ مفتاح الافلاک۔ از عبد السلام کلکتہ

۱۸۳۳ء صفحات ۲۷۲

۲۔ نظام آسمانی (انگریزی مع ترجمہ ہندوستانی)

کلکتہ ۱۸۳۶ء

۳۔ علمِ ہیت مترجمہ لغتِ میلس لکھنؤ

۱۸۳۶ء

## میر محمد عطا حسین خاں تحسین

آپ کا نام میر محمد عطا حسین خاں ہے اور تحسین تخلص ہے لیکن آپ مشہور شاعر نہیں معلوم ہوتے کیونکہ میرزا علی لطف نے اپنے تذکرہ گلشن ہند میں آپ کا کوئی ذکر نہیں کیا جن کے آپ معاصر تھے۔ اور اب تک جس قدر تذکرے اور دو شعراء کے حال میں لکھے گئے ہیں کہیں آپ کا نام نامی نظر نہیں آتا۔ چنانچہ جاوید میں بھی آپ کا ذکر خیر نہیں ملتا۔ اُس میں ایک آدھ شعر کا لکھنے والا بھی زمرہ شعراء میں داخل ہے۔ آب حیات میں شاعر مولوی محمد حسین آزاد نے آپ کو نثر اور دو لکھنے والوں میں شمار کیا ہے، مگر نثر ان اردو میں بھی آپ کسی درجہ اعلیٰ پر نہیں پہنچے، آپ اٹا وہ کے رہنے والے تھے، لیکن اسے سوا سو برس پہلے دلی اور لکھنؤ کی زبان کا چچا تھا، اصحاب اٹا وہ کو کون خاطر میں لاتا ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ اگرچہ امیر خسرو کی کتاب چہار درویش کو آپ نے ۱۰۹۸ھ میں ترجمہ کر کے نو طرز مرقع اردو نام رکھا لیکن مقبول عام نہ ہوا۔ اور میر اسحاق نے ۱۸۰۱ء میں اسی کتاب کو دلی کی اعلیٰ زبان میں تحریر کیا، اور فارسی کی اہل کتاب سے خود ترجمہ کیا، اُس کا نام بارغ و بہار رکھا گیا، آج کل بازار میں بھی کتاب فروخت ہوتی ہے اور نو طرز مرقع کا کہیں پتہ نہیں۔ کتاب کے ساتھ ساتھ آپ کے نام نامی سے بھی لوگ بے خبر ہو جاتے اس لیے چند سطور حوالہ قلم کی گئیں کہ کم از کم آپ کی یاد لوگوں کے دلوں میں رہنا زیادہ حالات معلوم نہ ہوئے ورنہ تحریر کیے جاتے۔

## ڈاکٹر جان گلکرسٹ

عجیب بات ہے کہ فارسی جو مسلمانوں کی چھٹی زبان تھی اُن کے دور سلطنت میں سرکاری دفاتر میں ایک ہندو راجہ ٹوڈرل کی کوشش سے داخل ہوئی اور دوسرے

دور میں یعنی مسلمانوں کے عہد تنزل میں اردو نے ایک انگریزی کی دسات سے دھار سہرا  
میں رسائی پائی۔ وہ کون؟ ڈاکٹر جان گلکرسٹ جس نے اُس وقت کے قابل قابل  
لوگ بھم بھنچائے اور مختلف کتابیں لکھواتا شروع کیں حقیقت یہ ہے کہ اردو نثر کا لکھنا  
اُسی وقت سے شروع ہوا اور یہ کہنا بیجا نہیں ہے کہ نظم اردو پر جو احسان دلی نے کیا  
اُس سے زیادہ نثر اردو پر جان گلکرسٹ نے کیا ہے، کیونکہ اُس نے نہ صرف  
زبان اردو کی قواعد اور لغت تحریر کی بلکہ اردو لوگوں سے بھی مختلف کتابیں لکھوائیں۔ ہم نے  
اس محسن اردو کو مصنفین اردو میں شمار کیا ہے۔ ر

آپ کی تالیفات کا سلسلہ ۱۷۸۷ء سے شروع ہو جاتا ہے، آپ نے اردو زبان پر بہت سی  
کتابیں لکھی ہیں جن میں سے حسب ذیل زیادہ مشہور ہیں۔

(۱) انگریزی ہندوستانی لغت کلکتہ ۱۷۹۰-۱۷۹۱ء

(۲) ہندوستانی علم اللسان جس میں انگریزی، ہندوستانی اور ہندوستانی انگریزی کی فرسنگ ہو  
اور شروع میں صرف دو نحو پر مقدمہ بھی ہے جو دوسرے ایڈیشن میں مع اضافہ و ترمیم شائع  
ہوا۔ اڈنبرا ۱۸۱۰ء۔

(۳) ہندوستانی کی صرف و نحو کلکتہ ۱۷۹۶ء

(۴) مشرقی زبانوں یعنی ہندوستان کی مقبول زبان کا آسان مقدمہ، جس میں زبان کے  
ابتدائی مسائل اور انگریزی ہندوستانی اور ہندوستانی انگریزی لغت بھی شامل ہے  
کلکتہ ۱۷۹۸ء۔

(۵) کتاب مذکورہ بالا کا اضافہ بعض اضافوں کے ساتھ۔ کلکتہ ۱۸۰۰ء۔

(۶) فارسی فعل کا جدید نظریہ مع ہندوستانی مترادفات کے۔ کلکتہ ۱۸۰۰ء۔

(۷) ہندوستان کی سب سے بڑی اور مقبول زبان ہندوستانی کا رہنما (جنہیں کیلیے) کلکتہ ۱۸۰۲ء

(۸) تالیف ہندی و عربی فارسی طلباء کے لیے ہندوستانی کی تحصیل کا آسان رستہ، یہ کتاب کالج کے

شعبہ ہندوستانی کے علماء نے ڈاکٹر گلکرسٹ کی ہدایت و نگرانی میں ترجمہ اور مرتب کی۔  
کلکتہ ۱۸۰۳ء۔

(۹) ہندی عربی آئینہ - یعنی ایسے عربی الفاظ کی جدولیں جن کا ہندوستانی زبان سے خاص  
تعلق ہے۔ کلکتہ ۱۸۰۴ء۔

(۱۰) مکالمہ (انگریزی و ہندوستانی) یہ کتاب یورپیوں کے لیے تھی تاکہ عام مضامین پر  
بول چال میں انہیں مہارت حاصل ہو اور وہ ہندوستان کے باشندوں کے ساتھ  
گفتگو کر سکیں۔ لندن ۱۸۰۲ء۔

(۱۱) نقص مشرقی، اس میں حکایات نعمان اور قدیم حکایات و قصص کا ترجمہ انگریزی سے ہندو  
اور فارسی وغیرہ میں کیا گیا ہے۔ کلکتہ ۱۸۰۳ء وغیرہ۔

ڈاکٹر صاحب نے ایک حصہ انگریزی ہندوستانی لغت کا تیار کر کے ۱۷۹۷ء میں  
طبع کرایا۔ مگر دوسری جلد ہندوستانی انگریزی لغت ختم نہ کر سکے۔ علاوہ اُن تمام دفتروں  
کے جن سے وہ گھبرا گئے تھے، ایک دقت یہ بھی تھی کہ خریدار ہم نہ پہنچے، صرف ۷۰ صاحبوں نے  
خریداری منظور کی حالانکہ خرچ کا اندازہ کم سے کم چالیس ہزار روپے کا کیا گیا تھا۔ ڈاکٹر  
صاحب نے اس کام کو نہایت حسرت کے ساتھ خیر باد کہا۔

ڈاکٹر صاحب نے انیسویں صدی کے شروع میں بمقام فوٹ وولیم کلکتہ اُردو کا  
ایک محکمہ قائم کیا جس کا ابتدائی اور اصلی مقصد یہ تھا کہ جو انگریز یہاں ملازمت اختیار کرتے  
ہیں اُن کی تعلیم کے لیے اُردو کی مناسب اور مفید کتابیں تالیف کرائی جائیں، چنانچہ ڈاکٹر صاحب  
ہی کی اس دلچسپی کا نتیجہ تھا کہ اُردو میں بہت سی کتابیں تالیف یا ترجمہ ہوئیں۔ اور ڈاکٹر صاحب  
ہی کے اہتمام سے چھپیں۔

خدا کرے کہ یہ شجر اُردو جس کی آبیاری سو سو برس ہوئے ڈاکٹر جان گلکرسٹ نے کی تھی  
خوب پھولے اور پھلے اور ہزار ہا سال کے آئندہ زمانے میں اس کی شاخیں افصائے عالم

میں پھیلے۔ زبان نہ صرف ہندوستان کی بلکہ تمام عالم کی لنگوا فرینکا ہو جائے۔  
 اس دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

## سید حیدر بخش حیدری

یہ بزرگ دہلی کے رہنے والے تھے۔ ہمیں پیدا ہوئے اور اسی خاک پاک میں نشو و نما  
 پائی، شاہ عالم بادشاہ کا زمانہ تھا جبکہ ہندوستان کے ہر صوبہ میں خود مختار ریاستیں قائم ہو چکی تھیں  
 اور اکبر اور عالمگیر کے جانشینوں کی وقعت شاہ ظفر سے زیادہ نہ تھی، چنانچہ مرزا سوادا  
 نے اپنا مشہور محسن شہر آشوب لکھا جو بقول حضرت آزادؒ ”غور سے دیکھو تو ملک کی دلسوزی  
 نے اپنے وطن کا مرنیہ کہا ہے“ جو کچھ ہوا اُس وقت اہل کمال، ناقدری اور کس سپہری کے  
 ہاتھوں تنگ آکر اپنے وطن عزیز کو خیر باد کہنے پر مجبور ہوئے، اور سید حیدر بخش بھی جن کا تخلص  
 حیدری تھا اسی عجم غفر کی پیروی میں گھر سے باہر نکلے، چندے اور دھڑا دھر سرگردان پریشان  
 پھرے آخر قسمت نے انہیں کلکتہ کے فورٹ ولیم میں پہنچا دیا۔ اور وہاں انہوں نے شعبہ  
 تصنیف و تالیف میں ملازمت اختیار کر لی۔ آپ نے ۱۲۱۰ ہجری مطابق ۱۸۹۵ء میں ایک  
 فارسی کے نقشہ کو سلیس اردو کا جامہ پہنا نا شروع کیا۔ اور اُس کا نام آرائش محفل رکھا۔  
 لیکن یہ خیال نہ کرنا چاہیے کہ یہ کتاب اُس فارسی نقشہ کا لفظ بلفظ ترجمہ ہے کیونکہ بقول مؤلف  
 ”اکثر اس میں اپنی طبیعت سے جہاں موقع پایا اور زیادہ کیا تاکہ نقشہ طولانی ہو جائے اور مٹھنے والے  
 کو خوش آئے“ جب یہ کتاب درجہ تکمیل کو پہنچی تو مصنف نے ایک قطعہ تاریخ بھی کہا جو کتاب کے  
 آخر میں درج ہے۔ وہ ہذا:-

اس نقشہ پر لطفت کے انعام کی تاریخ میں ل میں سمجھتا تھا نہایت ہی ہوشیاری

کردور سیر یاں کہا بہر حسد دے کیونکہ نہ کہیں ہم اسے آرائش محفل

آرائش محفل کے علاوہ طوطا کہانی، وہ مجلس، گلزار دانش یعنی ترجمہ بہار دانش، اور

تایخ نادری بھی آپ سے یادگار ہیں۔ طوطی نامہ، ابن نشاطی نے عبداللہ قطب علی شاہ کے زمانہ میں دکنی زبان میں لکھا تھا۔ مگر اخذ اس کا ایک مندرت کتاب ہو، حیدری نے طوطا کہانی کے نام سے اُسے اردو میں لکھا ہے۔ (مکتبہ سنیہ ۱۸۰۲ء و ۱۸۰۳ء)۔ وہ مجلس جس کا دوسرا نام گل مغفرت ہے مسلمانوں کے اولیاء اللہ کے حالات میں لکھی ہے اور اس میں سلمان شہداء کے حالات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے لیکر شہادت کر بلا تک درج ہیں۔ (طبع ۱۸۱۲ء)۔

تایخ نادری کسی فارسی تایخ کا ترجمہ ہے جس میں نادر شاہ کے حالات درج ہیں۔ اور فارسی کی مشہور کتاب بہار دانش کا ترجمہ گلزار دانش کے نام سے کیا ہے، اس میں عورتوں کی چالاکی اور مکر و فریب کا ذکر ہے۔

ان بزرگوں کے حالات زندگی کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ غنیمت ہے کہ میرا تن دلو جی دو چار سطریں باغ و بہار میں اپنی نسبت نہ سہی اپنے بزرگوں کے بارے میں لکھ تو دیں۔ اُن کے ہم عصروں نے تو اتنا بھی نہ کیا۔ نگاہیں بیتاب ہو کر ان مصنفین کے حالات دیکھنے کو انکی کتابوں کے صفحات پر پڑتی ہیں لیکن مایوس ہو کر لوٹتی ہیں۔ آزاد کو شعر اے کے حالات کچھ تو پڑنے لوگوں کی زبانی معلوم ہو گئے، کچھ تذکروں سے پتہ چل گیا۔ بشر کی طرف نہ کسی کو توجہ تھی نہ شاران بالکمال سے دیکھی تھی۔ خود ان مصنفین کو بھی یہ خیال نہ تھا کہ ہم اردو بشر کے علم بردار اور پیش رو ہیں، ایک زمانہ آئیگا کہ لوگ ہمارے حالات کا کھوج لگانے کی کوشش کریں گے اور بشر طبعاً نہایت ذوق و شوق سے پڑھیں گے، جب یہ حال ہے تو آج تمنا کو کون تباہ کرے کہ یہ بزرگ کس سنہ میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم کس سے پائی اور کہاں تک علمی استعداد ہم پہنچی، کس مزاج کے آدمی تھے، لوگوں سے اُٹھ کیا رہا تو تھا وغیرہ اتفاق سے اس قدر ضرور معلوم ہو گیا کہ آپ نے ۱۸۲۵ء میں انتقال فرمایا۔

چار و ناچار حالات سے قطع نظر کہ آپ کی کتاب آرائش محفل سے کچھ عبارت نقل کرتا ہوں تاکہ ہماری زبان کی ابتدائی شکرانہ نمونہ معلوم ہو جائے یہ امر قابلِ محاظ ہے کہ اس کتاب کی

عبارت بھی میرا متن دہلوی جیسی صاف شستہ اور با محاورہ ہے۔ شاہ عبدالقادر صاحب کے دیباچہ یا ترجمہ جیسی نہیں، مطلب سمجھنے میں کسی قسم کی دقت یا رکاوٹ کا کیا ذکر ملکہ زبان آجکل کے مذاق کے مطابق ہے، بشرطیکہ دو چار جگہ تھوڑی سی تبدیلی کر دی جائے۔

**پہلا قصہ :-** سننا ہے کہ خراسان کے ملک میں ایک بادشاہ تھا کہ لاکھوں سوار و پیادہ اُس کے جلوس میں ہمیشہ ساتھ رہا کرتے تھے، اور عدل و انصاف میں ایسا تھا کہ شیر و بکری کو ایک گھاٹ پر پانی پلاتا تھا بلکہ اپنے بیٹے کا بھی پاس نہ کرتا تھا، اُس کے وقت میں برزخ سوداگر نہایت مالدار تھا۔ اپنے گماشتوں کو ہر ایک ملک میں سوداگری کا مال و اسباب دیکر بھیجا کرتا تھا اور آپ اُس ملک میں کبھی سے رہتا تھا۔ بادشاہ سے بھی اُس نے بہت ہی رسوخیت ہم پہنچائی تھی اور بادشاہ کی بھی اُس پر کمال مہربانی تھی۔ ایک مدت بعد قریب المریگ پہنچا، اُس کی زندگی کا پیالہ بھرنے لگا۔ وہ حسن بانو کے سوا بیٹا بھی کوئی نہ رکھتا تھا، چنانچہ وہ مال اُسی لڑکی کو ملا۔ اُس وقت وہ بارہ برس کی تھی، آخراں کو اس نے اپنے گھر کا وارث کیا اور اُس کو بادشاہ کے سپرد کر کے آپ ملک عام کارستہ لیا۔ بادشاہ نے اُسکو بھی اپنی لڑکیوں کی طرح رکھا اور اُس کے زرو جو اہر کا کچھ لالچ نہ کیا۔ بلکہ وہ سبب سبب اُسی کو سونا چنر روز بعد جب وہ لڑکی شہور دار ہوئی تو اپنے ذہن کی رسائی اور نیک بختی کے باعث سے دائی سے کہا کہ اے مادر مہربان دنیا مانند حجاب ہے، اس کا مٹا کچھ بڑی بات نہیں، اس قدر دولت تنہا لیکر میں کیا کروں گی مصلحت یہی ہے کہ اس کو خدا کی راہ میں لٹا دوں اور آپ کو آلائش و نیا دی سے پاک رکھوں اور شادی نہ کروں بلکہ یادِ خدا میں مصروف رہوں، اس واسطے تم سے پوچھتی ہوں کہ اس سے کس طرح چھٹکارا پاؤں، جو مناسب جاؤ کہو۔ دائی نے کہا۔ اے جانِ پدر تو ان سات سوا لوں کا اشتہار لکھ کر دروازہ پر چپکا دے اور یہ کہہ کہ جو کوئی میرے سانپ سوال پورے کرے گی میں اُسکو قبول کر دوں گی اور وہ سوال یہ ہیں۔ پہلا سوال یہ ہے کہ وہ کیا ہے جو ایک بار دیکھا دوسری بار دیکھنے کی ہوس ہے۔ دوسرا سوال یہ ہے کہ نیکی کراور دیا میں ل

تیسرا سوال یہ ہے کہ کسی سے بدی نہ کر اگر کرے گا تو وہی پائے گا۔ چوتھا سوال یہ ہے کہ سچ کہنے والے کو ہمیشہ راحت ہے۔ پانچواں سوال یہ ہے کہ کوہِ ندا کی خبر لا دے۔ چھٹا سوال یہ ہے کہ وہ موتی جو مرغابی کے انڈے کی برابر بالفعل موجود ہے اُس کی جوڑی پیدا کرے۔ ساتواں سوال یہ ہے کہ حاتم بادر کو کی خبر لا دے۔ حسن بانو نے دانی کی اس بات کو پسند کیا اور خوش ہو کر دل میں کہا وہ ایسا کون ہے جو ان ساتوں سوالوں کو ہم پہنچائیگا۔ اسی گمان پر وہ ہر وقت روزہ نمازیں مشغول رہتی۔ ایک روز کوٹھے پر سے بازار کا متاثر دیکھ رہی تھی کہ اتنے میں ایک فقیر بزرگ صورت مع چالیس خادموں کے اس کی طرف سے گزرا، وہ پاؤں زمین پر نہ رکھتا تھا۔ چنانچہ اُس کے ساتھی سونے چاندی کی اینٹیں کھتے اور وہ ان پر قدم رکھتا چلا جاتا تھا۔ حسن بانو نے یہ حال دیکھ کر دانی سے کہا کہ اے مادرِ یہ فقیر بڑا صاحبِ کمال معلوم ہوتا ہے جو اس شان و شوکت سے راہ چلتا ہے۔ اُس نے کہا یہ بادشاہ کا پیر ہے۔ ہر مہینے میں بادشاہ دو چار بار اس کے پاس جاتا ہے اور کبھی یہ بھی بادشاہ کے پاس آتا ہے، اس کی برابر دنیا میں کوئی درویش نہیں کیونکہ یہ نہایت پرہیزگار ہے۔ حسن بانو نے کہا کہ تم پر دانگی دو کہ میں اس فقیر کی مہمانی کروں اور گھڑی دو گھڑی بلا کر تکلیف دوں، اور اپنی آنکھیں اُس کے قدموں پر ملوں، دانی نے کہا یہ کام تو شوق سے کر۔ مثل مشہور ہے آنکھوں تکلیج ٹھنڈک۔ غرض اُس نے اُس فقیر سے کہلا بھیجا کہ کسی دن میرے یہ خانہ کو اپنے قدم مبارک سے روشن کر دو تو یہ کترین دونوں جہان کی دولت حاصل کرے اور اپنے دامنِ مراد کو گوہرِ مقصد سے بھرے۔ غرض ایک شخص نے اُس فقیر سے جا کر کہا کہ بزرگوں کو لازم ہے کہ خوردوں پر مہربانی کرے اُنکے دہنِ متا کو گلِ مراد سے بھریں۔ یہ اُس نے قبول کیا اور کہا ضرور آؤنگا کیونکہ یہ سنتِ نبویؐ ہے جو اس سے پھرے وہ فقیر جہنم میں گرے، مگر آج مجھے کام ہے، کل ضرور آؤنگا۔ یہ خبر حسن بانو کو پہنچی کہ کل دو چار گھڑی دن چڑھے شاہ صاحب مع چالیسوں آدمیوں کے رونق افزا ہونگے۔ یہ سُن کر اُس نے ہر قسم کے کھانے پکوانے اور کئی خوان میوے اور مٹھائی کے تیار کیے، اور کئی کشتیاں رواج

کی بھی شاہ صاحب کی نذر کے لیے رکھیں، اس امید پر کہ کل شاہ صاحب آئیں گے تو ان کی نذریہ کروں گی۔ اسی انتظار میں تھی کہ صبح کو وہ دردیش مع چالیس فقیروں کے سونے چاندی کی اینٹوں پر قدم رکھتا ہوا حسن بانو کے گھر تک آیا۔

کروں صفت اسکا میں اب مجھ سے کیا وہ ظاہر میں انسان تھا مسخرا  
جو باطن پہ اُسکے کروں میں غنم تو شیطان سے بھی ہو ابلیس تر  
نہ بالے کا خطرہ نہ بوڑھے کا غم وہ ہے قتل کرنے میں تیغ و دم  
اور حسن بانو نے دروازہ سے شنگاہ تک زرین فرش بچھو رکھا تھا وہ اُس کو روندتا ہوا ستر  
شاہانہ پر آ بیٹھا، خواجہ سرازرو جو اہر کی کشتیاں رو برو لائے، اُس نے قبول نہ کیا اور کہا  
یہ اسباب میرے کس کام کا ہے، اس کے بعد ایک دسترخوان، لطیف اور پاکیزہ بچھا کر  
اُس پر سونے چاندی کے خوان میوے بھرے ہوئے رکھے، اُس میں ہر قسم کے کھانے بھی  
تھے اور فرش شاہانہ بچھا تھا اور پردے زربفت کے کلابتون کی ڈوریوں سے دروں پر  
بندھے تھے۔ اور ایک منگیرہ الماس کا اُس کے آگے جمجمہار ہاتھا اور خوجے لباس زرین  
پہنے، سونے چاندی کی چلیجی آفتاب لائے اور ہاتھ دھلوا کر بادب کھڑے ہو کر عرض کرنے  
لگے کہ ہماری بی بی اس بات کی آرزو مند ہے کہ خداوند کچھ تناول کریں۔ یہ بات سُکر وہ متکا  
کھانا کھانے لگا۔ اور سونے چاندی کے اسباب کو بھانپنے لگا اور ہر نوالے پر اپنے جی میں  
کہتا تھا کہ برنخ سوداگر بڑا مالدار تھا جو اتنا اسباب بادشاہوں کی طرح چھوڑ گیا۔ آج ہی رات  
کو یہ سب اپنے گھر پر لیجانا چاہیے، اسی سوچ میں اُس ملعون نے تھوڑا بہت کھانا زہر لگے کے  
ہاتھ کھینچا۔ پھر خواص جزا و عطر دان لائے، اُس نے وہ عطر اپنی ڈاڑھی اور پوشاک میں ملا  
اور ظروف مینا کار کو آ نکلا، اور حسن بانو کو دعائیں دیکر خست ہوا حسن بانو کے نوکر اُس کی  
ضیافت کے کاروبار میں تھک کر رات کو بے اختیار ہو کر سو رہے، نہ انہوں نے کوٹھوں کے  
دروازے بند کیے، نہ زردو جو اہر کو ٹھکانے سے رکھا۔ پہر رات گئے وہ ڈکیت، انسان صوٹ،

شیطان خصلت اپنے چالیسوں چوروں کے ساتھ اُس کی حویلی میں آیا اور تمام زرد جو اہر غارت کرنے لگا۔ اس عرصہ میں تھوڑے لوگ جاگ اُٹھے، وہ ان ظالموں کے ہاتھ سے زخمی ہوئے اور کچھ مارے گئے جسٹن باؤنڈ کھڑکی سے جھانک رہی تھی اور سب کو بچا کر لے کر لے رہی تھی کہ اسنوس یہ موانو وہی خانہ خراب فقیر اور اُس کے ساتھی ہیں۔ اس کا اعلان کوئی کیا کسے غرض رات اسی پچھتاوے میں کاٹی۔ صبح کو مژدوں اور زخمیوں کو چار پانی پڑا لکر بادشاہ کے حضور میں لگئی اور فریادیوں کی طرح آواز بلند دہائی دیکر کہنے لگی کہ میں گت گئی، بادشاہ نے پوچھا کون ہے اور کس کے ظلم سے اتنی سبقتا رہے۔ خبرداروں نے عرض کی برترخ سوداگر کی لڑکی چار پانیوں پر کئی زخمی اور مردے لائی ہے۔ اور رو کر عرض کرتی ہے کہ اگر جہاں پناہ نزدیک بلائیں تو یہ لونڈی کچھ حال اپنی واردات کا حضور میں بیان کرے۔ یہ سنکر بادشاہ نے نزدیک بلا کر پوچھا، اُس نے مجرا دیکر کہا۔ عمر و دولت خداوند کی بڑے اور مہر انصاف سپہرستی پر تاقیامت جلوہ گر رہے۔ کل دن کو لونڈی نے فقیر کی دعوت کی تھی، اُس نے یہ غضب مجھ پر کیا کہ پہر رات گئے اپنے چالیسوں ساتھیوں سمیت آکر میرے گھر کو لوٹا۔ دس بیس کو زخمی کیا اور چار کو مار ڈالا اور گیارہ بارہ لاکھ روپے کا زرد جو اہر لے گیا۔ خدا اُس کا منہ کالا کرے کہ اتنا ظلم و ستم اُس نے مجھ پر کیا۔ یہ سنکر بادشاہ غصہ ہو کر کہنے لگا اے بے وقوف تیرے کچھ بھی شعور ہے جو ایسے ولی کو تہمت لگاتی ہے، وہ تمام جہاں کی چیزوں سے نفرت رکھتا ہے۔ جسٹن باؤنڈ نے پھر کہا کہ اے حضرت ایسے کافر کو دلی نہ کہیے، یہ تو شیطان سے بھی زیادہ ہے۔ آپ کیا ارشاد فرماتے ہیں ۷

اس کو کس طرح سے کہیں انساں ہے یہ سلعون زادہ شیطان

اس بات کو سنکر وہ اور بھی غضبناک ہوا اور تاؤ پیچ کھا کر کہنے لگا کہ ارے کوئی ہے جو اس کج بخت لڑکی کو میرے سامنے ہی سنگسار کرے کہ یہ اپنی سزا کو پہنچے تاکہ اوروں کو عبرت ہو اور پھر کوئی یہ حرکت نہ کرے کہ ایسے بزرگ کو یہ بات کہے۔ اسے میں ایک زیر

نیکو اپنی جگہ سے اٹھا اور پائے تختِ شاہی چوکر عرض کرنے لگا کہ جہاں پناہ دینا وہی تبرخ سوداگر کی بیٹی ہے کہ جس کے سر پر حضور دستِ شفقت اس کے باپ کی زندگی میں پھرتے تھے اور پیار کر کے پاس بٹھاتے تھے۔ آج اُسکو سنگسار کرتے ہو۔ اس کو مارو گے تو ان غلاموں کے دلوں سے خداوند کی مہربانی اور بندہ پروری کا اعتماد اپنے فرزندوں کے حق میں اٹھ جائیگا اور ہر ایک اس اندیشہ سے ہلاک ہو گا کہ جہاں پناہ ہمارے فرزندوں کے ساتھ بھی یہی سلوک کریں گے جو آج اس لڑکی کے ساتھ کرتے ہیں اور اس کا خیال کر کے کنارہ کش ہونگے، اغلب ہے کہ غنیم سے جا ملیں اور حضور سے دشمنی کریں۔ واجب تھا عرض کیا۔ آگے جو مرضی خداوند کی، بادشاہ نے کہا کہ میں نے تیری سفارش اور تبرخ سوداگر کی روح کی خاطر سے اس کی جان بخشی کی۔ اگر یہ اپنا بھلا چاہتی ہے تو اس شہر سے نکلی دے ملبکہ حضورِ عالی کے لوگ اس کو نکال دے آئیں، اور زرو جو اہر سے لیکر بھاڑو کا ترنگا تک اس کا گوشہ خانہ میں داخل کریں۔“

## میرزا علی لطف

آپ کا نام میرزا علی ہے، اور لطف تخلص ہے۔ آپ کے والدناظم بیگ خاں اسطر آباد کے رہنے والے تھے۔ ۱۰۵۰ھ ہجری میں نادر شاہ کے سامنے آئے۔ انھیں آباد تشریف لائے اور ابو المنصور خاں صفدر جنگ کی وساطت سے دربار شاہی میں رسوخ پایا۔ فارسی کے شاعر تھے اور ہجری تخلص کرتے تھے، فارسی میں میرزا علی لطف ماپ ہی کے شاگرد تھے۔ لطف گلشنِ بہار کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:- ”میرا ارادہ سیر حیدر آباد کا تھا۔ مگر چونکہ سڑکِ کلاہٹ نے بڑے اخلاق اور تپاک کے ساتھ مجھ سے اس تذکرے کے لکھنے کی خواہش کی لہذا میں نے اسے بسر و چشم قبول کیا“ اس کے بعد نواب سعادت علی خاں اور مارکوٹس آف ولزلی کا ذکر کرتے ہیں اور پھر لکھتے ہیں کہ ”موافقی حکم اس صاحبِ اللہ صاحب

کے کہ نام نامی اور اسم گرامی اُس کا اوپر مذکور ہوا ہے، اس مسجد ان نے یہ تذکرہ لکھا۔  
 تذکرہ گلشن ہند مؤلف نے سلسلہ میں ترتیب دیا۔ لطف ایک معمولی شاعر ہیں، غزل  
 و قصیدہ و مثنوی سب کچھ لکھا ہے۔ مگر کلام میں لطف نہیں۔ البتہ یہ تذکرہ ایک ایسا کارنامہ ہے  
 جو اردو زبان میں قابلِ یادگار ہے۔ زبان صاف اور سادہ ہے تاہم قافیہ کو ہاتھ سے جانے  
 نہیں دیتے۔ بعض باتیں اس تذکرہ میں ایسی درج ہیں جن کا ذکر کسی اور جگہ نہیں پایا جاتا۔  
 تاریخی حالات بھی خوب درج کیے ہیں۔ خود شیعہ ہیں اور بعض اہل سنت کا ذکر تعصب  
 کے ساتھ کرتے ہیں، یہاں تک کہ بعض باتیں بالکل لغو اور کذب سے پُر بیان کر جاتے ہیں  
 مثلاً شاہ ولی اللہ صاحب کی نسبت لکھا ہے کہ ”قرۃ العین فی ابطال شہادت احننین اور  
 جنت العالیہ فی مناقب المعاویہ ان کی تصانیف سے ہیں“ حالانکہ ان مباحث میں انکی  
 کوئی تصنیف نہیں ہے، نہ شہادت حسنین کا ابطال کیا ہے، نہ مناقب معاویہ میں  
 کوئی کتاب لکھی ہے، اس کے بعد یہ کہہ کر کہ ”یہ والد ہیں شاہ عبدالعزیز کے“ خوب چوہلیج  
 کی ہے۔ یاتانا شاہ کے حالات میں لطف نے عالمگیر کی نسبت یوں گہرائشی فرمائی ہے کہ  
 ”غلام مکاں نے استیصال بادشاہانِ دکن کا جو اس محنت سے کیا، اور مکہ مسجد کو کھدوا  
 وہ کچھ مظالم اپنی گردن پر لیا، خدا جانے اس حرکت کا کیا سفاک ہے“ مکہ مسجد کا کھدوانا نہایتان اور  
 صریح جھوٹ ہے۔ تعجب ہے کہ مؤلف نے جو خود حیدرآباد میں رہا ہے، اس کذب کا لکھنا  
 کیونکر گوارا کیا۔ ہمیں شاید ناظرین کو یہ طمینان دلانے کی ضرورت نہیں کہ مکہ مسجد موجود ہے  
 اور اب تک نظر بد سے محفوظ ہے۔

لیکن باوجود ان سب باتوں کے میرزا لطف بعض اوقات سچ کہنے میں بھی تامل  
 نہیں کرتے اور بے کم و کاست بیان کر جاتے ہیں۔ مثلاً نواب آصف الدولہ کے حالات میں  
 اُن کی داد و دہش اور مروت کی بے انتہا تعریف کی ہے مگر آخر میں صاف لکھ دیا ہے۔  
 ”افسوس یہ ہے کہ فوج اور ملک کی طرف سے غفلت تھی، نایبوں کے ہاتھ میں اصالتاً

ملک کا سر انجام رکھا، آپ سیر دشکار سے کام رکھا، مشیر کوئی لائق اور کام کا نہ پایا، اس واسطے ساتھ عزم کے رتبہ نام کا نہ پایا۔“

اس تذکرہ کی چند خصوصیات مولوی عبدالحق صاحب کے مقدمہ سے انتخاب کر کے لکھی جاتی ہیں:-

(۱) اول تو سوا سو برس پہلے کی زبان ہے جس سے زبان کے متعلق بہت کچھ پتہ لگ سکتا ہے اور محقق علم اللسان کو اور نیز ان لوگوں کو جنہیں زبان کا چسکا ہے بہت کچھ نئی باتیں معلوم ہو سکتی ہیں۔ دکن کی زبان میں بعض الفاظ جو روزمرہ بول چال میں آتے ہیں اور ہم لوگوں کو اجنبی معلوم ہوتے ہیں وہ درحقیقت پرانی زبان کی یادگار ہیں۔ مثلاً ”کرکے“ کا خاص استعمال جو دکن میں روزمرہ سنا جاتا ہے اس تذکرہ میں بھی جا بجا موجود ہے۔ جیسے:-  
”شورش تخلص، متوطن عظیم آباد کے، مشہور میر پہنا کر کے تھے۔“

فعل کے بعض استعمال بھی جو حیدر آباد میں کثرت سے سُننے میں آتے ہیں اس کتاب میں پائے جاتے ہیں۔ مثلاً فعل متعدی میں فعل بلحاظ مفعول کے آتا ہے مگر اس کتاب میں بعض جگہ فاعل کے لحاظ سے آیا ہے۔ دکن میں عموماً اسی طرح بولتے ہیں ضیا کے حال میں لکھا ہے:-

”دلی سے جب لکھنؤ میں آئے تو طور سکونت کا وہیں ٹھہرائے“ فقیر کے تذکرے میں لکھتے ہیں:- ”بیشتر دکن بطور سیاحت کے دیکھے، اور اکثر مقاموں میں سیر کی وضع پر پھرے“

(۲) دوسرے علاوہ اسکے کہ مؤلف ایسے زمانے میں تھا جبکہ نظم اردو دعویٰ پر تھی اور بڑے بڑے اساتذہ زندہ تھے اور مؤلف اُن کا ہم عصر تھا اور ان میں سے اکثر سے شناسائی اور دوستی تھی، اور اس لیے جس وثوق اور صحت کے ساتھ اُن کے حالات یہ لکھ سکتا ہے دوسرا نہیں لکھ سکتا۔ اور بعض حالات تو ایسے لکھے ہیں جو کہیں دوسری جگہ دیکھنے میں نہیں

آئے۔ مثلاً رزیدنٹ لکھنؤ کا تیسرے قی کو فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں زبانِ رنجیت کی تالیف و تصنیف کے لیے طلب کرنا اور بوجہ پیرائے سالی اُن کا منتخب نہ ہونا۔

(۳) تیسرے صاحبِ تذکرہ نے ایک یہ کام بھی بہت اچھا کیا ہے کہ جن لوگوں کو تھوڑا بہت یا کسی قدر تعلقِ سلطنت سے رہا جو اُن کے تذکرے میں تاریخی حالات بھی خوب خوب لکھے ہیں۔ چنانچہ شاہِ عالم متخلص بہ آفتاب کے حال میں اُن کا بزمانہ و بعدی عماد الملک کے خون سے دلی چھوڑنا، باپ کا دھوکے سے فیروز شاہ کے کوٹلے میں قتل ہونا اور اُن کا ۱۱۳ھ میں تختِ نشین ہونا، رام نرائن سے جنگ، دلیر خاں کی دلیری اور جاں نثاری، فتح و نصرت کا حامل ہونا وغیرہ وغیرہ بالتفصیل لکھا ہے۔ مرزا محمد رضا امید کے حالات میں اکثر تاریخی واقعات اور قصص لکھے ہیں خصوصاً میرزا محمد رضا امید کے تذکرے میں، امیر الامرا حسین علی خاں اور اُن کے بھائی کے حالات بڑی خوبی سے تحریر کیے ہیں۔

(۴) چوتھے اس کتاب سے زمانے کی سوسائٹی پر بھی روشنی پڑتی ہے اور یہ بات توصافِ صاف نظر آتی ہے کہ ہمارے شاعروں کا گروہ عجیب بے فکر تھا اور دنیا و مافیہا کی کچھ خبر نہ تھی جنہیں جب ہمارے بادشاہ، نواب اور اُمرا اس طرف جھکے تو وہ بھی ایسے ہی ہو گئے، ان لوگوں نے رہا سہا نہیں اور کھودیا، ملک گیری اور ملک داری کبھی کی جا چکی تھی، اس لیے اولوالعزمی اور ہمت بھی اسکے ساتھ ہی خصمت ہو گئی، جہانی اور داغی قوی میں انحطاط پیدا ہو گیا تھا، ایسی حالت میں حقیقی سہرت کہاں! البتہ عارضی خوشحالی اور جھوٹی زندہ دلی موجود تھی، شعر و شاعری نے اس کا سامان اور مہیا کر دیا، دیوانہ راہوئے بس است، شاعروں کی بن آئی، وہ تو اس شغل میں رہے، اور یہاں کام تمام ہو گیا۔

علاوہ اس عام حالت کے تذکرے میں جو بعض باتیں مضمناً بیان کر دی ہیں وہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہیں۔ ایک واقعہ یہ ہے کہ نواب وزیر اور دھاس زمانے میں جب کہان کا عروجِ اقبال تھا اور بادشاہ نام کے بادشاہ رہ گئے تھے، تب بھی شاہانِ دہلی اور ان کے گھرانے کی

بے انتہا تعظیم و محترم کرتے تھے، اور تعظیم بھی ایسی کمال تک کے فوجانوں کے خیال میں بھی نہیں سکتی  
چنانچہ میرزا جواں نخت جہاندار شاہ کے حال میں لکھا ہے کہ وہ ۹۰ سالہ ہجری میں دلی سے لکھنؤ چلے  
آئے تھے۔

”ذاب آصف الدولہ مرحوم نے جو مراتب آداب و خدمت گزاری کے تھے، سب ادا  
کیے، خواص میں بیٹھنے کے سوا گھڑیوں ہاتھ باندھے سامنے کھڑے رہے، باوصف اس ناز پروری  
کے کہ کبھی پیادہ قدم کاہے کو چلے تھے، پانچون متھیا باندھے ہوئے ایک لالچی اور گوری کی بخشش  
پر دس دس مرتبہ مبرا گاہ پرستے جا کر آداب بجالاتے تھے۔“

(۵) پانچویں بعض ایسے لوگوں کا بھی حال دیا ہے جن کی نسبت اردو کی شاعری کا گمان بھی نہیں  
ہو سکتا مثلاً کوئی کہہ سکتا ہے کہ شاہ ولی اللہ اردو کے شاعر تھے، اور ان کا تخلص اشتیاق تھا۔  
یا عبد القادر بیدل بھی اردو میں شعر کہتے تھے یا تانا شاہ سے بھی ایک شعر منسوب ہے، بعض ایسے  
شعرا کا بھی کلام درج ہے جن کا نام تو بہت مشہور ہے مگر کلام دستیاب نہیں ہوتا۔

یہ تذکرہ حقیقت علیٰ ابراہیم خاں نے فارسی میں لکھا تھا اور اس کا نام گلزار ابراہیم رکھا تھا  
کوئی بارہ برس کی محنت میں ۹۰ سالہ ہجری مطابق ۱۸۷۷ء میں جاکر ختم ہوا۔ میرزا علی لطف نے  
اس کتاب کو اردو میں لکھا، لیکن یہ نہ سمجھا چاہیے کہ یہ تراجمہ ہے بلکہ مترجم نے اس میں بہت کچھ اضافہ  
کیا ہے، حالات میں بھی اور کلام میں بھی جس سے بالکل نئی صورت پیدا ہو گئی ہے۔ اور اس کو  
تالیف سمجھا جا رہا ہے۔

حکیم رضا قلی خاں آشفہ اور میر غلام حسن کے حالات گلشن مہند سے اقتباس کے  
درج کیے جاتے ہیں:-

## آشفہؒ

”آشفہ تخلص حکیم رضا قلی خاں نام والد ماجد ان کے حکیم محمد شفیع محمد خاں مرحوم  
تھے، متوطن اکبر آباد کے، بڑے بھائی ان کے میرزا ابو صاحب، خدا مغفرت کرے، ذرہ

تخلص کرتے تھے عجب ولولہ اور ذوق شوق کے ساتھ کہ بلائے معلیٰ گئے، اور وہیں خاک ہوئے، روبرو صریح مقدس کے دفن ہیں، حق سبحانہ تعالیٰ احشر بھی ان کا، اور جمیع مومنین کا جناب سید الشہداء علیہ السلام کے ساتھ کرے، دوسرے بجائی ان کے میرزا رضی صاحب وہ بھی ان سے بٹے ہیں، بالفعل لکھنؤ میں داد طبابت اور معالجے کی دے رہے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ جو اختراعات فن طبابت میں انہوں نے کیے دیکھنے کا کیا دخل ہے، کسی نے نہیں سنے صداقت اور لیاقت ان کے خاندان کی نہیں ہے محتاج تشریح اور بیان کی، ہمیشہ بزرگ ان کے معالج سلاطین نامدار کے رہے ہیں، اور امیروں سے بلکہ وزیروں سے سدا ناز و اعتماد کیا کیے ہیں، غرض حکیم رضا قلی خاں آشفۃ تخلص راقم آئتم کے دوستان قدیم سے ہیں۔ جوان آزاد وضع، اور خوش اختلاط وارستہ مزاج، اور مایہ ارتباط میں محبت، اور بھنگی میں خلاصے، اور آشنائیوں کے بہت خاصے، حسن پرستی میں خودیلی و شیریں کی تصویر، اور عشق بازی میں قیس، و فرہاد کے پیر ہیں۔ مشورہ سخن کا انہوں نے میر سوز صاحب سے کیا ہے، لیکن شاگردوں میں ان کے اتنا کوئی نہیں ہوا ہے، میر صاحب مذکور کے طرز ادائیہ میں انہوں نے رنگینی کچھ اور بھی زیادہ کی ہے، سچ تو یہ ہے کہ رنگین ادائی کی داد دی ہے۔ چندے انہوں نے رفاقت میرزا محمد تقی خاں کی کی، جو کہ پو میرزا پوٹھ کور کے تھے، اس سبب سے دواڑھائی برس بود و باش ان کی فیض آباد میں ہوئی تھی، وگرنہ پرورش انہوں نے لکھنؤ میں پائی ہے، اور کیفیت زندگی کی وہیں اٹھائی ہے۔ مشائخ میں لکھنؤ سے مرشد آباد میں آئے، نواب مبارک الدولہ ناظم صوبہ بنگالہ مرض الموت میں گرفتار تھے، اگرچہ معالجہ میں انہوں نے رنگ سیمائی کے دکھائے، لیکن قضا و قدر سے لاچار تھے، بعد نواب مبارک الدولہ کی وفات کے خلف الصدق سے ان کے یعنی نواب عبداللہ ناصر الملک سید پیر علی خاں بہادر ولیہ جنگ سے، نہایت موافقت آئی، اور محبت نے یہ شدت یک رنگی پائی چنانچہ سات برس کامل ان کی خدمت میں رہا

اور قریب لاکھ روپے کے بنگالہ میں پیدا کیے، لیکن خرچ کرنے والے بھی ایسے ہی بلائے روٹا تھے، کہ جس دن مرشد آباد سے نکلے تو قرضدار تھے، غزوہ ذی الحجہ کو ۱۲۱۳ھ ہجری میں اپنے ہی مزاج نازک سے، ناحق روزگار چھوڑ چکے تھے چلے آئے، اور زمانے کی بے رنگی کو مطلق خیال میں نہ لائے، بالفعل کہ ۱۲۱۳ھ ہجری ہیں، یہ عزت تمام کلکتے میں اوقات بسر کرتے ہیں، اور اک رنگ کی صحبتوں میں دن رات بسر کرتے ہیں، طبیعت ان کی موسیقی کی طرف لڑکپن سے ہے، اور ایک مناسبت بھی بھلی چنگی ان کو اس فن سے ہے، اپنی آشفۃ مزاجی میں غزلوں کو انتظام نہیں دیا ہے، وگرنہ مدت سے ایک دیوان کا سرانجام ہو چکا ہے۔ یہ اشعار ان کے نتائج افکار سے ہیں:-

|                                        |                                           |
|----------------------------------------|-------------------------------------------|
| فقط نہ اپنی ہی تم آن دیکھتے جاؤ        | ادھر ادھر بھی مرجان دیکھتے جاؤ            |
| نہیج و تاب کو ہالونکے طول و اتنا       | ہمارا دل ہے پریشان دیکھتے جاؤ             |
| بجائے اشک نکلتے ہیں بارہا کجگر         | مہاسے جی میں تھا ارمان دیکھتے جاؤ         |
| کیا خرید لیجانے مصر میں یوسف           | جناب عشق کی تم شان دیکھتے جاؤ             |
| یہ خرابی تو پڑی مجھ پر ترے جانے سے     | چند بھی ڈرنے لگے اب مرنے ڈرنے سے          |
| کس طرح قید کروں یہ تو ٹھہرتا ہی نہیں   | کون برا آئے بھلا اس دل دیوانے سے؟         |
| میں سمجھتا ہوں کہ تم جا کے نہیں آنے کے | فائدہ کیا جو بھلا جھوٹ قسم کھانے سے       |
| شعلہ آگے تو اتنا نہ جلاتا تھا مجھے     | آج تو آگ ہوا غیر دنکے بھر کانے سے         |
| دیکھتے ہی اُسے کل میرے یہ وسان گئے     | اپنے بیگانے وہاں جتنے تھے سب جان گئے      |
| اپنے کے ہوتے بھلا غیر کو صدقہ تو نہ کر | ہم بھی جی رکھتے ہیں پیارے ترے زمان گئے    |
| مجھ کو کتنا جسم تجھ کو بھی ایسا لگ گئے | انجھ سے آنکھ لانا ہے تجھے آگ لگ گئے       |
| بوسہ کے واسطے چمٹا تو لگا کہنے مجھے    | بس کہیں دُور بھی ہو مجھ کو تیسے آگ لگ گئے |

# حسن

حسن تخلص میر غلام حسن نام شاہجہان آبادی۔ بیٹا میر غلام حسین صاحبک تخلص کا، اولاد ہے میر امامی ہروی کے۔ دلی کے پُرانے شہر میں بود و باش رکھتے تھے۔ صغر سن سے دارالکتبہ میں ہوئے۔ نواب سالار جنگ اور خلف اُن کے میر نوازش علی خاں سردار جنگ کی رفاقت میں اوقات انہوں نے ساتھ عزت اور غربت کے بسر کی ہے اور اصلاح سخن کی میر ضیاء الدین ضیا تخلص سے لی ہے۔ اقسامِ علم سے توجہ جمیع علوم میں انہیں اقرارِ محیہ پائی ہے، ہاں مگر اشعار میں ان کے البتہ ایک صفائی اور روانی ہے، قریب آٹھ ہزار بیت کے انواعِ نظم میں دیوان ان کا ہے، اور ایک تذکرہ بھی ہندی گویوں کا زبانِ ریختہ میں لکھا ہے، بے نظیر اور بدرِ منیر کے احوال میں کیا خوب مثنوی لکھی ہے اور سلسلہٴ ہجری میں سیرِ روضہٴ رضواں کی کی ہے۔ یہ اشعار منتخب دیوان ان کو کردار کے ہیں:۔

|                                          |                                           |
|------------------------------------------|-------------------------------------------|
| گر کیجے رقم کچھ تری وحدت کے بیاں کا      | تو چاہیے خامہ بھی اُسے ایک زباں کا        |
| دامنِ صحرائے اُٹھنے کا حسن کا جی نہیں    | پاؤں دیوانے نے پھیلا یا بیاں کھجکر        |
| آنکھ غمکہ دہریں جو بیٹھے ہم              | شمع سالِ پنے تیلِ آپ ہی بجیٹھے ہم         |
| اُس کی جب بزم سے ہم ہو کے بتنگِ دُہریں   | اپنے ساتھ آپ ہی کرتے ہو جنگِ تے ہیں       |
| منجھیر ہی یہ تراستم دُور کچھ نہیں        | لیکن تراہر ایک سے یہ طور کچھ نہیں         |
| روٹھا کرے دہ کیوں نہ کسی اور سے حسن      | یہ سب بجاڑ چاہ کا ہے اور کچھ نہیں         |
| تیرے ہمنام کو جب کوئی پچائے ہے کہیں      | جی دھڑک جاتا ہی میرا کہیں تو ہی نہ        |
| گر بیاں چاک اور خاموش جھکودیکھ کہتا ہے   | مگر کیا بات اس سے یہ تو کچھ دیوار و درساہ |
| رہنے نہ دیکھا اُس بن یہ دل تو ایک دم بھی | کیوں روٹھکر ہم اپنا کھوویں عبت بھرم بھی   |

لطف نے انتخاب کرتے ہوئے اور بہت سے اشعار درج کیے ہیں، لیکن ہم نے بنیال لکھنؤ اُن کو نظر انداز کر دیا ہے۔ ذیل میں صرف اُس مثنوی کے اشعار درج کرتے ہیں جو لکھنؤ کی ہجو میں کمی ہے اور آزاد کو اُس کے اشعار دستیاب نہیں ہوئے۔ چنانچہ آپ حیا میں لکھتے ہیں کہ:-

”ایک موقع پر میر حسن مرحوم کا سفر شاہ مدار کی چھڑیوں کے ساتھ مطابق پڑا، چنانچہ سفر مذکور کا حال ایک مثنوی کے قالب میں ڈھالا ہے، اس میں فیض آباد کی تعریف اور لکھنؤ کی ہجو کی ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت عورتوں کی پوشاک وہاں کیا تھی اور چھڑیوں والوں کے جزئیات رسوم کیا کیتے، میں نے یہ مثنوی دلی کی تباہی سے پہلے دیکھی تھی، اب نہیں ملتی، لوگ بہت تعریف لکھتے ہیں“

### مثنوی در ہجو لکھنؤ و تعریف فیض آباد

|                                  |                                 |
|----------------------------------|---------------------------------|
| نہیں یہ لکھنؤ ہے یہ زمانا        | زمانے پر عیب رکھنا ہبانا        |
| زبس یہ ملک ہے پتھر پہ بستا       | کبیں اونچا، کبیں نیچا ہے رستا   |
| کسی کا آسمان پر گھر ہوا میں      | کسی کا جھونپڑا تحت الثریٰ میں   |
| زبس گنجان ہے یہ شہر باہم         | سامکتا نہیں ہے غیر کا دم        |
| سیہ گل سے گلی یوں تر رہے ہے      | بعل جس طرح زنگی کی بجے ہے       |
| فراغت سے یہاں کس کا مکاں ہے      | ہر اک گھر محسن کا سادل یہاں ہے  |
| کنواں بھی یوں پھیراں تنگ گھر میں | پڑے پتلی کا تیل جیسے نظر میں    |
| کنواں کہتا اسے ہے عقل سے دور     | کہہ اس گھر کی چھاتی کا وہ ناسور |
| کہوں کیا میں قدامت اس مکاں کی    | پڑی بنیاد بعد اس کے جہاں کی     |
| ہزاروں راہ آئیں تیج در تیج       | ولیکن مثل زلف زشت رو، بیج       |
| جو اس کے زیر سایہ آن نکلتے       | رکے دم، اور اسکی جان نکلتے      |

جو کوئی رات کو بھولے یہاں گھر  
 نہیں مکان جو گھر اپنا وہ پاوے  
 زمیں کو فے سے یہ شہر ہم عدو ہے  
 چڑھے ہے گو مٹی جب گرد آ کر  
 رکھے ہے پار ہو سکتا امکاں  
 سوائے قند یہاں دیکھا نہ کچھ اور  
 چلا میں یہاں سے دل اپنا اٹھا کر  
 عجب معمورہ آباد پایا  
 کھلا بازار اور رستہ کشادہ  
 دورستہ راستے میں اتنا رستا  
 وہ جی ہے شہر کا تہہ پولیا یوں  
 ادھر کو جو ہری ادھر کو بڑا ز  
 روپے اور اشرفی دیکھے برستے  
 یہ فرنی اور من لوہے کا عالم  
 ملا شربت میں جو اُس کو بتا دے  
 ملائی دودھ کی دیکھو تو گو یا  
 بند ہی پر ہے حلوائی کی دکان  
 دھری ہیں گولیاں اور یوں اندر سے  
 مٹھائی کی کروں تعریف تا چند  
 ہزاروں خانگی اور کسی آ کر  
 پھرے گلیوں میں ٹکراتا وہ در در  
 بلا حوشید کو جب تک نہ لاوے  
 اگر شیعہ کہے نیک اسکو بد ہے  
 حباب آسا ہے پھرتے ہیں سب گھر  
 چڑھے جب آدمی پر آدمی یہاں  
 سو ہے رو پوش وہ بھی دیکھ یہ طور  
 کہ کیجیے سیر فیض آباد جب کر  
 مثال گل ہر اک دل شاد پایا  
 بیاض جدولی جیسے ہوسادہ  
 کسی نے آج تک دیکھا ہے بستا  
 کہ جیسے تین دھیں جسم میں ہوں  
 ادھر صراف اور ادھر طلا ساز  
 دیے تختوں پہ جوں نرگس کے دستے  
 کہے تو چاند اور تارے ہیں باہم  
 شب مہ کا سما پانی میں پاوے  
 اُسی میں مال حلوائی نے کھویا  
 ستارے گرد ہیں جیسے چراغاں  
 کہ گویا چاند اور تارے ہیں برستے  
 قلم کی ہو گئی اب تو زباں بست  
 کریں میں سیر لالہ دل لگا کر

چمک دامن کی دکھلا یوں چلے ہو  
کہ بجلی اپنے ہاتھوں کو لے ہے  
وہ سبزہ کان میں زیب بنا گوش  
کہ جسکو دیکھ طوطی کے اڑیں ہوش  
شعاع اسکی یہ اور منہ کا پسینا  
ہے گویا پھول شبنم کا مسینا  
کوئی کرتی بہن جالی کی سادہ  
گریباں کر کے چھائی تک کُشاوہ  
کیا اس دامن میں تکتے کو یوں صید  
سحر کے جوں گریباں میں ہوں خورشید  
سافر اس طرف جو آن نکلے  
نہ نکلے وہاں سے غیر از جان نکلے

زمانہ کیا کیا رنگ بدلتا ہے؟ آج لکھنؤ کو دیکھو تو فردوسِ بریں کا بنو نہ نظر آئیگا۔ مالکِ  
مستحکمہ کی گورنمنٹ بھی اپنا جائے اقامت الہ آباد کے بجائے لکھنؤ کو قرار دینا چاہتی ہے  
اور رفتہ رفتہ لکھنؤ کو منتقل ہو رہی ہے۔ حضراتِ شیعہ لکھنؤ کو بہت پسند کرتے ہیں، اور  
فی الواقع یہ مقام اُن کا مرکز بھی ہے، لیکن میر حسن اسکو کوفہ کا مہجد بتاتے ہیں حالانکہ  
خوشیعہ ہیں۔ اب ایک نئی المذہب لکھنؤ کی تعریف میں یوں زمرہ منج ہے :-

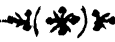
کہاں ہوگی امیر ایسی ادائیں جو روغلاں میں  
ہیں گاہِ خلد میں بھی یاد ہم کو لکھنؤ پر سوں

—\*(\*)—

## مسیب دُر علی حسینی

آپ کے حالات کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ صرف اس قدر معلوم ہے کہ فورٹ ولیم کالج کلکتہ  
کے شعبہ تصنیف و تالیف میں آپ بھی دوسرے اصحاب کی طرح کتاب نویسی کی خدمت  
پر مامور تھے اور بیڈنٹی تھے چنانچہ آپ نے میر حسن دہلوی کی مشہور و معروف مثنوی  
سحر البیان (مقتعہ بدرِ منیر و بے نظیر) کو اردو نثر میں لکھا، اور اس کا نام نثر بے نظیر  
رکھا، آپ نے ایک اور کتاب اخلاقِ مہمدی کے نام سے لکھی ہے، اس کتاب کا

ماخذ فارسی کتاب مفرح القلوب ہے جو اہل میں سنسکرت تصنیف ہنوبادیشا سے لیکھی ہے۔ یہ دونوں کتابیں سترہویں لکھی گئی تھیں۔ انوس ہے ان کتابوں کا کوئی نسخہ ہمیں دستیاب نہ ہوا، ورنہ ان کا نمونہ یہ ناظرین کیا جاتا۔ اور شاید مصنف کے مزید حالات بھی معلوم ہو جاتے۔ سچ اُنچہ مادر کار و داریم اکثرے درکار نیست۔  
ان کتابوں کے علاوہ آپ نے ڈاکٹر کلکلا سٹ کی اردو صرف و نحو کا خلاصہ کلکلا سٹ اردو رسالہ کے نام سے کیا جو کلکتہ میں سترہویں شائع ہوا۔



## میرا تین ہلوی

آپ کا اہلی نام میرا مان ہے اور اتن تخلص ہے، اگرچہ کہیں کہیں اشعار میں اپنا تخلص لطف بھی ظاہر کیا ہے، بڑے نامور اور خاندانی شخص گزرے ہیں۔ فن شعر میں کسی سے اصلاح نہیں لی۔ اپنی طبیعت کی سوز و غم سے آپ ہی آپ شاعر بن گئے۔ بقول سٹرنفلین، میرا تین خود فرمایا کرتے تھے کہ شاعری میرا پیشہ نہیں ہے۔ نہ میں کسی شاعر کا بھائی، میری اردو ٹھکانی اردو ہے، کیونکہ میں دلی (شاہجہان آباد) کا روڑا ہوں اور میں کا پرورش یافتہ ہوں۔

آپ نے اپنے بزرگوں کا حال حسب ذیل الفاظ میں بیان کیا ہے۔ اور کچھ باتیں اپنے متعلق بھی کہہ گئے ہیں:-

”پہلے اپنا حال یہ عامی میرا تین دلی والا بیان کرتا ہے کہ میرے بزرگ ہمایوں بادشاہ کے عہد سے ہر ایک بادشاہ کی رکاب میں پشت بہ پشت جا نعتانی بجالاتے رہے اور وہ بھی پرورش کی نظر سے قدر وانی جتنی چاہتے فرماتے رہے۔ جاگیر، منصب اور خدمات کی عنایت سے مال مال اور نہال کر دیا، اور خانہ زاد موروثی اور منصب دار قدیمی، زبان مبارک سے فرمایا چنانچہ یہ لقب بادشاہی دفتر میں داخل ہوا جب ایسے گھر کی کہ سائے گھر اسکے سبب آباد تھے

یہ نوبت پہنچی، ظاہر ہے، عیاں راجہ بیاں۔ تب سو بج مل جاٹ نے جاگیر کو ضبط کر لیا اور احمد شاہ درانی نے گھربار تاراج کیا۔ ایسی تباہی اٹھا کر ایسے شہر سے کہ جنہم بھوم میرا ہے اور آؤں نا وہیں گڑا ہے، جلا وطن ہوا اور ایسا جہاز کہ جس کا نا خدا، خدا تھا غارت ہوا، میں بیکسی کے سمندر میں غوطے کھانے لگا۔ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا بہت ہوتا ہے۔ کئی برس بلذہ عظیم آباد میں دم لیا۔ کچھ بنی کچھ بگڑی، آخر وہاں سے بھی پاؤں اکھڑے، روزگار نے موافقت کنی عیاں و اطفال کو چھوڑ کر تنہا کشتی پر سوار ہوا۔ اشرف البلاد دہلی کے دروازے سے آہنچا۔ چندے بیکاری میں گزری۔ اتفاقاً ذاب دلا اور جنگ نے بلو کر اپنے چھوٹے بھائی میر محمد کاظم خاں کی اتالیقی کے لیے مقرر کیا۔ قریب دو سال کے وہاں رہا جب ہاں اپنا نباہ نہ دیکھا، تب منشی میر بہادر علی کے وسیع سے حضور جان گلکبر السٹ صاحب بہادر سے رسائی ہوئی۔ بارے طالع کی مدد سے ایسے جوائنر دکا دامن ہاتھ لگا ہے، چاہیے کہ دن کچھ بھٹے آویں، نہیں تو یہی غنیمت ہے کہ ایک ٹکڑا کھا کر پاؤں پھیلا کر سورتا ہوں اور گھر میں دس آدمی بڑے، چھوٹے پرورشش پاکر دعا اُس قدر دان کو کرتے ہیں۔ خدا قبول کرے۔“

آپ نے چار درویش کا قصہ اردو میں ترجمہ کیا اور باغ و بہار نام رکھا۔ یہ ترجمہ اس قدر مقبول ہوا ہے کہ صد ہا مرتبہ مختلف طبعوں میں چھپ چکا ہے، اور اب تک چھپے جاتا ہے۔ اُس زمانہ کے مذاق کے لحاظ سے یہ قصہ نہایت دلچسپ ہے اور سب کو مرغوب ہے، اس کی زبان نہایت صاف، سلیس اور بامحاورہ ہے اور دو چار جگہ سے قطع نظر کر کے تمام کتاب آجکل کے روزمرہ کے موافق ہے، اس کی اردو فصیح اور مستند ہے، باغ و بہار کی تالیف ۱۱۸۱ھ ہجری میں شروع ہوئی اور ۱۱۸۲ھ ہجری میں ختم ہوئی اور یہ اس کتاب کا تاریخی نام ہے، ان کی نثر کو میر تقی میر کی نظم کے ہم پلہ مانا گیا ہے، سرسید نے بھی آثار الصنادید میں یہی رائے ظاہر کی ہے۔

آپ نے باغ و بہار کے علاوہ اخلاق محسنی کا بھی اردو میں آزاد ترجمہ کیا جو ایک بقیہ

کتاب ہے لیکن کیا ب ہے اور گنج خوبی کے نام سے مشہور ہے۔ سنہ ۱۸۷۷ء میں لکھی گئی تھی سرکار نے باغ و بہار کے ترجمہ کا سبب یہ بیان کیا ہے کہ:-

”یہ قفقہ چہار درویش ابتدا میں امیر خسرو دہلوی نے اس تقریب سے کہا کہ حضرت نظام الدین اولیا و زری بخش جو اُن کے پیر تھے اور درگاہ اُن کی دہلی میں قلعہ سے تین کوس لال دروازہ کے باہر، میاں دروازہ کے آگے لال بنگلہ کے پاس ہے، اُن کی طبیعت مامدی ہوئی، تب مرشد کامل کا دل بہلانے کے واسطے امیر خسرو یہ قفقہ ہمیشہ کہتے اور تیارواری میں حاضر رہتے، اللہ نے چند روز میں شفا دی، تب اُنہوں نے غسلِ صحت کے دن یہ دعا دی کہ جو کوئی اُس قفقہ کو سُنے گا خدا کے فضل سے تندرست رہیگا، جب سے یہ قفقہ فارسی میں ترویج ہوا۔ اب خداوند نعمت، صاحبِ مروت، نبیوں کے قدرواں جان گلکارِ اُسٹ صاحب نے کہ ہمیشہ اقبال اُن کا زیادہ ہے، جب ملک گنگا جمنابے، لطف سے فرمایا کہ اس قفقہ کو اردو زبان میں جو ہندوستان کے لوگ ہندو، مسلمان، عورت، مرد، لڑکے بالے خاص دعاء آپس میں بولتے چالتے ہیں ترجمہ کرو۔ موافق حکم حضور کے میں نے بھی اسی محاورہ سے لکھنا شروع کیا، جیسے کوئی باتیں کرتا ہے“

کن لوگوں کی زبان مستند ہے؟ آپ اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ:-  
”جو شخص دلی کار وڑا ہو کر رہا اور دس پانچ کشتیں اسی شہر میں گزریں، اور اُس نے دربارِ امراء کے دیکھے، اور میلے ٹھیلے، عرس، چھڑیاں، سیر و تماشہ اور کوچہ گردی اُس شہر کی ہوگی اور وہاں سے نکلنے کے بعد اپنی زبان کو کھاظ میں رکھا ہوگا، اُس کا بولنا اللبتہ ٹھیک ہے۔“

افسوس تقریباً ۶۰ سال کے بعد مرزا غالب اپنے ایک خط میں اہلِ دہلی کی زبان دانی کے متعلق میر ہمدی مجروح کو لکھتے ہیں:-

”اے میر ہمدی! تجھے شرم نہیں آتی۔ میاں یہ اہلِ دہلی کی زبان ہے، ارے

اب اہل دہلی بند وہیں۔ اہل حرفہ میں یاغی کی ہیں یا پنجابی یا گوسے ہیں، ان میں سے تو کس کی زبان کی تعریف کرتا ہے۔ لکھنؤ کی آبادی میں کچھ فرق نہیں آیا، ریاست تو جاتی رہی باقی ہر فن کے کامل لوگ موجود ہیں۔ ..... اللہ اللہ دہلی والے اب تک یہاں کی زبان کو اچھا کہے جاتے ہیں۔ واہ رے حسن اعتقاد۔ ارے بندہ خدا۔ اُرو و بازار نہ رہا، اُرو و کہاں دلی کہاں، واللہ اب شہر نہیں ہے، کمپ ہے، چھاؤنی ہے، نہ قلعہ نہ شہر نہ بازار نہ نہر.....“

بارغ و بہار میں سے ذیل کی عبارت بطور نمونہ نقل کی جاتی ہے:-

### سیر و سرے در ویش کی

”جب دوسرے در ویش کے کہنے کی باری آئی وہ دوزاں ہو بیٹھا اور بولا

اے مارو اس فقیر کا کچھ ماجرا سنو      میں ابتدا سے کہتا ہوں تا انتہا سنو  
جس کا علاج کر نہیں سکتا کوئی حکیم      ہو گا ہمارا در ویشٹ لا دو اسنو

اے ولی پوشو! یہ عاجز بادشاہ ہزارہ ملک فارس کا ہے، ہر فن کے آدمی وہاں پیدا ہوتے ہیں۔ چنانچہ اصغہان نصف جہان مشہور ہے بہت اعلیم میں اُس اقلیم کے برابر کوئی ولایت نہیں کہ وہاں کا ستارہ آفتاب ہے اور وہ ساتوں کو اکب میں نیزِ عظم ہے، آج وہاں کی خوش اور لوگ روشن طبع اور صاحبِ سلیقہ ہوتے ہیں، میرے قبلہ گاہ نے جو بادشاہ اُس ملک کے تھے، لڑکپن سے قاعدے اور قانونِ سلطنت کے مرتب کرنے کے واسطے بڑے بڑے دانا استاد، ہر ایک علم و کسب کے چکر، میری اما لینی کے واسطے مقرر کیے تھے تا تعلیم کامل ہر ایک نوع کی پاکر قابل ہوں، خدا کے فضل سے چودہ برس کے سن سال میں سب علم سے ماہر ہوا۔ گفتگو معقول، نشست و برخاست پسندیدہ اور جو کچھ بادشاہوں کو لائقِ درکار ہے سب حاصل کیا اور یہی شوقِ شب و روز تھا کہ قابلوں کی صحبت میں قفقہ ہر ایک ملک کے اور احوال و لوازم بادشاہوں اور نام آدموں کا سُنا کروں۔ ایک نہ

ایک مصاحب نے کہ خوب تو ایرج واں اور جہاں دیدہ ٹھانڈے کو رکھا کہ اگرچہ آدمی کی زندگی کا کچھ بھروسہ نہیں لیکن اکثر و صفت ایسے ہیں کہ ان کے سبب سے انسان کا نام قیامت تک بخوبی زیادتوں پر چلا جاویگا۔ میں نے کہا اگر تھوڑا سا احوال اُس کا مفصل بیان کرو تو میں بھی سُنوں اور اُس پر عمل کروں، تب وہ شخص حاتم طائیؓ کا ماجرا اس طرح سے بیان کرنے لگا۔

قصہ حاتم طائی کا

حاکم طائی۔ درست میں ایک بار شاہ عرب کا نوفل نام تھا۔ اُسکو حاکم کے ساتھ  
بسیب نام آدمی کے دشمنی کامل ہوئی۔ بہت سی فوج و لشکر جمع کر کے لڑائی کی خاطر چلا آیا  
حاکم تو خدا ترس اور نیک مرد تھا۔ یہ سمجھا کہ اگر میں بھی جنگ کی تیاری کروں، تو خدا کے بندے  
مارے جائینگے اور بڑی خونریزی ہوگی، اس کا عذاب میرے نام لکھا جائیگا۔ یہ سوچ کر تنہا  
اپنی جان لیکر ایک پہاڑ کی کھو میں چا چھا جب حاکم کے غائب ہونے کی خبر نوفل کو معلوم  
ہوئی، حاکم کا سب اسباب قرق کیا اور منادی کرادی کہ جو کوئی حاکم کو بچھڑلائے، پانسو  
اشرفی انعام پائے۔ یہ سنا کر سب کو لا لچ آیا اور جستجو حاکم طائی کی کرنے لگے، ایک روز ایک  
بڑھیا اور اُس کا بوڑھا، دو تین بچے ساتھ لیے ہوئے لکڑیاں توڑنے کے لیے اُس غار میں  
جہاں حاکم پوشیدہ تھا پہنچے، اور لکڑیاں چھننے لگے، بڑھیا بولی کہ اگر ہمارے دن بھلے آتے  
تو حاکم کو کہیں دیکھ پاتے اور اُسکو نوفل پاس لیجاتے، وہ پانسو اشرفیاں دیتا تو آرام سے  
کھاتے اور وہ دھندے سے چھوٹ جاتے۔ بوڑھے نے کہا کیا بڑ بڑ کرتی ہے، ہمارے طالبعلم  
میں یہی لکھا ہے کہ روز لکڑیاں توڑیں اور سر پر دھر کر بازار میں بیچیں، تب روٹی میسر آئے  
..... لے اپنا کام کر، حاکم ہمارے ہاتھ کا ہے کو ایسا کہ بادشاہ سے اتنے روپے دلا دیگا  
عورت ٹھنڈا سانس بھر کر چپ چورہی، ان دونوں کی باتیں حاکم نے سنیں، مردی اور مرد  
سے بعید جانا کہ آپ کو چھپائے اور جان کو بچائے، اور ان بیچاروں کو مطلب تک نہ پہنچاؤ

سچ ہے جس آدمی میں رحم نہیں وہ انسان نہیں قصائی ہے ۵

درود کے واسطے پیدا کیا انسان کو درہ طاعت کیلئے کچھ کم نہ تھے کہ تو بیاں  
غمنگہ حاتم نے قبول نہ کیا کہ اپنے کانوں سے سُکر چپکا ہو رہے۔ وہیں باہر آ کر بوڑھے سے کہا کہ  
اسے عزیز حاتم میں ہی ہوں مجھ کو نفل پاس لے چل، وہ مجھ کو دیکھ کر جو کچھ روپیہ دینے کا اقرار کیا  
ہے تجھے دیکھا، بدٹھے نے کہا سچ ہے۔ اس صورت میں بھلائی اور بہبودی میری البتہ ہے لیکن  
نہ معلوم وہ تیرے ساتھ کیا سلوک کرے۔ اگر مار ڈالے تو میں کیا کروں۔ یہ مجھ سے ہرگز نہ ہو گا کہ تجھ سے  
انسان کو اپنی خاطر جمع کے لیے دشمن کے حوالے کروں۔ وہ مال کتنے دن کھاؤنگا اور کتنے دن  
جیونگا۔ آخر مردوں کا تو خدا کو کیا جواب دوںگا۔ حاتم نے بہتری سنت کی کہ مجھے لے چل، میں غشی  
سے کہتا ہوں اور ہمیشہ اسی آرزو میں رہتا ہوں کہ میری جان و مال کسی کے کام آئے تو بہتر ہے  
لیکن وہ بوڑھا کسی طرح حاتم کو لیجانے پر راضی نہ ہوا، آخر ناچار ہو کر حاتم نے کہا کہ اگر تو مجھے  
نہیں لیجاتا تو میں خود ہی بادشاہ پاس جا کر کہتا ہوں کہ اس بوڑھے نے مجھ کو پہاڑ کی کھوپ چھپا رکھا تھا  
وہ بوڑھا ہنسنے لگا کہ اگر بھلائی کے بدلے بُرائی ملے تو یا نصیب۔ اس سوال و جواب میں اور آدمی  
بھی آگئے، اُنہوں نے معلوم کیا کہ حاتم یہی ہے، حاتم کو ترس پکڑ لیا اور لے چلے، وہ بوڑھا بھی فیس  
کرتا ہوا پیچھے پیچھے ہوا۔ جب نوفل کے پاس لے گئے تو اُس نے پوچھا کہ ان کو کون پکڑ لایا ہے  
ایک بد ذات بولا کہ یہ کام سوائے میرے اور کون کر سکتا ہے؟ یہ فتح ہاسے نام ہے اور ہم نے  
جھنڈا عرش پر گاڑا ہے، ایک نسترانی والا ڈینگ مار کر بولا کہ میں کئی دن سے دوڑھو پ  
کر کے جنگل سے پکڑ لایا ہوں، میری محنت پر نظر کیجیے۔ اسی طرح اشرفیوں کے لالچ سے ہر کوئی  
کہتا تھا کہ یہ کام مجھ سے ہوا، وہ بوڑھا چپکا کھڑا سب کی شیخیاں سن رہا تھا، اور حاتم کی خاطر  
کھڑا رہا تھا۔ جب اپنی اپنی مراد گئی سب بھجار چکے تو حاتم نے کہا کہ سچ بات یہ ہے کہ وہ بوڑھا  
جو سب سے الگ کھڑا ہے مجھے لایا ہے۔ اگر قیافہ سے جاننا چاہتے ہو تو دریافت کر لو اور مسیکر  
پکڑے جانے کی خاطر جو قول کیا ہے پورا کرو کہ سارے ڈیل میں زبان حلال ہے۔ مرد کو چاہیے کہ  
جو کہے سو کرے۔ یوں تو جیہ حیوان کو بھی خدا نے دی ہے، پھر انسان اور حیوان میں کیا تفاوت ہو

نوفل نے اُس بوڑھے کو پاس بلا کر پوچھا کہ سچ کہہ، اصل کیا ہے؟ حاتم کو کون پکڑ لایا ہے؟ اُس نے نام کہہ سنا یا اور کہا حاتم میری خاطر آپ ہی چلا آیا ہے نوفل، حاتم کی میت سُنکر متعجب ہوا کہ بل بے تیری سخاوت، اپنی جان کا خطر نہ کیا۔ جتنے لوگ جھوٹے دعوے حاتم کے پچڑ لانے کے کرتے تھے حکم دیا کہ ان کے پاسواشر فی کے عومن یا سوجتیاں ان کے سروں پر لگاؤ کہ ان کا میچا نکل پڑے، وہیں تڑ تڑ بیزاریں پڑنے لگیں، ایک دم میں اُن کے سر گنجے ہو گئے۔ سچ ہے جھوٹ بولنا ایسا ہی گناہ ہے کہ کوئی اُنکو نہیں پہنچ سکتا خدا سب کو اس بلا سے محفوظ رکھے اور جھوٹ بولنے کا چسکا نہ دے۔ بہت لوگ جھوٹ موٹ بکے جاتے ہیں لیکن آزمائش کے وقت سزا پاتے ہیں۔ غرض اُن سب کو موافق اُن کے انعام دیکھ نوفل نے اپنے دل میں خیال کیا کہ حاتم سے شخص سے فیض پہنچتا ہے اور محتاجوں کی خاطر اپنی جان تک سے دریغ نہیں کرتا اور خدا کی راہ میں سرتاپا حاضر ہے، دشمنی رکھنی اور اُس کا مدعی ہونا، آدمیت اور انسانیت سے بعید ہے، تواضع اور تعظیم کر کے پاس بٹھایا اور حاتم کا ملک و املاک اور مال و اسباب جو کچھ ضبط کیا تھا وہیں چھوڑ دیا، نئے سرے سرداری قبیلہ طے کی اُسے دی اور اُس بوڑھے کو پاسواشر فیال اپنے خزانہ سے دلوادیں، وہ دعائیں دیتا ہوا چلا گیا۔

جب یہ ماجرا حاتم کا میں نے سنا، جی میں غیرت آئی اور یہ خیال گزرا کہ حاتم اپنی قوم کا فقط رئیس تھا جس نے ایک سخاوت کے باعث یہ نام پیدا کیا کہ آج تک مشہور ہے۔ میں خدا کے حکم سے بادشاہ تمام ایران کا ہوں، اگر اس نعمت سے محروم رہوں تو بڑا افسوس ہے۔ دنیا میں داد و دہش سے بڑا کوئی کام نہیں۔ اس واسطے کہ آدمی جو کچھ دیتا ہے اسکا عومن عاقبت میں لیتا ہے، اگر کوئی ایک دانہ بوتا ہے تو اُس سے کتنا کچھ پیدا ہوتا ہے، یہ دل میں ٹھان کر میر عمار کو بلوا کر حکم دیا کہ ایک عالیشان عمارت جس کے چالیس دروازے بلند اور بہت کشادہ ہوں باہر شہر کے جلد بنوا کر اطلاع دے، تھوڑے عرصہ میں ویسی ہی وسیع عمارت، جیسا کہ دل چاہتا تھا

بکرتیا رہی اور اُس مکان میں ہر روز ہر وقت فجر سے شام تک محتاج اور بیکسوں کو روپیہ  
 اشرفیاں دیتا اور جو کوئی جس چیز کو چاہتا اُسے مالا مال کر دیتا۔ غرض چالیسوں دروازوں کا مجتہد  
 آئے اور جو چاہتے سولیا تے، ایک روز کا ذکر ہے کہ ایک فقیر نے سرائے کے دروازہ پر آکر سوال  
 کیا۔ میں نے اُسے ایک شرفی دی۔ پھر وہی دوسرے دروازہ پر آیا اور دو اشرفیاں مانگیں۔  
 میں نے پچانکر درگزر کی اور دیں، اسی طرح اُس نے ہر ایک دروازہ سے آتا اور ایک ایک شرفی  
 بڑھاتا شروع کیا اور میں بھی جان بوجھ کر انجان ہوا اور اُسکے سوال کے موافق دیا۔ آخر چالیسویں  
 دروازہ کی راہ سے آکر چالیس اشرفیاں مانگیں، وہ بھی میں نے دلوا دیں، اتنا کچھ لیکر وہ درویش  
 پھر پہلے دروازہ سے گھس آیا اور سوال کیا۔ مجھے بہت بُرا معلوم ہوا اور کہا اے لالچی تو کیسا  
 فقیر ہے کہ فقر کے تینوں حرفوں سے بالکل واقف نہیں، فقیر کا عمل اُن پر چاہیے۔ فقیر بولا  
 بھلا داتا نہیں بتاؤ میں نے کہا ف سے فاقہ، ق سے قناعت، ر سے ریاضت نکلتی  
 ہے، جس میں یہ باتیں نہیں وہ فقیر نہیں۔ اتنا جو تجھے ملا ہے اس کو کھاپی کر آؤ اور جو مانگے گا لیجاؤ  
 یہ خیرات احتیاج رفع کرنے کے لیے ہے نہ جمع کرنے کے لیے۔ اے حریص چالیس دروازوں  
 سے تو نے چالیس اشرفیاں تک لیں اس کا حساب تو کر کہ ریوڑی کے پھیر کی طرح کتنی اشرفیاں  
 ہوئیں اور اس پر بھی حرص تجھے پھر پہلے دروازہ سے لے آئی، اتنا مال جمع کر کے کیا کر گیا.....  
 اب جیادو شرم کر اور صبر و قناعت کو کام فرما..... فقیر میری باتوں کو سنکر خفا اور بدو ماغ  
 ہوا اور جتنا مجھ سے لیکر جمع کیا تھا زمین پر ڈال دیا اور بولا بس بابا اتنا گرم مست ہو، اپنی کاٹنا  
 رکھ چھوڑا اور پھر سخاوت کا نام نہ لیجو..... سخی کے بھی تین حوت ہیں پہلے اُن پر عمل کرو  
 تب سخی کھلاؤ گے۔..... سس سے سمائی اور سخ سے خوفِ الہی اور سخی سے یاد رکھنا اپنی  
 نکت کو

## مولوی شیخ حیفظ الدین احمد دہلوی

آپ دہلی کے ریڈنٹ کے منشی تھے، بعد میں فورٹ ولیم کالج میں ملازم ہو گئے۔  
 سنہ ۱۸۷۷ء میں آپ نے علامی ابو الفضل کی کتاب عیار دانش کا ترجمہ اردو میں کیا۔  
 اور خرد وافر و اس کا نام رکھا۔ (سن تالیف سنہ ۱۸۷۷ء) اصل کتاب سنکرت میں جو، اور  
 عربی میں کلیلہ و منہ کے نام سے مشہور ہے۔ فارسی میں اس کا ترجمہ انوار سیلی کے نام  
 سے شہرت پذیر ہوا ہے جو ملا حسین واعظ نے کیا ہے۔ اردو کا یہ ترجمہ اب نہیں ملتا  
 شاید فقیر محمد خاں گویا کے ترجمہ کے مقابلہ میں جو انہوں نے بہتان حکمت کے نام  
 سے کیا ہے یہ زیادہ عرصہ تک زندہ نہ رہ سکا۔ ہم نے اس زمانہ کے مصنفین و مؤلفین کی  
 ادنیٰ خدمت اردو بھی نظر احسان سے دیکھی ہے، اور یہی وجہ ہے کہ باوجود قلتِ حالات  
 و عدم موجودگی کتب اُن کے نام نامی کو زمرہ مصنفین اردو میں شامل کر دیا ہے اور اُن کا  
 ذکر خیر کرنا اپنے لیے موجب افتخار سمجھا ہے۔



## میر شیر علی افسوس

آپ میر مظفر خاں کے بیٹے تھے جو میر قاسم نواب بنگالہ کے داروغہ توپ خانہ تھے۔  
 آپ کا سلسلہ نسب امام جعفر صادق علیہ السلام پہنچتا ہے، میر مظفر خاں کا اصلی وطن نارنول  
 صوبہ آگرہ تھا مگر چونکہ وہ خود اور اُن کے بھائی سید غلام علی خاں نواب عمدۃ الملک میر خاں  
 کی رفاقت میں اوقات بسر کرتے رہے اس لیے دہلی میں توطن اختیار کر لیا تھا، اور میر  
 شیر علی دہلی ہی میں پیدا ہوئے۔ سید غلام علی خاں صاحب اقتدار تھے اور عارضی طور پر  
 عمدۃ الملک کی وفات کے بعد الہ آباد کے صوبہ بھی رہے۔ بھائی کی وفات کے بعد

سید ظفر خاں ترک ملازمت کر کے بارہ برس خانہ نشین رہے۔ انجام کار نواب خان عالم نواب بقادر اللہ خاں نے انہیں بلا کر نواب شجاع الدولہ کی سرکاری میں تین سو روپے کا ملازم کر دیا اُس زمانہ میں میر شیر علی کی عمر گیارہ برس کی تھی۔ اپنے والد کے ہمراہ لکھنؤ پہنچے، وہاں کی صحبتوں نے بچہ ہی میں شعر کا شوق پیدا کر دیا۔ میر حسد علی حیران دہلوی کو اپنا کلام دکھانے لگے، عربی اور علم حکمت کی تحصیل علما نہ تھی۔

آپ کے والد لکھنؤ پہنچ کر کئی برس بعد حزب الطلب نواب میر جعفر خاں مرشد آباد جا کر توجانہ کی واروٹگی کے منصب جلیلہ پر سرفراز ہوئے چنانچہ حبیب شجاع الدولہ اور میر قاسم کلر گلاشی کے مقابل صف آرا ہوئے تو یہ بھی اُن کے ہمراہ تھے۔ میر جعفر کی وفات کے بعد ملازمت ترک کر کے دکن چلے گئے اور وہیں انتقال کیا۔ میر افسوس خود ابتدا میں نواب سالار جنگ اور اُن کے لڑکے نوازش علی خاں کے پاس گیارہ برس تک رہے، پھر مرزا جواں بخت لویہد نے جو اُن دنوں میں لکھنؤ رونق افروز تھے کلام شکر از راہِ قدر دانی طلب فرمایا اور اپنے مصاحبوں میں داخل کر لیا۔ جب صاحب عالم کچھ عرصہ کے بعد دہلی جانے لگے تو یہ ہمراہ نہ جاسکے اور نواب سرفراز الدولہ حسن رضا خاں نائب آصف الدولہ کے پاس چلے آئے۔

چند سال بعد نواب موصوف الصدر نے ملازمت لڑی گورنر جنرل سے ان کی سفارش کی چنانچہ حسب الارشاد گورنر جنرل کلکتہ گئے اور ڈاکٹر کلکرا اسٹ کے ماتحت فورٹ ولیم کے مدرسہ میں اُردو کتابوں کی تصنیف اور تالیف کا سر رشتہ آپ کے سپرد ہوا۔ دو سو روپیہ ماہوار مشاہرہ مقرر ہوا۔ ۱۸۵۹ء میں اس عالم فانی سے عالم جاودانی کو جنت ہوئے۔ آپ سے دو کتابیں بارغ اُردو جو گلستاں کا ترجمہ ہے اور آرائش محفل حسن بن ہوشیار کے تاریخی حالات درج ہیں یادگار ہیں۔ آخر الذکر کتاب کا ماخذ سبحان رائے کی کتاب خلاصۃ التواریخ ہے۔ ۱۸۵۸ء میں آپ کلکتہ پہنچے تھے اور آپ نے ۱۸۵۸ء میں جدی کی گلستاں کا ترجمہ کیا تھا۔

آجکل دونوں کتابیں نایاب ہیں۔ راقم نے خواجہ غلام الثقلین مرحوم کے کتب خانہ میں گلستان کا ترجمہ (قلمی) دیکھا تھا، افسوس یہ وہ بھی دستیاب نہ ہوا جہاں تک خیال ہے افسوس نے فارسی اشعار کا ترجمہ بھی اردو اشعار میں کیا ہے، یہ نایاب اور قابل قدر ترجمہ اگر طبع ہو جائے تو بہت اچھا ہو، اتفاق سے خواجہ صاحب نے اپنے رسالہ عصر جدید نومبر ۱۹۷۱ء میں خود اس کتاب کا ذکر کیا ہے اور اس کا دیباچہ نقل کیا ہے۔ لہذا عصر جدید سے دیباچہ نقل کرتا ہوں اور دیباچے سے پہلے دو حکایتوں کا ترجمہ بھی جو رسالہ مذکور میں درج ہے بطور نمونہ پیش کرتا ہوں۔

### ترجمہ شیر علی افسوس

ایک بزرگ نے کسی پرہیزگار سے پوچھا کہ فلا نے عابد کے حق میں آپ کیا کہتے ہیں کہ اکثر اشخاص اُس کے حق میں طعنہ آمیز باتیں کہتے ہیں۔ کہا اُس نے کہ نظار اسمیں کچھ عیب نہیں دیکھتا اور باطن سے آگاہ اللہ ہے۔

جب کو ظاہر میں تھی دیکھے اُس کے تقویٰ کا تونہ کرنا کار کسجی مت کر کیسے باطن کی محبت دن خانہ چہ کا

### (ترجمہ) آٹھویں حکایت

ایک بزرگ کے تئیں کسی مجلس میں اکثر شخص سراہتے تھے اور اُس کے وصفوں کی خوبی میں مبالغہ نہایت کرتے تھے، اُس نے سر اٹھایا

اور فرمایا۔ اے عزیزاں میں جیسا کہ ہوں

اپنے تئیں بھجانتا ہوں۔ شعر

### باب دوم (حکایت گلستان)

یکے از بزرگاں پارسائے را گفت کہ چہ گوئی در حق فلاں عابد کہ دیگر اں در حق او بطعنہ سخنا گفت۔ اند۔ گفت بر ظاہرش عیب نمی بینم و در باطنش عیب نمی دانم۔ پس بر او طعنہ چگونہ کہ نم۔ ہر کسے را کہ پارسا بینی پارسا دامن عیلم دانگا و زندانی کہ در نہانش نیست محبت در دن خانہ چہ کا

### باب دوم (حکایت ہشتم)

بزرگے را در محفلے ہی ستودند و در اوصاف جمیلش مبالغہ می نمودند۔ سر بر آورد و گفت

من آنم کہ من دانم۔

شعر

کیفیت اذی یا من تعدّ تحاسنی  
علی نیقی هذا لعدد رباطینی

قطعہ

شخصم خشم عالمیاں خوب نظر است  
وز خبیث باطم سر غلبت نہادہ پیش

طاؤس را بنفش نگاہے کہ بہت غلق  
تحمین کنند او بخل از پائے زشت لیش

دیکھ غلام ہمدرد کی آہیں تہا رافص کیا  
حال باطن کا مرے مطلق نہیں تیر کھلا

قطعہ

ظاہر لگے ہے خوب مرا جسم خلق کو  
باطن دے نجس جو ہر جھلّس سے منفعل

نقش و نگار مور کے سب ہیں سراپتے  
زشتی سے اپنے پاؤں کی لکین وہ ہے نخل

پہلا دیباچہ تعریف میں لا اوصاحب کی اور احوال مترجم کا اور بعضے غدر و خیانت کے

نہالِ حمد پہلے اُس میں بو تو رہے سر سبز جنتِ باغ اُردو

لگا پھر نعت کا اے دستِ پودا کہ تا محشر رہے یہ باغ پھولا

پھر اُس کے بعد نخلِ منقبت کو لگا رونق جو اُس کی بیشتر ہو

تازگی گلستانِ سخن کی حمد باغبانِ جنتی کی ہے کہ اُس نے بوستانِ عالم کو طح طرح  
کے درختوں سے آرائش دی اور رنگِ بزمگ کے پھولوں سے زینت بخشی اور اُس کے

ابرِ رحمت کی بارش سے ہر ایک گلِ تر و تازہ نسیمِ فیض سے اُس کے ہر ایک درخت ہر بھرا  
ہر گل کی زبان واسے اُس کے ذکر میں جو غنچہ ہے سو عجیب ہے اُسی کے فکر میں، قمری

اُسی کے طوقِ بندگی میں اسیر، تدرو اُسی کے بندِ عشق سے پایہ زنجیر، شربتِ شوق سے  
اُسی کے گلہائے چمن سیراب گلستاں میں، اور اُسی کی گرمیِ محبت سے ہر ایک خارِ خشک لب

ہے بیاہاں میں، فاختہ خاکسری لباس سے اُگی طلب میں کو کو کُنّاں، چنار اُسی کے سوزِ عشق  
سے گلشنِ دہریں سوزاں

جوابِ برکرم اُس کا برے ذرا تو ہر خارِ صحرا ہو گلبرگ سا

بعد اس حمد و نعت کے عاصی شیر علی ابن سید علی مظفر خاں بن میر غلام مصطفیٰ مرحوم  
 و معذور متخلص بہ افسوس کہتا ہے۔ اصل اس حقیر کی ملک قاف ہے اور قوم سادات، لیکن  
 آباؤ اجداد جو ہندوستان میں آئے اور توطن انہوں نے اپنا قصبہ نارنول میں کیا اس سبب  
 نارنولی مشہور ہوئے مگر مجدد پدرا کے عہد میں بادشاہ محمد شاہ فردوس آگاہہ کشا پھانلی باد  
 میں وارد ہوئے اور رفاقت نواب عمدۃ الملک امیر خاں جنت مسکاں کی اختیار کی۔ چنانچہ  
 کمال ثروت اُن کو اُس سرکار میں ہوئی۔ تب اُنہوں نے استقامت اور سکونت شہر مذکور  
 میں کی اور اُس کا مولد نیا شہر ہے۔ بعد برہم ہونے سلطنت کے اور وفات نواب صاحب  
 معذور کے، ایک مدت مدید والد مرحوم خانہ نشین رہے۔ آخر دلی چھوڑا اور روزگار بنگالے  
 کے صوبہ داروں کا کیا، اُن میں فقیر کا بس گیارہ برس کا تھا گلستاں پڑھتا تھا اور سیر  
 دیوان دلی کی اکثر کرتا۔ طبیعت موزوں اُن ایام میں بھی تھی چنانچہ کئی شعرا و قات مذکور ہیں  
 بوضع قدامکے تھے، یہ مطلع بھی اُنہی میں سے ہے۔ بیت

ارے پیارے ترے اُس حُسنِ رنگیں کا خدا حافظ

تری اس زلف پر چیں کا محمد مصطفیٰ حافظ

قصۂ کوتاہ والد ماجد نواب جعفر علی خاں بہادر مرحوم کے واقعہ تک بھی عظیم آباد میں  
 تھے۔ بعد اس سانحے کے لکھنؤ میں آئے اور فقیر اُن سے دو برس پہلے یہاں آچکا تھا۔ آخر  
 وہ توحید آباد تشریف لے گئے اور بعد چند روز کے وہیں بقعائے الہی بہشت نصیب ہوئے  
 لیکن میں نے بود و باش اپنی بیس پٹھرائی اور ابتداء سے جوانی سے سرکاری نواب لاہنگ  
 بہادر مرحوم کے پرورش پائی ملک جب تک مرشد زادہ آفاق صاحب عالم جہاندار شاہ جنت

آرامگاہ رونق افزائے لکھنؤ کے رہے اُسی سرکار میں بعدہ مصاحبت سرفراز تھا۔ اُن دنوں بھی فکر سخن بھی لیکن تحصیل عربیہ میں نہایت مصروف تھا۔ مشق سخن اس خام طبع کی اہل سخن کے نزدیک پختگی کو پہنچانے کی جتنی اور دیوان بھی قریب ہو چکا تھا، چنانچہ کلام اس مچھران کا مرشد زادہ آفاق کو نہایت پسند آیا اور خواصانِ حضور میں بعدہ شاعری سرفراز فرمایا۔

سبب اُن کی قدردانی کے پھر بسا اوقات بندہ فکر سخن ہی میں رہتا تھا۔ غرض جب اُنہوں نے رحلت فرمائی تب میں نے شعر و سخن ترک کیا بلکہ شاعرے کی صحبت میں آنا جانا بھی چھوڑ دیا مگر درس و تدریس سے سر و کار تھا اور سب کاموں سے بیکار۔ خرچ روزمرہ نواب سرفراز الدولہ حسن رضا خاں بہادر کی بدولت جو کچھ کہ مقدور تھا پہنچے جاتا تھا اور تکلیف نوکری کی کچھ نہ تھی۔ غرض اُس بزرگ کے اخلاق اور خوبیوں کے بیان سے زبان قاصر ہے۔ خدا اُسکو جزائے خیر دیوے اور جنت المادئی میں درجۂ اعلیٰ عطا کرے کہ تائیسویں تاریخ روز جمعہ کو وہی سترہویں ماہ اکتوبر کی تھی سن ہجری بارہ سے پندرہ تھی اور شاہ صاحب جلیل القدر کرنل لاسکات بہادر نے مجھے بلوایا اور کلام میرا سنا۔ پھر الطاف نواز شہ سے فرمایا کہ تو سرکار کپہنی دام دولہتم کے ملازموں میں اسی تاریخ سے سرفراز ہوا۔ بدل جمعی عام کلکتہ کو روانہ ہو کہ صاحب عالی شان دام ظلہم بنان اُردو کا محاورہ اور صحت دریافت کیا جاتے ہیں۔ بنا براس کے تجھے طلب کیا ہے۔ یہ بھیچاں اگرچہ لیاقت موافق اساتذہ سابق کے نہ رکھتا تھا اور اس فن سے بھی دل برداشتہ تھا۔ قدردان جو اُس بزرگ کو دیکھا اور صاحبوں کو جو ہر شناس سمجھا۔ فی الواقع قدردان اہل فن اور عزت بخش صاحبانِ سخن ان سے بہتر کوئی نہیں اور ان کی سرکارِ مجمع علماء و طلباء ہے۔

عازم اُس ملک کا ہوا اور آب و دانہ یہاں لے آیا۔ غرض صاحبانِ ذوی الاحترام کی قدردانی جیسی تھی اُس سے دو چند کیجی۔ واقعی ملک میں اُنہی کے سبب اس بھیچاں کی اس قدر عزت ہوئی اور اُس کے کلام نے اس قدر رونق پکڑی ورنہ کیس قطاریں اور اس کا کلام کس شمار میں لیکن تعلق میراجو مدرسہ ہندی سے ہوا۔ بنا براس کے بسا اوقات خدمت میں صاحب عالی

طبیعت والا فطنت مدرس بہتری مسٹر جان گلکراٹ صاحب دام نرودتہ کے کہ جامع قوانین اس زبان کے ہیں حاضر ہونے لگا۔ ایک دن صاحب موصوف نے مہربانی سے فرمایا کہ گلستان سعدی شیرازی کا زبان اردو میں ترجمہ کریں نے دھیان کیا کہ عبارت اُس کی بغا ہر صفت و باطن پیچیدہ ہے۔ علاوہ اس کے عبارت کا اختلاف بے شمار ہے اور رتبہ اپنی قوت تالیف کا اور شیخ مرحوم کی تصنیف کا جو خیال کیا تو کسی طرح کی نسبت نہ پائی۔ مصرع

چہ نسبت خاک را با عالم پاک

ارادہ کیا کہ اس سے پہلو تہی کروں اور سرِ بحر آگے دھروں۔ پھر دل میں سوچ آیا کہ مبادا حاشائے خیال میں اُن کے گزرے کہ اس نے ہمارا کہنا نہ مانا اور اس بات کو سہل جانا تب قصد کیا کہ ایک حکایت طولانی کہ نظم و نثر اُس میں کثرت سے ہو اُسے ترجمہ کروں۔ اگر بخوبی سرا انجام ہوئی اور اہل معانی کی پسند پڑی تو فہما۔ والا صاحب ممدوح سے اس امر کی معافی چاہو گل چنانچہ قاضی ہمدان کی حکایت کا ترجمہ کیا اور وہ علما و شعرا کہ یہاں تھے اُن کے پسند پڑا تب اس ضعیف نے کمرِ محنت بقوت باندھی، در سعی ملین کی۔ بارے فضل ایزدی اور لطفِ سرمدی سے نام کتاب زبان اردو میں لکھی اور وہ مقبول خاص و عام ہوئی۔ نام اُس کا بارخ اردو رکھا چنانچہ اُس کی شروع کی تاریخ بھی اسی میں سے نکلتی ہے۔ قطعاً

میں تاریخ اُس کی جو جامع نام کہوں کھول دل جب بآئین نکو  
کہ اس میں بالقت غیبی یہ بولا ہے آغازِ اردو

دوسری شے میں دوسرا مصرع ”کہوں ل کھول بآئین نکو“ اور چوتھا مصرع ”کہ ہے آغازِ اردو“ پڑھنا چاہئے تاکہ ایک بحر میں قطعہ ہو جائے۔ آغازِ اردو سے ۱۳۱۷ء تا ۱۳۱۸ء تمام اور ”بارخ“ اور ”تاریخ آغازِ سنہ ۱۳۱۷ء“ لکھی ہے لیکن فی الحقیقت یہ کتاب جب مقبول ہوگی جو حضورِ امیر والا تدبیر، عادل بے نظیر پشت پناہ کھنڈ مہتر غریب پرور، قدرا فرماے علما و شعرا، راحت رسانِ سینہ ریشاں، چارہ سازِ بچارگان و درویشاں، بانی مدرسہ علم و فضل، ماحی بنیادِ ظلم و جہنم۔

## مثنوی

حمایت اگر اُس کی پشتہ بھی پائے تو ہاتھی کو ہرگز نہ حت طر میں لگا  
جو ابر کرم اُس کا برستے رُز تو ہر ایک گدالیوں میں اُس کو بھر  
بیاں کیا کروں دانش و عقل کو فلاطون بھی اُس سے تسلیم ہو  
سخاوت شجاعت کرامت کرم عیاں اُس میں ہیں سب بوجہ اتم  
زبدہ نوبان عالی شان، شیر خاص شاہ کیواں بارگاہِ انحطاط مار کو اُس مزی گور جنرل  
بہادر دام اقبال کے قبول ہوئی۔ بیست

پسند آئی اُس کو جو اس کی بنا رہے تازگی اسکی لیل و نہار  
اگرچہ اس باغ کے گل اور پھول بے مقدار ہیں اور کمتر از خالینکین توقع اُس ابر کرم سے  
یہ ہے کہ متوجہ اس پر ہو دے اور اپنے تفضلات کی بارش سے شاداب کرے کہ مہنہ ہر چنگ  
برستہ گل و خار اُس کے فیض سے کوئی محروم نہیں رہتا۔ شہر  
کرم سے ہوں تیرے یہ امیدار نظر مہر کی اُس پر ہوا ایک بار

یہ کئی سطر میں عذروں میں ہیں۔ اربابِ فطنت و صاحبانِ طبیعت پر ظاہر ہو دے کہ فقیر نے  
اُس کی نظم و شعر کا مطلب مع عربی موافق اپنے مقدور کے نہیں چھوڑا مگر یادہ کمی کیس کہیں ہے  
اور حسن نظم و شعر میں اختلاف نسخ دیکھا ہے یا اختلاف معانی، بعضے جاتو ہر ایک کا ترجمہ کیا  
اور بعضے مقام میں جس کی ترجیح اپنے نزدیک ٹھہری ہے اُس کا کیا ہے اور مرجع کو ترک کسی  
مقام میں ہو ہو کر نے میں آیا ہے کہ محاورے سے اندکے تفاوت ہو گیا ہے، پر اکثر رعایت  
محاورے ہی کی منظور رہی ہے۔ سبب اس کا اہل سخن اور صاحبانِ فہم پر اندکے تامل میں کھلیاؤ  
اور چند موضع میں لفظ تو کہ فارسی ہے یا یائے خطاب جیسے گفتی سفتی میں ہے معروف  
کیا گیا۔ اگرچہ صاحبانِ اُردو گفتگو میں بیچ اول موضوعوں کے اُسکونیں بولتے بلکہ تعظیماً لفظ  
استعمال کرتے ہیں۔ بنا بر اسکے کہ کتاب اور اشعار میں ہے۔ چنانچہ اکثر کلام شعراء کا قصائد

مدح میں اسی پر شاہد ہے۔ یہ سمجھان نہیں کہنا کہ کلام میں میرے کہیں غلطی نہیں ہے یا کوئی اس کتاب کے مطالب رینجے کی زبان میں بیان نہ کر سکے گا۔ لکن اتنا البتہ کہ یہ خالی مطالب سے نہیں ہے اور جو کوئی ایسا ارادہ کرے گا تو قدر اس بے مقدار کی جانے گا۔ اہل امید اہل نظر سے یہ ہے اگر کہیں کہیں قیام اس میں دیکھیں تو اُن کو داہن کرم سے چھپا دیں اور زبان پر نہ لادیں کہ انسان کا کلام ممکن نہیں جو بے عیب ہو خصوصاً مجھ سے ناقص کا کہ اپنے کمال کو بھی نقصان جانتا ہوں اور جس کا معقول ہو مانتا ہوں۔ غرض دشمنوں کی آنکھوں میں یہ خار ہے اور دوستوں کی نظروں میں گلزار۔

### مثنوی

|                             |                                |
|-----------------------------|--------------------------------|
| رہے گا سدا گل میں یہ بوستان | ثبات اپنا لیکن ہمیشہ کہاں      |
| بقا نفس کا غد کو ہے سالما   | اور انساں کے نقشہ کو ہر دم فنا |
| مصنف مؤلف کو کب ہو قیام     | نشاں اُن کا رہتا ہو بس اک کلام |
| یہ ہے طالبوں سے مجھے التجا  | کریں میرے حق میں وہ اتنی دعا   |
| بعشرت کروں بارغ دنیا کی سیر | ہو آخر مری عاقبت بھی بخیر      |
| شکر ہے لا انتہا اللہ کا     | ختم کس خوبی سے دیا چہ ہوا      |



## سید انشا اللہ خاں انشا

حبیب نسب اور پیدائش سید انشا اللہ خاں حکیم ماشاء اللہ خاں کے بیٹے تھے۔ ان کے بزرگ ہندوستان میں نجف اشرف سے آئے تھے اور بعض کہتے ہیں کہ خطہ کشمیر کے سادات صحیح نسب سے ہیں۔ وہاں کی زمانہ میں سمرقند سے آئے تھے۔ پھر دلی میں آکر سکونت اختیار کی۔ رفتہ رفتہ امرائے شاہی میں داخل ہوئے اور بعض اُن میں طبلہ

نقارہ سے بلند آوازہ ہوئے۔ میرا شاہ اللہ خاں دربار شاہی میں طبیب تھے اور زمرہ امرا میں داخل تھے۔ ان کے خاندان کی خوبیوں اور گھر کے چال چلن کو دلی اور لکھنؤ کے شرفاسپ مانتے تھے سلطنت مغلیہ کے ضعف کی وجہ سے میرا شاہ اللہ خاں کو مرشد آباد جانا پڑا۔ وہاں بھی اعزاز و اکرام سے رہے اور سیدانشاہ میں پیدا ہوئے۔

**تعلیم اور شاعری** جس طرح اگلے وقتوں میں خاندانی امیر زادوں کی تعلیم ہوتی تھی اسی طرح سیدانشاہ کو بھی علوم مروجہ سے ماہر کیا گیا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ سیدانشاہ

نہایت طبیب اور عالی دماغ آدمی تھے۔ ان کی طبیعت ایک ہیو لی تھی کہ ہر قسم کی صورت پر کڑھ سکتی تھی۔ باوجود اسکے شوخی اس قدر کہ سیاب کی طرح ایک جا قرار نہ تھا۔ حالانکہ طبابت پیشہ آبائی تھا، اُسے چھوڑ کر شاعری کی طرف توجہ کی اور مرشد آباد سے دلی میں آئے۔ اس وقت دلی کا دربار ایک ٹوٹی پھوٹی درگاہ اور اُسکے سجادہ نشین شاہ عالم بادشاہ تھے۔ سیدانشاہ اہل دربار میں داخل ہوئے اور یہ عالم ہوا کہ شاہ عالم کو ایک دم ان کی جذباتی ناگوار ہو گئی۔ کچھ عرصہ تک بادشاہ کی خدمت میں حاضر رہے، آخر دلی سے دل آچاٹ ہوا اور آصف اللہ کی سخاوتوں نے اُنہیں لکھنؤ پہنچ بلایا۔ جاتے ہی علم و فضل کے زور اور کمال کے شور سے تو بچانے لگا دیئے کہ تمام شاعرے گونج اٹھیں۔ چندے مرزا سلیمان شکوہ کی خدمت میں رہے جو شاہ عالم کے بیٹے تھے اور لکھنؤ میں رہتے تھے۔ آخر علامہ تھانیہ فضل حسین خاں کی وساطت سے نواب سعادت علی خاں کے مصاحب خاص ہو گئے جو اُس وقت اودھ کے محتار تھے۔ یہاں بھی ملازمت ہوتے ہی سیدانشاہ ایسے شیر و شکر ہو گئے کہ پھر نواب کو ان کے سوا کسی کی بات میں مزاحیہ نہ آتا تھا۔ سیدانشاہ کے سپرد کوئی خاص خدمت نہ تھی۔ مگر دربار واری کے ساتھ ہر دم کی مصاحبت تھی۔ اس زمانہ میں انہوں نے عامۃً خلایق خصوصاً

لہذا کہن میں طالب علمی کرتے تھے مگر ساتھ ہی کانے کا بھی شوق تھا۔ کافہ حفظ کرتے تھے اور تار پر بجاتے تھے کہ الکلمۃ لفظاً کلمۃ لفظاً۔ وضع لمعنی مفرداً ۛ مفرداً ۛ ۛ۔ یہ حالت آبیات سے ماخوذ ہیں۔

اہل کمال اور اہل عائدان کی کار بر آری سے نیکی اور نیکنامی کی دولت کمائی۔ ہزاروں کو مراتب اعلیٰ پر پہنچا دیا مگر آپ شاعری رہے، آخر اسی مصاحبت سے ہنسی ہنسی میں مخالفت پیدا ہو گئی جس کا انجام یہ ہوا کہ وہ چکھتا ہوا بلبل اپنے گھر کے پھرے میں بند کیا گیا اور وہاں سے اس گمنامی کے ساتھ پیوند زمین ہوا کہ کسی کو خبر نہ ہوئی۔ بدست سنگھ نشاط کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۲۳۳ھ میں فوت ہوئے۔

خبر انتقال میر انشا      دلِ غمیدہ تانشاط شغفت  
سالِ تاریخ اوز جانِ اہل      عری وقت بود انشا گفست

۱۲۳۰ = ۱۲۳۳ھ

**تصانیف** تصانیف جو سیلہ نشا سے یادگار ہیں حسبِ ذیل ہیں :-

(۱) کلیاتِ انشا جس میں کلام ذیل شامل ہے :- (۱) اُردو کا دیوان (۲) دیوانِ ریختی (۳) قصائد (جس میں ایک قصیدہ منقبت بے نقط و اشعار ترکی وغیرہ بھی درج ہیں) (۴) دیوانِ فارسی (۵) مثنوی شیردینج فارسی (۶) مثنوی بے نقط (لوحِ سُرخ بھی بے نقط و موزوں) (۷) مثنوی شکارنامہ (۸) مثنویات درجِ زبور کھٹل، پشہ بگس (۹) مثنوی شکایتِ زمانہ (۱۰) مثنوی فیل (۱۱) مثنوی درجِ گنچہ سا ہو کار (۱۲) اشعار متفرقہ رباعیات و قطعات و تاریخ نامے متفرقہ (۱۳) چہستانیں اور پہیلیاں مخمس و حقیرہ (۱۴) دیوانِ اُردو بے نقط مع رباعیات و شعر بے نقط (۱۵) شرح مائتہ عامل نظم فارسی (۱۶) مثنوی مرغِ نامہ (۲) ایک داستان جو نثر اُردو میں ایسی لکھی ہے کہ ایک لفظ بھی عربی فارسی کا نہیں لے دیا باوجود اس کے اُردو کے رتبہ سے کلام نہیں گرا۔ ہاں وہی چوچلے اور وہی ٹھپلس اس میں بھی چلی جاتی ہیں جو اُن کے کلام کا خاصہ ہے حقیقاً ظرافت اُن کی طبیعتِ ثانیہ ہو گئی ہے۔ یہ کتاب مقداریں پچاس صفحہ کی ہوگی۔ عبارت ذیل نمونہ کے طور پر درج کی جاتی ہے :-

”اب یہاں سے کہنے والا یوں کہتا ہے۔ ایک دن بیٹھے بیٹھے یہ بات اپنے دھیانِ حُشی

کوئی کہانی ایسی کہیے، جس میں ہندی چھٹ اور کسی بولی کی ٹپٹ نہ ملے۔ باہر کی بولی اور گنواہری کچھ اُس کے بیچ میں نہو۔ تب میرا جی بھول کر کلی کے روپ کھلے۔ اپنے ملنے والوں میں سے ایک کوئی بڑے بڑے سکے، پڑانے دھرانے ٹھاگ بڑے ڈھاگ یہ کھٹر لگ لگے، سر ہلا کر منہ تہا کر، ناک بھوں چڑھا کر، گلا پھلا کر، لال لال آنکھیں تپھر کر کہنے لگے ”یہ بات ہوتی دکھائی نہیں دیتی، ہندی وی پن بھی نہ نیکلے اور بھا کا پن بھی نہ ٹھس جائے۔ جیسے بھلے مانس اچھوں سے اچھے لوگ آپس میں بولتے چالتے ہیں، جوں کا توں وہی سب ڈول ہے اور چھاؤں کسی کی بڑے یہ نہیں ہونے کا“ میں نے اُن کی ٹھنڈی سانس کی پھانس کا تھوکا کھاکر ٹھجھلا کر کہا میں کچھ ایسا بڑ بولا نہیں جو رانی کو پرست کر دکھاؤں اور جھوٹ سچ بولکر انگلیاں پچاؤں اور بے سُرّی بڑھکا کی اُکھی علی بھی تانیں لیے جاؤں۔ مجھ سے نہ ہو سکتا تو بھلا منہ سے کیوں نکالتا جس ڈھب سے ہوتا اس کعبیڑے کو ٹالتا۔ اب اس کہانی کا کہنے والا یہاں آپ کو جاتا ہے۔ اور جیسا کچھ اُسے لوگ پکارتے ہیں کہہ سُننا تا ہے، اپنا ہاتھ منہ پر پھیر کر مچھوں کو تاؤ دیتا ہوں اور آپ کو جاتا ہوں، جو میرے داتا نے جاہا تو وہ تاؤ بھاؤ اور زوا چھاؤ اور کوڈ بھانڈا اور لپٹ جھپٹ دکھاؤں آپ کے دھیان کا گھوڑا جو بجلی سے بھی بہت پچھل اچلا ہٹ میں ہے دیکھتے ہی ہرن کے روپ اپنی چوکرٹی بھول جائے۔ چومکا۔

گھوڑے پر اپنے چڑھکے آتا ہوں میں      کرتب جو جو ہیں سب دکھاتا ہوں میں  
اُس چاہنے والے نے جو چاہا تو ابھی      کہتا جو کچھ ہوں کر دکھاتا ہوں میں

عبارت متذکرہ بالا سے سید انشا کا کمال ظاہر ہے، آج کوئی شخص ایسا ایک صفحہ بھی نہیں لکھ سکتا۔ اور سید انشا نے جب قلم اٹھایا تو اُس زمانے میں تمام عادات و اطوار اور زبان پر فارسی احاطہ کیے ہوئے تھی، دفتری زبان فارسی تھی، خط و کتابت فارسی میں ہوتی تھی، طلبہ فارسی پڑھتے تھے، اُردو نشر کا کوئی نام بھی نہ لیتا تھا۔

(۳) دریا لطافت۔ اس میں اُردو صرف و نحو، منطق، عروض و قافیہ، معانی و دبیان

وغیرہ کا ذکر ہے۔ پہلا حصہ یعنی اُردو صرف و نحو سید انشا اللہ کی تصنیف ہے اور دوسرا حصہ یعنی منطق، عروض و قافیہ و معانی و بیان مرزا محمد حسن قلیل کا تالیف کیا ہوا ہے، کتاب کی جان پہلا ہی حصہ ہے۔ یہ پہلی کتاب ہے جو ایک ہندی اہل زبان نے اُردو صرف و نحو پر لکھی ہے اور حق یہ ہے کہ عجیب جامع و بے مثل کتاب ہے۔ بقول مولوی عبدالحق ”جو لوگ اُردو زبان کا محققانہ مطالعہ کرنا چاہتے ہیں یا اُسکی صرف و نحو یا لغت پر کوئی محققانہ تالیف کرنا چاہتے ہیں اُن کے لیے اس کا مطالعہ ضروری ہی نہیں بلکہ ناگزیر ہے“

سید انشا نے عربی فارسی زبان کا متبع چھوڑ کر اُردو زبان کی ہیئت و اصلیت پر غور کیا اور اُس کے قواعد وضع کیے۔ اگرچہ اپنے اظہار خیال کے لیے فارسی کا ذریعہ اختیار کیا ہے لیکن تصنیف بوجہ اصل مضمون فارسی نہیں کہلائی جاسکتی سید انشا نے یہ کتاب لکھ کر اُردو زبان پر بہت بڑا احسان کیا ہے اور جبکہ اُنکے زمانے میں اُن کے ہم عصر فضول تقہ کہانیوں کی تصنیف میں مشغول تھے۔ سید صاحب کا ایک کام کی بات پر قلم اُٹھانا اور بھی قابلِ شکر یہ اور لائقِ فخر ہے۔

|                |                                                                                                                                                                                  |
|----------------|----------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------|
| الفاظ کی فصاحت | سید انشا کے اعلیٰ دماغ اور ذوقِ زبان کا صحیح اندازہ اُن کی اُس رائے سے ہوتا ہے جو انہوں نے الفاظ کی فصاحت و غیر فصاحت اور صحت و غیر صحت کے متعلق حسبِ ذیل الفاظ میں ظاہر کی ہے:- |
|----------------|----------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------|

”ہر لفظ جو اُردو میں مشہور ہو گیا، عربی ہو یا فارسی، ترکی ہو یا سریانی، پنجابی ہو یا پولی از دے اصل غلط ہو یا صحیح وہ لفظ اُردو کا لفظ ہے۔ اگر اصل کے موافق استعمال ہے تو بھی صحیح ہے اور اگر خلافِ اصل استعمال ہے تو بھی صحیح ہے، اُسکی صحت و غلطی اُردو کے استعمال پر موقوف ہے، کیونکہ جو کچھ خلافِ اُردو ہے غلط ہے، گو اصل میں وہ صحیح ہو اور جو کچھ موافق اُردو ہے صحیح ہے، گو اصل میں صحت نہ رکھتا ہو“

مثال کے طور پر سید موصوف نے بہت سے عربی الفاظ کو جو اُردو میں کچھ کے کچھ ہو گئے ہیں صحیح

بتلایا ہے۔ مثلاً برقا اُردو کا صحیح لفظ ہے اگرچہ خلاف اصل ہے یا قدر اگرچہ اصل میں بکون وال ہے لیکن بفتح وال اُردو کا صحیح لفظ ہے۔

دریائے لطافت کے پہلے باب میں حروفِ ابجد کا ذکر ہے اور اُن کی تعداد کے تعین میں بھی سید انشانے جدت طرازی کی ہے۔ اس تقسیم کے بعد انہوں نے اُن حروف کو لیا ہے جو کسی خاص حرف سے ملکر ایک آواز پیدا کرتے ہیں مثلاً سترہ حرف ایسے ہیں جو لا کے ساتھ ملکر ایک آواز پیدا کرتے ہیں جیسے بھاگنا، پننا وغیرہ۔ یہ حروف اب کیس اُردو قاعدوں میں بڑھائے گئے ہیں حالانکہ سید انشانہ توں پہلے لکھ چکے ہیں۔

سترہ حروف ایسے ظاہر کیے ہیں جو فون کے ساتھ ملکر ایک آواز پیدا کرتے ہیں، مثلاً پنڈول، رنگیلا، ہنسا وغیرہ۔ اب تک ان حروف کو اُردو قاعدوں میں نہیں دکھایا گیا اسی طرح بعض حروف ایسے ہیں جو حی کے ساتھ ملکر ایک ہو جاتے ہیں مثلاً کیا (حرفِ استغمام) دھیان، پیارا وغیرہ۔ الفصہ سید انشانے اُردو حروفِ تہجی کی کل تعداد پچاسی بتائی ہے۔

دوسرے باب میں دہلی کے محلوں کی زبان کے متعلق بہت دلچسپ بحث کی ہے اور یہ دکھلایا ہے کہ کس کس محلہ کی زبان فصیح اور کس کس محلہ کی زبان غیر فصیح ہے اور اُنکی وجوہ بھی دی ہیں۔ مثلاً مغلوں (اہل مغلیہ پورہ) سادات بارہہ، پنجابیوں، پُربوں کی زبان کیسی اُردو اُن کی وجہ سے الفاظ کے تلفظ اور لہجہ اور زبان میں کیا فرق پیدا ہوا ہے، یہ سب امور تفصیل اور مثالوں کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں۔

تیسرے باب میں بعض فصحا کا ذکر ہے، اور بعض ایسے الفاظ کا بیان کیا گیا ہے جو اُردو نہیں یا متروک ہیں اور میر تقی یا مرزا رفیع السودانے اُن کو استعمال کیا ہے۔ اسی باب میں نواب عماد الملک، بھارٹل، مرزا صدر الدین صفابانی اور ملا عبد الفرقان کی نہایت دلچسپ تقریریں ہیں اور بی نورن اور میر غفر غنی کی تقریریں خصوصاً نہایت پر لطف ہیں، اپنی شوخی مزاح کو

نہایت عمدہ پیرایہ میں ظاہر کیا ہے۔ میر غفر غنی کی نسبت لکھا ہے کہ وہ لآم اور رتے کی بجائے غین بولتے تھے۔ نوۂ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

اجی بی نوغن یہ بات کیا نعماتی ہو تم تو اپنے جیونے کی چین ہو پتے کیا کہیں جب سے دغی جھوٹی ہے کچھ جی افسندہ ہو گیا ہے۔

صاف اُردو میں یہ عبارت اس طرح پڑھی جائیگی :- اجی بی نورن ! یہ بات کیا فرماتی ہو تم تو اپنے جیونے کی چین ہو پر کیا کہیں جب سے دلی جھوٹی ہے کچھ جی افسردہ ہو گیا ہے۔

یہ تقریریں ایسی پاک صاف شستہ زبان میں ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔ سید انشانے کیسی فصاحت کے قالب میں ان کو ڈھالا ہے، سودا کا آخری زمانہ تھا اور سید انشا کا عفو ان شباب تھا کچھ بہت فرق نہ تھا، تاہم مرزا کے دیوان کا وہ باچہ اُس زبان میں ہے جو آجکل سمجھنی شوار ہے اور سید انشا کے کمال کی یہ ادنیٰ صفت ہے کہ یہ تقریریں ایسی نصیح اور روزمرہ اُردو میں لکھی ہیں کہ آج بھی ان خیالات کو اس سے بہتر اُردو کا جامہ نہیں پہنایا جاسکتا۔

باب چہارم میں مصطلحاتِ دہلی اور باب پنجم میں مصطلحاتِ زمانِ دہلی کا ذکر ہے یہ دونوں باب محققینِ زبان و مؤلفینِ لغت کے لیے نہایت مفید اور کار آمد ہیں۔ اسکے بعد اُردو صرف و نحو سے بحث کی ہے۔

بہر حال یہ کتاب لکھو سید انشا، اللہ خاں نے اُردو زبان پر جیسا کہ ہم پیشتر کہہ چکے ہیں بہت بڑا احسان کیا ہے، اور جب تک اُردو زبان زندہ ہے اس کے مطالعہ اور اس سے استفادہ اور سند لینے کی ضرورت باقی رہیگی۔

اب ہم نواب عماد الملک، بھٹاٹل، اور بی نورن اور میر غفر غنی کی پوری تقریریں نقل کرتے ہیں تاکہ ناظرین ہماری رائے پر ہتھوڑا وغیرہ استصواب کا فتوے صادر کر سکیں۔

## سوال از طرف نواب عباد الملک

اجی لالہ بھارٹ امل! ہمارے احوال پر بلائید کہ ہم سخت متاسف ہوتے ہیں کہ حق تعالیٰ نے اپنی عنایات سے ہمیں میات الوف کا مالک کیا اور اوقات تمہاری یہ کہ احد من الناس جس مسلمان کو فرض کیجیے اُسکے برابر ذائقہ صاحب کالذت آشنا نہیں۔ بڑا تعجب ہے کہ آدمی باوصف تیسرے نمائے الہی سے محروم رہے اور نام اُس کا رحم اور شفقت رکھے، ہم لوگ بھی تو اپنے ہاتھ سے بکری سوائے عید قرباں کے حلال نہیں کرتے اور یہی اشخاص صاف کر کے گوشت بڑے آدمیوں کے مطابخ میں پہنچاتے ہیں اور بازار میں بیچتے ہیں۔ اگر تم بازار سے لیکر کھاؤ تو کیا مانع ہے؟

## جواب از طرف بھارٹ امل

ہمیں پیر مرشد! ہمارے دھرم مانہیں۔ جیو کا مارن بڑا دکھ ہے۔ ہو رکھاؤ نا تو ہو بھی بڑا، ہو رکھاؤ تمہاری کی بات ہے تم کہا دند لوگ ہو۔ ہمارے تو جو کوئی چوشی بھی بھولے مار گیر ہے تو اُسکے ہاتھ کا پانی پیو نرا گج ہے۔ ہمارے بڑے تاؤ سیلرام جی تھے۔ اونٹن بھولے سرے نے کہا کنکبھوری دیہی کے باپ پر بیر رکھ دیا تھا سودھی کا باپ مر گیا۔ سو با با جی نے دیکھ کر فرمایا نیوتی کے کہا یوہ کی کیا۔ اب دس ہزار روپے کس کے گھرنے کا ڈھول جو اُس کا دو کھ اُتاروں۔ ہو رہ پیشتر نے ہماری کھاؤ نڑ پیو نڑ واسطے بھی ڈھیر جیجاں پیدا کری ہیں، موہن جیگ لوچی، کچوری، انرتی، میٹھے سہال، کچنال، برے، سنبوسے، پر اگر ٹی، کھرے، بالوساہی، گند دڑے، دھوئی مونگ کی دال، دھوئی دھوئی اُرد کی دال، ہو رہ ڈھیر سے ترکاریاں، ہو رہ اچار، ہو رہ مکہ کالڈو، ہو رہ گوند کے پا پڑ جو بھی ریحی نوس پھر ماویں تو پھیر مکھانوس تنڑ کی کو بھی بھول جاویں بلکوں بھولے سرے بھی کھاؤنے میں نہ آوے۔

صاف اُردو میں عبارت متذکرہ بالا کو اس طرح پڑھ سکتے ہیں:-

ہاں ہاں! پیر مرشد! ہمارے دھرم میں نہیں جیو کا مارنا بڑا دکھ ہے یعنی گناہ ہے۔

اور کھانا تو اور بھی بُرا۔ اور کہا (میں نے کہا) مٹھاری کیا بات ہے تم خاوند لوگ جو۔ ہمارے تو جو کوئی چوہی بھی بھولے بسرے مار دیتا ہے تو اُسکے ہاتھ کا پانی پینا عصب ہے۔ ہمارے بڑے تاؤ سیلہ ام جی تھے۔ اُنہوں نے بھولے بسرے سے کہا کھنکھورے پر بیر رکھ دیا تھا سو کھنکھور امر گیا۔ سو بابا جی نے دیکھ کر فرمایا۔ پتوتی کے (جس کے اولاد نہ ہو یعنی اسے دشمن عقل تو جلد مارا جائیگا اور تیری ماں بے اولاد ہو جائیگی) کہنا یہ کیا کیا؟ اب دس ہزار روپے کس کے گھر سے نکالوں جو اُس کا گناہ (عذاب) اُتاروں۔ اور پریشتر نے ہمارے کھانے پینے کی واسطے بھی بہت چیزیں پیدا کی ہیں، سوہن بھوک، کوچی، پکوری، امرتی، میٹھے سہال، کچنال، بسے، سنبوسے، پراگڑھی، خرے، بالوشاہی، گندوڑے، دھوئی مونگ کی دال، دھوئی دھوئی اُڑد کی دال، اور بہت سی ترکاریاں، اور اچار، اور گلد کالہ، د، اور گوند کے پاڑ جو حضور بھی نوش فرمادیں تو پھر کھاننش و نلکی تو بھی بھول جاویں بلکہ بھولے بسرے بھی کھانے میں نہ آوے۔

بی نورن جو کوچہ بلاتی بیگم کی کسی ہے اور میر غفر غنی ویائی میں جو دلی سے لکھنؤ چلے آئے ہیں اس طرح گفتگو شروع ہوتی ہے:-

بی نورن کہتی ہیں:-

”اجی آؤ میر صاحب! تم تو عید کے چاند ہو گئے۔ دلی میں آتے تھے، دودو پہر رات تک بیٹھتے تھے اور رینچے پڑھتے تھے۔ لکھنؤ میں تمہیں کیا ہو گیا کہ کہیں تمہارا اثر اُتر آ رہا معلوم نہ ہوا۔ ایسا نہ کیجیو کہیں آٹھوں میں بھی نہ چلو، تمہیں علی کی قسم آٹھوں میں مقرر چلیو“

میر صاحب (جو اُس زمانہ کے ایک خوش طبع رنگین مزاج شخص تھے کوئی ثقہ، متقی پرہیزگار نہ تھے) جواب میں فرماتے ہیں:-

”اجی بی نورن! یہ کیا بات فرماتی ہو۔ تم تو اپنے جیوڑے کی جین ہو۔ پر کیا کہیں جیسے دلی چھوڑی ہے کچھ جی افسردہ ہو گیا ہے، اور شعر پڑھنے کو جو کو تو کچھ لطف اس میں بھی نہیں ہا

لے آٹھوں کا سید لکھنؤ میں بڑی دھوم کا ہوا تھا۔ ۱۲

کہ مجھ سے سینے۔ ریختے میں ہٹا دیاں والی ہوئے ان پر توجہ شاہ گلشن صاحب کی تھی۔ پھر  
 میاں آبرو اور میاں ناجی اور میاں حاتم پھر سب سے بہتر مرزا رفیع السودا اور  
 میر تقی صاحب۔ پھر حضرت خواجہ میر درد صاحب بردار اللہ مرقدہ جو میرے بھی استاد تھے  
 وہ لوگ تو سب مر گئے اور ان کی قدردانی کرنا اے بھی جاں بحق تسلیم ہوئے۔ اب لکھنؤ کے جیسے  
 چھو کر سے ہیں ویسے ہی شاعر ہیں۔ اور دلی میں بھی ایسا ہی کچھ چرچا ہے۔ تخم تاثیر صحبت اثر۔  
 سبحان اللہ یہ کون میاں جبرائیل بڑے شاعر۔ پوچھو تو تمہارا رائے مان کس دن شعر  
 کہتا تھا۔ اور رضا بہادر کا کونسا کلام ہے۔ اور دوسرے میاں مصحفی کہ مطلق شعور نہیں کہتے  
 اگر پوچھیے کہ ضروب زکدِ عمر داک کی ترکیب تو ذرا بیان کر دو اپنے شاگردوں کو ہر اہل لکھ  
 لڑنے آتے ہیں۔ اور میاں حسرت کو دیکھو، اپنا عرق یادیاں اور شربت انار چھوڑ کے شاعری  
 میں آکے قدم رکھا ہے اور میر انشا، اللہ خاں بچارے میر انشا، اللہ خاں کے بیٹے  
 آگے پریزا دتھے۔ ہم بھی گھوڑے کو جاتے تھے، اب چند روز سے شاعر بن گئے ہیں۔ مرزا  
 منظر جان جاناں صاحب کے روزمرہ کو نام رکھتے ہیں، اور سیکے زیادہ ایک اور  
 سینے کہ سعادت یار، طہماسپ کا بیٹا انوری ریختہ آپ کو جانتا ہے۔ رنگین نخل سے  
 ایک فقہ کہا ہے۔ اس شنوی کا نام دلپذیر رکھا ہے۔ رنڈیوں کی بولی اس میں باندھی  
 ہے یہ حسن برزہ رکھا ہے۔ ہر چند اس مرحوم کو بھی کچھ شعور نہ تھا بدرمیر کی شنوی نہیں  
 کہی گویا سانڈے کا تیل بیچتے ہیں۔ بھلا اس شعر کو کیوں کر کہیں۔ سارے دلی لکھنؤ کے رنڈی  
 سے لیکر مرد تک پڑھتے ہیں ۵

چلی واں سے دامن اٹھاتی ہوئی      کرٹے کو کرٹے سے بجاتی ہوئی  
 سو اُس بچارے رنگین نے بھی اسی طور پر فقہ کہا ہے۔ کوئی پوچھے کہ بھائی تیرا باپ  
 رسالدار مسلم۔ لیکن بچارہ بھی بھالے کا ہلانے والا، تینے کا چلانے والا تھا، تو ایسا  
 قابل کہاں سے ہوا اور شہدین جو بہت مزاج میں رنڈی بازی سے آگیا ہے تو ریختہ

کے تئیں چھوڑ کر ایک ریختی ایجاد کی ہے اس واسطے کہ بھلے آدمیوں کی ہوسبٹیاں  
 پڑھکر مشتاق ہوں، اور اُن کے ساتھ اپنا منہ کالا کرے۔ بھلا یہ کلام کیا ہے۔  
 ذرا گھر کو رنگیں کے تحقیق کر لو یہاں سے ہے کہ پیسے ڈولی کھا رو  
 مرد ہو کر کہتا ہے:۔ ع کہیں ایسا ہو کینت میں ماری جاؤں۔ اور ایک کتاب بنائی  
 ہے اس میں زندیوں کی بولی لکھی ہے جس میں اوپر والیاں، چلیں، اوپر والا چاند  
 اُجلی۔ دھوبن وغیرہ وغیرہ

یہ بڈے میر صاحب تازہ اوضاع و اطوار اور نئی رفتار و گفتار پر کیا کیا خیالات رکھتے تھے  
 اور شعرائے عصر کے کلام پر جو تنقید کی ہے کس قدر نرفیانہ انداز میں اپنے اصلی خیال کو ظاہر کیا ہے  
 لطف یہ ہے کہ سید انشانے اس موقع پر اپنے آپ کو اور اپنے دوست رنگین کو بھی نہیں  
 چھوڑا بلکہ خوب خبر لی ہے۔

**مختلف زبانیں** سید انشا مختلف زبانیں جانتے تھے، عربی، فارسی، ترکی، پنجابی پشتو  
 جانتے تھے۔ پوربی، مرہٹی، ان سب زبانوں میں خوب ماہر تھے اور اُردو کے

اہل زبان تھے۔ اُن کے تصرف یا ایجاد اپنی خوش ادائی اور خوشنمائی کے سبب ہر اہل زبان  
 سے تحسین و آفریں کا خراج وصول کرتے ہیں، اگر وہ آج ہمارے زمانہ میں ہوتے تو ہماری  
 زبان کا طرزِ ادانہایت عمدگی اور خوبصورتی سے بدلتے، ایک قصیدہ جو جابج سوم کی  
 تنسیبِ حیش میں کہا ہے، اُس میں انگریزی الفاظ کو خوبصورتی سے بٹھائے ہیں۔ دو چار  
 شعر بطور نمونہ لکھتا ہوں صاحبانِ ذوقِ سلیم اُن کے کمال کا خود اندازہ کر سکتے ہیں۔

|                                      |                                     |
|--------------------------------------|-------------------------------------|
| بگیاں بھولو نکئی تیار کر اے بوئے سمن | کہ ہوا کھائے کو ٹھیکند جو انان چمن، |
| کوئی شبنم سے چٹک یانوں پہ اپنے پوڑ   | کر سی ناز پہ جلوہ کی دکھائی گچھن    |
| شاخِ نازک سے کوئی ہاتھیں لیکر اک کیت | ہوا لگ سے نکالے کا ترا لاجون        |
| نسترن بھی نئی صورت کا دکھا دیگا رنگ  | کوچ پر ناز کی جب پاؤں کھینکھن       |

کہ مجھ سے سینے۔ ریختے میں مٹھا دیاں ولی ہوئے ان پر توجہ شاہ گلشن صاحب کی تھی۔ پھر  
 میاں آبرو اور میاں ناجی اور میاں حاتم پھر سب سے بہتر مرزا رفیع السودا اور  
 میر تقی صاحب۔ پھر حضرت خواجہ میر درد صاحب بزد اللہ مرقدہ جو میرے بھی استاد تھے  
 وہ لوگ تو سب مر گئے اور ان کی قدردانی کرنیوالے بھی جاں بحق تسلیم ہوئے۔ اب لکھنؤ کے جیسے  
 چھو کرے ہیں ویسے ہی شاعر ہیں۔ اور دلی میں بھی ایسا ہی کچھ چرچا ہے۔ تخم تاثیر صحبت اثر۔  
 سبحان اللہ یہ کون میاں جرأت بڑے شاعر۔ پوچھو تو تمہارا رائے مان کس دن شعر  
 کہتا تھا۔ اور رضا بہادر کا کونسا کلام ہے۔ اور دوسرے میاں مصحفی کہ مطلق شعور نہیں کہتے  
 اگر پوچھیے کہ خُزْ ب ز کِبْ عُمُرْ دَا کی ترکیب تو ذرا بیان کرو تو اپنے شاگردوں کو ہمراہ لیکر  
 لڑنے آتے ہیں۔ اور میاں حسرت کو دیکھو، اپنا عرق بادیان اور شربت انار چھوڑ کے شاعری  
 میں آکے قدم رکھا ہے اور میر انشا اللہ خاں بچارے میر انشا اللہ خاں کے بیٹے  
 آگے پریزا دتھے۔ ہم بھی گھومنے کو جاتے تھے، اب چند روز سے شاعر بن گئے ہیں۔ مرزا  
 منظر جان جاناں صاحب کے روزمرہ کو نام رکھتے ہیں، اور سب سے زیادہ ایک اور  
 سینے کہ سعادت یار، طہماسپ کا بیٹا انوری ریختہ آپ کو جانتا ہے۔ رنگین نخل سے  
 ایک قفقہ کہا ہے۔ اس شنوی کا نام دلپذیر رکھا ہے۔ رنڈیوں کی بولی اس میں باندھی  
 ہے میجرن پرزہ رکھایا ہے۔ ہر چند اس مرحوم کو بھی کچھ شعور نہ تھا بد رنمیر کی شنوی نہیں  
 کبھی گویا سانڈے کا تیل بیچتے ہیں۔ بھلا اس شعر کو کیوں کر کہیے۔ سارے دلی لکھنؤ کے رنڈی  
 سے لیکر مرد تک پڑھتے ہیں ۵

چلی واں سے دامن اُٹھاتی ہوئی      کڑے کو کڑے سے بجاتی ہوئی  
 سو اُس بچارے رنگین نے بھی اسی طور پر قفقہ کہا ہے۔ کوئی پوچھے کہ بھائی تیرا باپ  
 رسالدار مسلم لیکن بچارا برہمی بھالے کا ہلانے والا، تیغ کا چلانے والا تھا، تو ایسا  
 قابل کہاں سے ہوا اور شہدین جو بہت مزاج میں رنڈی بازی سے آگیا ہے تو ریختہ

کے تئیں چھوڑ کر ایک ریختی ایجاد کی ہے اس واسطے کہ بھلے آدمیوں کی بوسہ شیاں  
 پڑھ کر مشتاق ہوں، اور اُن کے ساتھ اپنا منہ کالا کرے۔ بھلا یہ کلام کیا ہے۔  
 ذرا گھر کو رنگیں کے تحقیق کر لو یہاں سے ہے کہ پیسے ڈولی کہا رو  
 مرد ہو کر کہتا ہے:۔ ع کہیں ایسا نوکینت میں ماری جاؤں۔ اور ایک کتاب بنائی  
 ہے اس میں زندیوں کی بولی لکھی ہے جس میں اوپر والیاں، چلیں، اوپر والا چاند  
 اُجلی۔ دھوبن وغیرہ وغیرہ

یہ بڑے میر صاحب تازہ اوضاع و اطوار اور نئی رفتار دگت پر کیا کیا خیالات رکھتے تھے  
 اور شعرائے عصر کے کلام پر جو تنقید کی ہے کس قدر فیاض انداز میں اپنے اصلی خیال کو ظاہر کیا ہے  
 لطف یہ ہے کہ سید انشانے اس موقع پر اپنے آپ کو اور اپنے دوست رنگین کو بھی نہیں  
 چھوڑا بلکہ خوب خبر لی ہے۔

**مختلف زبانیں** سید انشا مختلف زبانیں جانتے تھے، عربی، فارسی، ترکی، پنجابی، پشتو  
 جانتے تھے۔ پوربی، مرہٹی، ان سب زبانوں میں خوب ماہر تھے اور اُردو کے

اہل زبان تھے۔ اُن کے تصرف یا ایجاد اپنی خوش ادائی اور خوشنائی کے سبب ہر اہل زبان  
 سے تحسین و آفریں کا خراج وصول کرتے ہیں، اگر وہ آج ہمارے زمانہ میں ہوتے تو ہماری  
 زبان کا طرزِ ادا نہایت عمدگی اور خوبصورتی سے بدلتے، ایک قصیدہ جو جالچ سوم کی  
 تہنیتِ جشن میں کہا ہے، اُس میں انگریزی الفاظ کس خوبصورتی سے بٹھائے ہیں۔ دو چار  
 شعر بطور نمونہ لکھتا ہوں صاحبانِ ذوقِ سلیم اُن کے کمال کا خود اندازہ کر سکتے ہیں۔

|                                    |                                     |
|------------------------------------|-------------------------------------|
| بگیاں بھونکنی تیار کر اسے بونے سمن | کہ ہوا کھائے کو ٹھیکنے جوانانِ چمن، |
| کوئی بنیم سے چٹک بانوں پہ اپنے پوڑ | کسی ناز پہ جلوہ کی دکھائیے گا بھین  |
| سرخ نازک سے کوئی ہاتھیں لیکر اکیت  | ہوا لگ سے نکالے کا نرا لاجب         |
| نسترن بھی نئی صورت کا دکھا دیکارنگ | کوچ پر ناز کی جب پاؤں کھینکے گن     |

پتے پل پل کے بجادیئے فرنگی طنز  
 گھینچ کر تار رگ ابر بہاری سے کئی  
 اردلی کے جو گزاندیل ہیں ننگے سب جمع  
 ننگت آوے گی کل کھول کلی کا کمر  
 لالہ لارے کا سلامی کو بنا کر پلٹیں،  
 خود نسیم سحر آوے گی بجاتی ارگن  
 آن کر اپنا بجل پھونکے کاجب سکھ دس  
 ساتھ ہولے گی نزاکت بھی جو ہنسی بھین  
 گھوڑے کی تعریف کیا خوب کی ہے :-

ہے اس آفت کا سب سیر کہ را کب سکا  
 حاضری کھائے جو کلکتہ ٹولڈن میں ٹپن  
 حلیہ اُن کا پڑھنا بھی ایک خاص انداز رکھتا تھا جس سے شعر کی شان اور لطف کلام دو بالا  
 ہو جاتا تھا۔ سید انشا رنگت کے گورے، بدن کے فریب، صورت کے جامہ زیب تھے چال  
 ڈھال اور سج و سج یہ تھی کہ ایک طرف آدابِ معقولیت سے سلام کیا۔ ایک طرف مسکرا دیا۔  
 ایک طرف ہنخ چڑا دیا۔ کبھی مقطع مرد معقول، کبھی دلی کے بانکے، کبھی آدھی ڈاڑھی اڑا دی  
 کبھی چار ابرو کی صفائی بتا دی، اس میں شک نہیں کہ تفریح و تضحیک کے اعتبار سے کسی جلسہ میں  
 اُن کا آنا بھانڈے آنے سے کم نہ تھا۔ معصی نے اُن کی سچ میں کیا خوب کہا ہے :- ع  
 ”واقف کہ شاعر نہیں تو بھانڈا ہے بھرٹے“

لطائف ایک دن نواب سعادت علی خاں کے ساتھ بیٹھے کھانا کھا رہے تھے، اور گرمی سے  
 گھبرا کر دستار سر سے رکھ دی تھی۔ منڈا ہوا سر دیکھ کر نواب کی طبیعت میں چہل آئی، ہاتھ  
 بڑھا کر پیچھے سے ایک دھول ماری، آپ نے جلدی سے ٹوپی سر پر رکھ لی اور کہا سبحان اللہ  
 بچپن میں بزرگ سمجھایا کرتے تھے وہ بات سچ ہے کہ ننگے سر کھانا کھاتے ہیں تو شیطان دھولیں  
 مارا کرتا ہے۔

ایک دن نواب موصوف نے روزہ رکھا اور حکم دیا کہ کوئی آنے نہ پائے سید انشا  
 کو ضروری کام تھا۔ یہ پہنچے۔ پہرہ دار نے کہا کہ آج حکم نہیں۔ آگے آپ مالک ہیں۔ باوجود  
 انتہائے مرحمت کے یہ بھی مزاج سے ہشیا رہتے تھے۔ تھوڑی دیر تاہل کیا۔ آخر کمزور کھول

دستار سر سے بٹھا تھا اُتار ڈالی اور دوپٹہ عورتوں کی طرح سے اوڑھ کر ایک ناز و انداز کے ساتھ سامنے جا کھڑے ہوئے، بچوں ہی اُس کی نظر پڑی آپ اُننگلی ناک پر دھر کے بولے  
 میں تے جھٹے نہ رکھ لے مری پیاری رزہ بندی رکھ لیگی تے بد لے ہزاری روزہ  
 نواب بے اختیار منہ پڑے۔ جو کچھ کہنا سنا تھا وہ کہا اور ہنستے پھیلے چلے آئے۔

جان سیلی صاحب رزیدنٹ کے ساتھ علی نقی خاں میرنشی بھی آیا کرتے تھے۔ انکی اُن کی عجیب لطف کی چوٹیں ہوتی تھیں۔ ایک دن اُننا اُسے گفتگو میں کسی کی زبان سے نکلا یہ شاید کہ پلنگ خفیہ باشد اُتوں لکھا کہ گلستاں کے ہر شعر میں مختلف ہدایتیں ہیں اور لطف یہ کہ کوئی کیفیت خالی نہیں چھانچہ ہو سکتا ہے۔ "ح" شاید کہ پلنگ خفیہ باشد "س" غلوٹ علیخاں نے سیدنشا کی طرف دیکھا اُنہوں نے ہاتھ باندھ کر عرض کی کہ حضور! میرنشی صاحب بجا فرماتے ہیں، غلام نے بھی ایک نسخہ گلستاں میں ہی دیکھا تھا:-

تامر دسرخن نہ گفنیہ باشد عیب و ہنرش نہ فنیہ باشد  
 در بیشہ گماں میر کہ خالی است شاید کہ پلنگ خفیہ باشد

بلکہ وہ نسخہ بہت صحیح اور خوش تھا۔ اُس میں گفنیہ اور نہ فنیہ کے کچھ معنی بھی لکھے تھے۔ میرنشی صاحب آپ کو یاد ہیں؟ وہ نہایت شرمندہ ہوئے جب وہ خصیت ہوتے تو لیلہ نشا کہا کرتے میرنشی صاحب کا التذیلی۔

فائق تخلص ایک فلک زدہ شاعر تھا۔ خدا جانے کس بات پر خفا ہوا کہ ان کی جو کہی اور خود لا کر سنائی۔ انہوں نے بہت تعریف کی۔ بہت اُچھلے۔ بہت کودے، اور پانچ روپے بھی دیے جب وہ چلا تو بولے ذرا ٹھیرے گا، ابھی آپ کا حق باقی ہے۔ قلم اُٹھا کر یہ قطعہ لکھا اور حوالہ کیا:-

فائق بے حیا چو ہجوم گفت دل من سوخت سوخت سوخت بہ  
 صلہ اشس پنج روپہ دادم دہن سگ بہ لقمہ دوخت بہ

انجام اچھا نہ ہوا لیکن افسوس ہے کہ ایسے مرغبان و مرغج اولطفیفہ گو اور بذلہ شیخ شخص کا انجام

سعادت علی خاں کے ہاتھوں اچھا نہ ہوا، کوئی ایسی بات بھی نہ تھی جس کی سزا ان کی سلیڈ نشا کیلئے ایسی سخت جو نیکری۔ واقعہ یہ ہے کہ ایک دن سہرور بار بعض مشرقائے خاندانی کی شرافت و نجابت کے تذکرے ہو رہے تھے سعادت علی خاں نے کہا کہ کیوں بھئی ہم بھی نجیب الطرفین میں۔ سید انشا بول اُٹھے کہ حضور بلکہ انجیب۔ انجیب نجیب کا اسم تعفیل ہے یعنی نہایت شریف یا سب سے بڑھکر شریف اور دوسرے معنی اسکے یہ ہیں کہ وہ شخص جو حرم کے پیٹ سے ہو چنانچہ عرب کہتا ہے وَلَدُ الْجَارِيَةِ اَنْجَبٌ۔ اتفاق یہ ہوا کہ سعادت علی خاں حرم کے شکم سے تھے۔ انہوں نے انجیب کے معنی ہی لیے، چنانچہ وہ چپ اور تمام دربار درہم ہو گیا اگرچہ سید انشا نے پھر اور باتیں بنانا کر بات کو سنا نا چاہا مگر کسانِ تقدیر سے تیر نکل چکا تھا وہ مکمل دل سے نہ نکلی اور نواب اس فکر میں رہنے لگے کہ کوئی بہانہ ان کی سخت گیری کے لیے ہاتھ آئے، ایک دن سید انشا نے بہت ہی گرم لطیفہ سنایا۔ سعادت علی خاں نے کہا کہ انشا! جب کہتا ہے ایسی بات کہتا ہے کہ نہ دیکھی ہو نہ سنی ہو۔ یہ موجدوں پر تاؤ دیکھ بولے کہ حضور کے اقبال سے قیامت تک ایسی ہی کہے جاؤں گا، کہ نہ دیکھی ہو نہ سنی ہو نواب تو تاک میں تھے چیں مجھیں ہو کر بولے کہ بھلا زیادہ نہیں! فقط دو لطیفے روز سنا دیا کیجئے، مگر شرط یہی ہے کہ نہ دیکھے ہوں نہ سنے ہوں، نہیں تو خیر نہو گی۔ سید انشا بھگے گئے کہ یہ انداز کچھ اگڑ ہیں تیر اُس دن سے دو لطیفے روز تو انہوں نے سنانے شروع کر دیے مگر چند روز میں یہ عالم ہو گیا کہ دربار کو جانے لگتے تو جو پاس بیٹھا ہوتا اُسی سے کہتے کہ کوئی نقل، کوئی چٹکلا یاد ہو تو بتاؤ تاکہ نواب کو سناؤں، اسی اثنا میں ایک دن ایسا ہوا کہ سعادت علی خاں نے انہیں بلا بھیجا۔ کسی اور امیر کے ہاں گئے ہوئے تھے۔ چوہداس نے آکر عرض کی کہ گھر میں ملے، خفا ہو کر حکم دیا کہ ہمارے سوا کسی اور کے ہاں نہ جایا کرو۔ اس قید

لے یہ بھی نواب کی حماقت تھی۔ جب حرم کے شکم سے عقاؤ لوگوں سے کیوں نجیب الطرفین کہلانے کا شائق تھا؟ تنہا

بے زنجیر تھے انہیں بہت دق کیا۔ تازہ مصیبت یہ ہوئی کہ تعالیٰ اللہ خاں نوجوان بیٹا مر گیا اس صدمہ سے حواس میں فرق آ گیا، یہاں تک کہ ایک دن سعادت علی خاں کی سواری اُن کے مکان کی طرف سے نکلی۔ کچھ غم و غصہ، کچھ دل بے قابو۔ غم سر راہ کھڑے ہو کر سخت دُشست کہا، اب جنون میں کیا کسر رہی، سعادت علی خاں نے جا کر تنخواہ بند کر دی۔ اگر تو اب اس طریقہ سے بدلہ نہ لیتا تو شاید یہ بات کسی کو معلوم بھی نہ ہوتی کہ سید انشا نے اُسے آنجناب کہا تھا اور وہ حرم کے شکم سے تھا، باکمال اصحاب کے ساتھ اس بے رحمی اور سختی سے پیش آنا ہمیشہ باعثِ ننگ و شرم رہا ہے سلطان محمود غزنوی کو فردوسی نے جو لکھ کر بدنام کیا کیونکہ سلطان نے شاہنامہ کی تصنیف کا معاوضہ بجائے ساٹھ ہزار اشرفیوں کے ساٹھ ہزار روپیہ دینا چاہا۔ سعادت علی خاں کو سید انشا کیساتھ بدسلوکی کرنے پر ہمیشہ کے لیے دنیاۓ شعراء میں تنگ نظری اور کم باگی کی جگہ دی گئی۔ دینی فردوسی کا شعر سعادت علی خاں کے مصداق ہے ۵

پرستار زادہ نیا ید بکار اگرچہ بود زادہ شہسپار

آخرا سی کا بھائی آصف الدولہ اپنی سخاوت اور عظم و بردباری کی وجہ سے مشہور آفاق ہو اور مجبوراً یہی کہنا پڑتا ہے کہ وہ خاندانی سیدزادی کے لطف سے تھا جنکی تمام خاندان بڑی عظمت کرتا تھا اور جن کا نام دامنِ سلیم صاحب تھا اور یہ حضرت آخرا نجب ہی تھے۔ ۶  
اصل بد از خطا خطا نہ کند

میر تقی میر نے نواب آصف الدولہ کو ایک غزل سنائی، وہ حوض کے کنارے کھڑے ہوئے مچھلیوں سے مکمل رہے تھے، توجہ سے نہ سنی۔ میر صاحب ناراض ہو کر چلے آئے اور نواب کے یہاں جانا چھوڑ دیا۔ چند روز کے بعد ایک دن بازار میں میر صاحب چلے جاتے تھے کہ نواب کی سواری سامنے سے آگئی۔ دیکھتے ہی نہایت محبت سے بولے کہ میر صاحب آپ نے بالکل مہین چھوڑ دیا۔ کبھی تشریف بھی نہیں لاتے، میر صاحب نے کہا بازار میں ہیں

کرنا دایہ شرفا تھیں۔ یہ کیا گفتگو کا موقع ہے۔ کہیں سعادت علی خاں سے یہ گفتگو ہوتی تو بھلا میر صاحب شہر بدر کر دیے جاتے۔

**انشائی زندگی**  
میل نقلیات

الغرض سید انشا کا ایک وہ زمانہ تھا کہ سعادت علی خاں کی ناک کے بال تھے، اپنی کمال لیاقت اور گھنہ مزاجی کے سبب مرجع خلأقی تھے دروازے پر گھوڑے، ہاتھی، پالکی، نالکی کے جوم سے رستہ نہ ملتا تھا، دوسرا زمانہ وہ گزرا جبکہ انجیب کا واقعہ ہو چکا تھا، ظاہر درست تھا مگر درخت اقبال کی جڑ کو دیک لگ گئی تھی اور سید انشا کا اپنے گھر سے باہر جانا بند ہو گیا تھا۔ چنانچہ سید انشا نے اپنے دوست میاں رنگین سے کہا تھا۔ ”کیا کروں؟ ظالم کی قید میں ہوں، سوا دربار کے گھر سے نکلنے کا حکم نہیں“ سید انشا کی تیسری حالت یہ ہوئی جبکہ تنخواہ بند ہو گئی کہ ایک مشاعرہ میں سیلی بھیلی رونی دارم زنی پہنے گئے۔ سر پر ایک میلہ سا پہنیا، گھٹنا پاؤں میں۔ گئے میں پکیوں کا توڑا۔ ایک لکڑ کا حقہ ہاتھ میں۔ جا کر سلام علیکم کہا اور بیٹھ گئے۔ کسی نے اُن سے مزاج پرسی کی، انہوں نے اپنے توڑے میں ہاتھ ڈال کر تمباکو نکالا، اور اپنی حلیم پر سٹھا جاکہ کہا کہ بھئی ذرا سی آگ ہو تو اس پر رکھ دینا۔ اُسی وقت آوازیں بلند ہوئیں اور گرگر گڑی۔ شک، یہ سچاں سے لوگ تواضع کرنے لگے، وہ بے دماغ ہو کر بولے کہ صاحب! ہمیں ہمارے حال پر رہنے دو۔ نہیں تو ہم جاتے ہیں۔ سب نے اُن کے حکم کی تعمیل کی۔ دم بھر کے بعد پھر بولے کہ کیوں صاحب ابھی مشاعرہ شروع نہیں ہوا؟ لوگوں نے کہا جناب لوگ حج جوتے جاتے ہیں۔ سب صاحب آجائیں تو شروع ہو۔ وہ بولے کہ صاحب ہم تو اپنی غزل پڑھ دیتے ہیں! یہ کہہ کر توڑے میں سے ایک کاغذ نکالا اور غزل پڑھنی شروع کر دی جو اُن کے بالکل حسب حال تھی، اور آج بھی زباں زد خاص و عام ہے:-

کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سیار بیٹھے ہیں بہت لگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں

لے یہ سید انشا کی آخری غزل ہے۔ تھا

نہ چھیڑاے محبت باد بہاری راہ لگ اپنی  
 لقصہ و عرش پر ہے اور سر پہ پائے ساتی پر  
 بساں نقش پائے بہ رواں کوئے تنہا میں  
 یہ اپنی چال ہی افادگی سے ایک پہر و تک  
 کہاں صبر تحمل آہ ننگ و نام کیا شو ہے  
 نجیبوں کا عجیب کچھ حال ہی میں یارو  
 جہاں پوچھو یہی کہتے ہیں ہم بیکار بیٹھے ہیں  
 غرض کچھ زور دھن میں اس ٹھٹھی بخار بیٹھے ہیں  
 نہیں ٹھٹھنے کی طاقت کیا کریں لاچار بیٹھے ہیں  
 نظر آیا جہاں پر سایہ دیوار بیٹھے ہیں  
 میاں رو بیٹ کر ان سکو ہم بیکار بیٹھے ہیں  
 جہاں پوچھو یہی کہتے ہیں ہم بیکار بیٹھے ہیں

علاگردش فلک کی چین دیتی ہے کسے انشا

غنیمت ہے کہ ہم صورت یہاں دچار بیٹھے ہیں

وہ تو غزل پڑھ، کاغذ پھینک، سلام علیک کہہ کر چلے گئے مگر زمین و آسمان میں سناٹا ہو گیا  
 اور دیر تک دلوں پر ایک عالم رہا جس کی کیفیت بیان نہیں ہو سکتی۔ "اگرچہ اس آزاد  
 جو کھتی حالت کا نقشہ میاں رنگین اس رنگ سے کیسے بچے ہیں کہ میں لکھنؤ گیا تو پوچھتا ہوا  
 گھر پہنچا۔ افسوس جس دروازہ پر ہاتھی جھومے تھے وہاں دیکھا کہ خاک اڑتی ہو اور کتے لوٹتے  
 ہیں۔ ڈیوڑھی پر دستک دی، اندر سے کسی بڑھیا نے پوچھا کہ کون ہے بھائی؟ (وہ اُن کی  
 بی بی تھیں) میں نے کہا کہ سعادت یا ر خاں دلی سے آیا ہے۔ چونکہ سید انشا سے انتہائی  
 درجہ کا اتحاد تھا اس عقیدہ نے پہچانا، دروازہ پر آکر بہت روئیں اور کہا کہ بھئی اُن کی تو عجیب  
 حالت ہے۔ اسے لو میں بہت جاتی ہوں، تم اندر آؤ، اور دیکھ لو۔ میں اندر گیا۔ دیکھا ایک  
 کونے میں بیٹھے ہیں۔ تن بہرہ نہ ہے، دونوں رانوں پر سر دھرا ہے۔ آگے راکھ کے ڈھیر  
 ہیں، ایک ٹوٹا سا حقہ پاس رکھا ہے، یا تو وہ شان و شکوہ کے جگھٹ دیکھتے تھے، وہ اگر جوشی  
 اور چہلوں کی ملاقاتیں ہوتی تھیں یا یہ حالت دیکھی۔ بے اختیار دل بھر آیا۔ میں بھی وہیں زمین  
 پر بیٹھ گیا اور دیر تک رویا۔ جب جی ہلکا ہوا تو میں نے پکارا کہ سید انشا۔ سید انشا۔ سر  
 اٹھا کر اُس نظر حسرت سے دیکھا جو کتنی بھتی کہ کیا کروں۔ آنکھ میں آنسو نہیں میں نے کہا کیا

حال ہے؟ ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کہا کہ شک ہے، پھر اس طرح سر کو گھٹنوں پر رکھ لیا کہ نہ اٹھایا۔

یہ اُردو نظم و نشر کا بالکمال اُستاد اس طرح اپنی زندگی کے آخری ایام گزار کر دنیائے فانی سے عالم بقا کو راہی ہوا، اور اسکی موت اہل بیتش کے لیے ایک تازیانہ عبرت کا کام دیتی ہے ۵

یہ لاش بے کفن اسدِ خستہ جاں کی ہے  
حقِ مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا



## مولوی شاہ رفیع الدین دہلوی

اٹھارویں صدی عیسوی کے پچھلے نصف حصہ میں اور انیسویں صدی کے پہلے نصف حصہ میں یعنی ایک صدی کے اندر شاہانِ مغلیہ کی عظمت کا خاتمہ ہو گیا تھا، اقبالِ مٹھ موڑ چکا تھا، اور ادب و فلاکت کی گھٹائیں ہر طرف سے چھا رہی تھیں، لیکن اس آخری زمانہ میں جو اسلام کا ہندوستان میں آخری دور تھا آسمانِ علم و ادب کا آفتاب دہلی میں طلوع ہوا، اور اُس نے اپنی روشنی سے عالم کو متور کر دیا حکومتِ اسلام کو گھٹن لگ چکا تھا لیکن مذہبِ ہلام باوازِ بلند بکار رہا تھا کہ وہ حکومت کا تابع نہیں ہے، بلکہ اسکی اپنی خوبیاں سلطنتوں کو تسخیر کرتی ہیں، اور اہلِ عالم کے دلوں کو مسخر کر لیتی ہیں، چنانچہ شاہ ولی اللہ صاحب قدس سترہ العزیز نے اپنی لاجواب کتاب حجۃ اللہ الی اللہ سے جو فارسی زبان میں تحریر فرمائی ہے ہمارے قول کی تائید کر دی ہے۔ مولانا شبلی نعمانی اپنی کتاب علم الکلام میں فرماتے ہیں کہ ”آخر زمانے میں جب کہ اسلام کا نفس باز پیس تھا، شاہ ولی اللہ صیبا شخص پیدا ہوا، جسکی نکتہ سنجیوں کے

ملہ (۱) واقعات دار الحکومت دہلی مصنفہ مولوی بشیر الدین احمد دہلوی سے شاہ رفیع الدین و شاہ

عبدلقدار و مولوی اسماعیل نے کچھ حالات اخذ کیے گئے ہیں۔ بہت

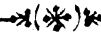
آگے غزالی، برازی، ابن رشد کے کارنامے بھی ماند پڑ گئے۔ شاہ صاحب نے علم کلام کے عنوان  
 سے کوئی تصنیف نہیں کی اور اس بنا پر اُن کو سکتین کے دُوسرے میں شمار کرنا بظاہر موزوں نہیں  
 لیکن اُن کی کتاب حجۃ اللہ البالغہ جس میں اُنہوں نے شریعت کے حقائق اور اسرار بیان کیے ہیں  
 وحقیقت علم کلام کی روح رواں ہے.....“

ظاہر ہے کہ شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اعلیٰ پایہ کے اہل علم تھے جو علامہ شبلی سے  
 ان الفاظ میں خراج تحسین وصول کرتے ہیں:۔ ان کے بعد ان کے تین صاحبزادے علی التواتر  
 مذہب اسلام کی خدمت کرتے رہے، مولوی شاہ عبدالعزیز صاحب بڑے بیٹے تھے جنکی کتاب  
 فارسی زبان میں ازالۃ التحقار کے نام سے مشہور ہے اور جو آسمانِ علم پر ماہتاب ہو چکے۔ اُنکے بعد  
 مولوی شاہ رفیع الدین کانبر ہے جو شاہ ولی اللہ صاحب کے دوسرے بیٹے تھے۔ ۶۳ھ ہجری  
 میں پیدا ہوئے تھے۔ اپنے والد ماجد کی آغوشِ عاطفت میں علومِ مروجہ حاصل کیے اور حدیث  
 شریف کی سند بھی اُسی صاحبِ کمال کے دستِ شفقت سے حاصل کی۔ علم اور تقویٰ میں  
 اپنے باپ اور بھائی کے قدمِ بقدم تھے جب بڑے بھائی حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب  
 بوجہ کبر سنی و کثرتِ امراض و ضعفِ مزاج، دماغی خست و تعلیم و تدبیر کے زیادہ متحمل نہ ہو سکے  
 تو یہ کام شاہ رفیع الدین صاحب ہی کے زیادہ تر ذمہ کیا گیا۔

آپ کے اوصاف کا احاطہ کرنا مشکل ہے، کس باپ کے بیٹے اور کس بھائی کے بھائی تھے۔ شاہ  
 عبدالعزیز صاحب کی وفات پر جو قطعہ تاریخِ حکیم مومن خاں مومن نے لکھا ہے اُس سے اُنکے  
 مذہبی تقدس اور علم و فضل کا ایک حد تک اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ یہاں صرف دو شعر پر اکتفا  
 کرتا ہوں:۔

جانبِ ملک عدم تشریف فرما کیوں ہو      آگیا تھا کیا کہیں مُردوں کے ایمان میں غل  
 دستِ بیدادِ اہل سے بے سرو پا جو      فقر و دین، فضل و سبب، لطفِ مکرّمِ علم و کرم  
 پس شاہ رفیع الدین صاحب بھی صاحبِ علم و فضل اور باکمال ہونے لگے علامہ صاحبِ باطل اور

مخیر بھی تھے۔ آپ سے اکثر تعلیم اور کچھ شرعی یادگار ہے۔ لیکن سب اہم اور بڑا کام کلام مجید کا تحت اللفظ اُردو ترجمہ ہے جو آج تک مقبولِ انام ہے۔ مختصر نمونہ مولوی نذیر احمد صاحب کے حالات میں درج کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ بھی آپ کی کئی تصنیفات ہیں۔ آخر عمر تک آپ خدمتِ دین میں مہمک رہے اور ستر برس کی عمر میں ۳۳ ہجری میں انتقال کیا اور اپنے والد بزرگوار کے قریب پانچ کی طرف دفن ہوئے۔



## مولوی شاہ عبد القادر صاحب دہلوی

شاہ ولی اللہ صاحب قدس سرہ العزیز کے تیسرے صاحبزادے مولوی شاہ عبد القادر صاحب تھے۔ آپ ۱۱۷۰ ہجری میں شمعِ افروزِ بزمِ جہاں ہوئے اور اپنے وجودِ باوجود سے عالم کو روشن کر دیا۔ ابتدائی تعلیم و تربیت اپنے والدِ مکرم کے سایہِ عاطفت میں پائی اور علمِ فقہ و حدیث و تفسیر میں نام پیدا کیا۔ تحصیلِ علم سے فراغت پا کر اکبر آبادی مسجد کے حجرے میں تمام عمر بسر کر دی اور دنیا میں بالکل ایک مسافرانہ حالت سے رہے۔ کن فی الدنیا کالت غریب او عابر سبیل پر آپ کا عمل رہا حقیقتاً صرف یہی لوگ ایسے نقوس قدی تھے جو عالمِ باعمل تھے، یوں تو دنیا کو سب سرائے فانی اور چند روزہ اقامت گاہ کہتے ہیں لیکن اپنے عمل اور طرزِ ماند و بود سے اپنے قول کی تائید نہیں کرتے بلکہ اس کے خلاف وہ طریقہ زندگی اختیار کرتے ہیں جس سے وہ یہاں ابد الابد تک رہنے کی فکر میں مبتلا پائے جاتے ہیں۔

شاہ صاحب عالم، فاضل، متقی، پرہیزگار، متقنی المزاج اور متوکل تھے۔ دنیا سے نفرت تھی، اور گوشہ نشینی پسند خاطر تھی۔ رات دن ذکرِ خدا میں مشغول رہتے تھے۔ اہل دنیا کی طرف مطلق التفات نہ فرماتے۔ اسی سبب سے تصنیف و تالیف کی طرف بھی چنداں توجہ نہ کی۔ قرآن شریف کا با محاورہ ترجمہ اُردو یا موضح القرآن آپ سے یادگار ہے جس پر

بلا سنا لغزروں کتابیں شاریں۔ ترجمہ ظاہر میں سیدھا سادہ ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اُس کے صاحب ترجمہ کی بالغ نظری بھی عیاں ہے۔ جو اہر کوٹ کوٹ کر بھرے ہیں، اس کا لطف دہی جانتے ہیں جو ادب اور علم تفسیر و حدیث سے بہرہ وانی رکھتے ہیں۔ آپ کا یہ ترجمہ کثرت سے رائج ہے اور بہت مقبول ہے ہم نے آپ کے ترجمہ کی بھی دو چار سطریں شاہ رفیع الدین صاحب کے ترجمہ کے ساتھ ساتھ مولوی نذیر احمد صاحب کے ترجمہ القرآن کے تحت میں لکھی ہیں۔ ناظرین کو اس ترجمہ کے محاسن کا اندازہ خود مولوی نذیر احمد صاحب کی تحریر سے بخوبی ہوا جائیگا۔ اور اُن کی رائے اس بارے میں ایک خاص وقت رکھتی ہے کیونکہ وہ بھی خود مترجم القرآن ہیں اور جو خوبیاں اُن کو اپنے ترجمہ کے وقت اس ترجمہ میں نظر آئیں اُنہوں نے اپنے الفاظ میں اُن کا اظہار کر دیا ہے۔

شاہ عبدالقادر صاحب کے فیض باطن کا یہ حال تھا کہ اُس زمانہ میں ایسا مسکاشف صحیح اور کوئی نہ تھا۔ سنا جاتا ہے کہ جو کچھ اُن کی زبان سے نکل جاتا تھا بلا کم و کاست وہی نکلوا میں آتا تھا، مابوجود اس کے بسبب کثرت اخلاق کبھی کسی کے حق میں کچھ ارشاد نہ فرماتے اور نہ کبھی کسی سے یہ کہتے کہ ادھر بیٹھو یا ادھر لیکن منجانب اللہ لوگوں کے دلوں میں آپ کا ایسا رُعب چھایا ہوا تھا کہ رؤسائے شہر جب آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے تو ادب کی وجہ سے دور دور خاموش بیٹھتے اور آپ کی تحریک کے بغیر مجال سخن نہ رکھتے تھے۔ اور اس پر بھی ایک دو بات سے زیادہ اُن کے منہ سے نہ نکلنے پاتی تھی۔ آپ کی کرامات بے شمار ہیں آپ نے سنہ ۱۰۳۲ ہجری میں بصرہ ۱۳ سال وفات پائی اور اپنے جدِ امجد شاہ عبدالرحیم صاحب کے پائین میں مدفون ہوئے۔

مولوی نذیر احمد کی رائے  
ترجمہ القرآن پر  
مولوی نذیر احمد صاحب نے اپنے ترجمہ القرآن کے ساتھ ایک مہیوطہ دیا ہے لکھا ہے اُس میں ترجمہ کی ضرورت کو بہت خوبی کے ساتھ دکھلایا ہے، جہاں تک شاہ عبدالقادر صاحب اور اُن کے ترجمے کا

تعلق ہے وہ عبارت ہم ذیل میں نقل کرتے ہیں۔

”قرآن کا سب سے پہلا ترجمہ وہ ہے جو مشائخ ہجری میں مولانا شاہ ولی اللہ صاحب نے کیا تھا۔ میں کہتا ہوں کہ یہ بزرگ زمانہ کے حالات پر کیسی وسیع نظر رکھتے تھے کہ مشائخ ہجری میں باپ نے فارسی ترجمے کی ضرورت معلوم کی پھر تو نہیں دوڑتے تو نہیں صرف بچپن میں برس بعد اُن کے بیٹے شاہ عبدالقادر صاحب کو معلوم ہوا کہ عام مسلمان فارسی بھی کم سمجھتے ہیں کہ صرف اہل علم میں اُنہوں نے اُردو ترجمہ کیا جو موعظ القرآن کے نام سے مشہور ہے اور اُردو کا بہتر سے بہتر ترجمہ سمجھا جاتا ہے، اور وہ فی الواقع اپنے وقت میں بہتر سے بہتر تھا بھی۔ اس کے علاوہ میں مولانا شاہ ولی اللہ صاحب نے فارسی ترجمہ کیا اور مشائخ ہجری میں مولانا شاہ عبدالقادر صاحب نے اُردو صاف ظاہر ہے کہ مشائخ ہجری ہی میں فارسی کا رواج اتنا کم ہو چلا تھا کہ مولینا شاہ عبدالقادر صاحب کو قرآن کا اُردو ترجمہ کرنا پڑا تو اب مسلمانوں میں فارسی کا کیا حال ہوا ہوگا۔ بے شک عربی کی طرح فارسی معدوم نہیں ہوئی مگر یہ بیچارے بھی مہمان چند روزہ ہے۔ ”اگر ماند شبے ماند شب دیگر نمی ماند“..... گوزمانے کے انقلاب نے مولانا شاہ ولی اللہ صاحب کے ترجمے کو بیکار سا کر دیا مگر ترجمہ تو حقیقت میں ایسا مستند ہے کہ جو شخص قرآن کے لفظ لفظ میں تیرے وہی اُس کی قدر جان سکتا ہے۔ فی الحقیقت قرآن کے مترجم ہونے کے لیے جتنی باتیں درکار ہیں ترجمے سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ سب مولانا شاہ ولی اللہ صاحب میں علی الوجہ الکمال پائی جاتی تھیں، اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ مولانا صاحب کی نظر تفاسیر اور احادیث اور دین کی کتابوں پر ایسی وسیع ہے کہ بُری نہی کا حصہ تھا۔ اب کوئی ایک عمر صرف کرے تو اُس کو یہ بات نصیب ہو اور وہ بھی شاید ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر ایک آیت بلکہ ہر ایک لفظ کی نسبت مفسرین کے جتنے اقوال ہیں وہ سب اُن کے پیش نظر ہیں اور وہ اُن میں جس کو راجح پاتے ہیں اختیار کر لیتے ہیں جب ایک خاندان کے ایک چھوڑتین تین ترجمے لوگوں کو مل گئے، ایک فارسی مولانا شاہ ولی اللہ صاحب



دیباچہ کی زبان کو ”گویا کی“ اور ”اپنے نام کر“ اور ”اپنے کلام کر“ کی خوبیوں کو نہ سمجھیں، مگر  
 بایں ہمہ ترجمہ اپنے وقت میں اور اپنی شان میں بے نظیر تھا۔

## مولوی اسماعیل دہلوی

شہید راہ خدا

آپ جامع کمالات صوری و معنوی تھے، نکتہ سنجی، کلام الہی، اور حدیث نبوی کے ماہر  
 تھے، عالم معقول و منقول تھے، آپ کو مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب و شاہ فیض الدین صاحب  
 و شاہ عبدالقادر صاحب غفر اللہ لہم کے ساتھ برادرزادگی کی نسبت تھی، چونکہ آپ کے والد کا  
 انتقال آپ کی صغر ہی میں ہو گیا تھا اس لیے شاہ عبدالعزیز صاحب نے ان کو اپنے فرزندوں  
 کی طرح پرورش کیا تھا اور اپنی فواہی بھی ان سے منسوب کی تھی۔ ان کی تعلیم و تربیت میں بھی  
 خاص اہتمام ملحوظ خاطر رکھا گیا۔ آپ پندرہ سولہ برس کی عمر میں تحصیل علوم سے فارغ ہو گئے  
 تھے۔ آپ نے علم معقول کی بیشتر کتب پر جوانی تحریر کیے، اور ایک رسالہ منطق میں لکھا۔  
 ایک رسالہ قرۃ العینین فی اثبات رفع یدین تالیف فرمایا۔ اسی طرح متعدد درس لے  
 آپ سے یادگار ہیں۔ اوائل عمر میں چونکہ فیض باطن کے حصول کا بہت خیال تھا اس لیے  
 جناب میر سید احمد صاحب قدس سرہ العزیز کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اعتقاد بہم پہنچا کر  
 اُن سے کسب فیض باطن پر آمادہ ہوئے۔ بعد ازاں سیر کی رفاقت ہی میں مناسک حج ادا  
 کیے اور وہاں سے ہندوستان واپس آکر ہدایت و ارشاد سے خلق اللہ کو راہ راست کھائی  
 و عظ و نصیحت سے اہل غفلت کے کان کھول دیے اور اعلام سنت و ہدیم بنیان شرک و عبث  
 کا آوازہ سب کے کانوں تک پہنچ گیا، بعض لوگوں نے آپ کی مخالفت شروع کی اور دشمنی  
 اذیت ہو گئے، کیونکہ اُن کی طرف سے کچھ لوگ ضعیف العقیدت ہو چلے تھے، لیکن وہ سختی اور

راہِ راست پر تھے، ہدایت و ارشاد سے باز نہ آئے۔ پھر خلق کو یہاں تک اختیارِ سنت نبوی اور ترکِ بدعات و احداث کی توفیق ہوئی کہ لوگ وحدانیت کے رنگ میں رنگے گئے معسودوں کا بازار سرد ہو گیا اور لوگوں نے جان لیا کہ یہ لوگ مخالفین، طمع دنیاوی کی غرض سے ہم کو سبز باغ دکھاتے تھے، خدا کے فضل و کرم سے لوگوں کو نماز کی اس درجہ توفیق ہوئی کہ مسجد جامع میں نمازِ جمعہ کے واسطے ایسی کثرت ہونے لگی جیسی نمازِ عیدین پر عید گاہ میں ہوتی ہے، آپ کا معمول تھا کہ ہر جمعہ اور شنبہ کو مسجد جامع میں وعظ فرماتے تھے۔ بعض جمعہ کو آپ کو بھڑکا دیتے تھے تو وعظ میں ایسی زبردست اور مدلل تقریر فرماتے کہ لوگوں کے تمام شکوک رفع ہو جاتے۔

بعد ازاں آپ نے جہاد کی فضیلت میں تقریریں شروع کر دیں اُنکا یہ اثر ہوا کہ مسلمانوں کا آئینہ باطن مصفا اور مجلی ہو گیا۔ راہِ حق میں وہ ایسے سرگرم ہوئے کہ بے اختیار اُن کے دل میں یہ آرزو پیدا ہوئی کہ اُن کا سر راہِ خدا کی نذر ہو اور اُن کا مال و متاع اعلائے کوا دین محمدی میں صرف ہو چنانچہ اپنے پیر کی طلب پر وہ ملی سے تشریف لے گئے اور باتفاقِ ممدوح جہاد پر کمر باندھ کر کوہستان چلے گئے، وہاں سے اطرافِ ہندوستان میں طلبی کے خطوط بھیجے، اس نواح سے لوگ بکثرت روانہ ہو گئے اور کوہستانوں کے علاوہ صرف ہندوستانی ایک لاکھ سے زائد آپ کی خدمتِ بابرکت میں جمع ہو گئے۔ اور راہِ خدا میں کار نمایاں بردے کا رائے۔ تائیدِ الٰہی سے آپ کا رعب کفار کے دلوں میں ایسا جاگزین ہوا کہ تابِ مقابلہ نہ رکھتے تھے اور نامِ شکر فرار ہو جاتے تھے۔ لیکن قلعہ بالا کوٹ کے نواح میں ہمراہ پیر طریقت اور اکثر مسلمین غزاة، شہید راہِ خدا ہوئے جب اس شکست کی خبر دلی میں آئی تو شاہِ نصیر نے مستحزانه انداز میں ایک طولانی قصیدہ کہا جس کے تین شعر نقل کیے جاتے ہیں

کلام اللہ کی صورت ہوا دل اُنکا سید پارہ نہ یاد آئی حدیث اُنکو نہ کوئی نصِ قرآنی  
ہر نہ کی طرح میدانِ دغا میں چکر کڑی بھولے اگرچہ تھے دُشمنِ شملہ سے وہ شیرِ نیستانی

مولوی صاحب کے طرفدار مجاہدوں کا دلی میں شکر تھا، بہت سے بہادروں نے آکر شاہ صاحب کا گھر گھیر لیا۔ مرزا اخانی کو قوال شہر تھے۔ وہ سنتے ہی دوڑے اور آکر بچا پا۔ شاہ صاحب نے اٹھ کر مذکورہ کو قصیدہ کر دیا اور کو قوال صاحب کا بہت شکریہ ادا کیا۔ اُس میں کا ایک شعر یہ ہے۔  
 نصیر الدین بجا پرہ توستہ طوس کا لیتا نہ ہوتے شمعہ دہلی اگر یاں میرزا حنفی  
 آپ کی تعانیف متحد ہیں، جن میں زیادہ تر متداول تقویت الایمان ہے۔

عبارت ذیل تقویت الایمان سے نقل کی جاتی ہے۔ مولوی امینعلی صاحب اپنے کلام کی تائید میں قرآن پاک اور احادیث نبوی کا برابر حوالہ دیتے جاتے ہیں اور اہل اسلام کے لیے اُس سے زیادہ مدلل اور کوئی تقریر یا تحریر نہیں ہو سکتی جس کی بنیاد کلام پاک اور احادیث رسول پر ہو۔ طرزِ ادب بھی کس قدر دلچسپ اور با اثر ہے، اور معلوم ہوتا ہے کہ ایک دریائے ذخائر اُٹھ اچلا آتا ہے۔ واؤ عطف آج کل کی زبان کے مطابق چند مقامات پر فلفط استعمال کیا گیا ہے اور بعض جگہ بے ترتیبی الفاظ اُس زمانہ کی تحریر کا نشان دے رہی ہے۔

”ہر خاص و عام کو چاہیے کہ اللہ و رسول ہی کے کلام کو تحقیق کریں اور اُسی کو سمجھیں اور اُسی پر چلیں اور اُسی کے موافق اپنے ایمان کو ٹھیک کریں۔ سو منہنا چاہیے کہ ایمان کے دو جزو ہیں۔ خدا کو خدا جاننا اور رسول کو رسول سمجھنا۔ اور خدا کو خدا سمجھنا اسی طرح ہوتا ہے کہ اُس کا شریک کسی کو نہ سمجھے اور رسول کو رسول سمجھنا اس طرح ہوتا ہے کہ اس کے سوائے کسی کی راہ نہ بخیر و اِس پہلی بات کو توحید کہتے ہیں اور اس کے خلاف کو شرک، اور دوسری بات کو اتباعِ سنت کہتے ہیں اور اُس کے خلاف کو بدعت۔ سو ہر کسی کو چاہیے کہ توحید اور اتباعِ سنت کو خوب پکڑے اور شرک و بدعت سے بہت بچے، کہ یہ دونوں چیزیں اصل ایمان میں خلل ڈالتی ہیں اور باقی گناہ اُن سے چھپے ہیں کہ وہ اعمال میں خلل ڈالتے ہیں اور چاہیے جو کوئی توحید اور اتباعِ سنت میں بڑا کامل ہو اور شرک و بدعت سے بہت دور، اور لوگوں کو اِس کی صحبت سے یہ بات حاصل ہوتی ہو اُسی کو اپنا پیروا استاد سمجھے۔ سو اُسی لیے

کئی آیتیں اور حدیثیں کہ جن میں بیان توحید کا اور اتباع سنت کا ہے اور بُرائی شرک و بدعت کی، اس رسالہ میں جمع کیس اور ان آیتوں و حدیثوں کا ترجمہ اُس کے چل معنی کا بیان، و بان ہندی سلیس میں کر دیا، تا عوام الناس اور خاص اس سے فائدہ برابر لیں۔ جس کو اللہ توفیق دے وہ سیدھی راہ پر ہو جاوے اور بتانے والے کو وسیلہ نجات کا ہو دے آمین یا اللہ العالمین۔ اور اس رسالہ کا نام تقویت الایمان رکھا اور اس میں دو باب ٹھہرے پہلے باب میں بیان توحید کا اور بُرائی شرک کی اور دوسرے باب میں اتباع سنت کا اور بُرائی بدعت کی۔

پہلا باب توحید و شرک کے بیان میں۔ - اول سُنا چاہیے کہ شرک لوگوں میں بہت پھیل رہا ہے اور اصل توحید نایاب لیکن اکثر لوگ توحید و شرک کے معنی نہیں سمجھتے اور ایمان کا دعوے رکھتے ہیں، حالانکہ شرک میں گرفتار ہیں۔ سو اول معنی شرک و توحید کے سمجھنا چاہیے تا بُرائی اور بھلائی اُن کی قرآن و حدیث سے معلوم ہو۔ سُنا چاہیے کہ اکثر لوگ پیروں کو اور پیغمبروں کو اور اماموں کو اور شہیدوں کو اور فرشتوں کو اور پیروں کو مشکل کے وقت پُچھتے ہیں اور اُن سے سُرا دیں مانگتے ہیں اور اُن کی سنتیں مانتے ہیں اور حاجت برائی کے لیے اُن کی نذر و نیاز کرتے ہیں اور بلا کے ٹلنے کے لیے اپنے بیٹوں کو اُن کی طرف نسبت کرتے ہیں۔ کوئی اپنے بیٹے کا نام علی بنی رکھتا ہے، کوئی علی بنش، کوئی حسین بنش، کوئی یحییٰ بنش، کوئی مداح بنش، کوئی سالار بنش، کوئی غلام محی الدین، کوئی غلام معین الدین اور اُن کے جینے کے لیے کوئی کسی کے نام کی چوٹی رکھتا ہے، کوئی کسی کے نام کی بدھی پہنتا ہے، کوئی کسی کے نام کے کپڑے پہنتا ہے، کوئی کسی کے نام کی بیڑی ڈالتا ہے، کوئی کسی کے نام کے جانور کرتا ہے، کوئی مشکل کے وقت دو ہائی دیتا ہے، کوئی اپنی باتوں میں کسی کے نام کی قسم کھاتا ہے، غرض کہ جو کچھ ہندو اپنے بتوں سے کرتے ہیں وہ سب کچھ یہ جھوٹے مسلمان انبیاء اور اولیاء سے اور اماموں اور شہیدوں سے اور فرشتوں اور پیروں سے کر گزرتے ہیں اور

دعویٰ مسلمانی کا کیے جاتے ہیں۔ سبحان اللہ یہ منہ اور یہ دعوئے۔ سچ فرمایا ہے اللہ صاحب نے سورہ یوسف میں (اصل میں عربی عبارت موجود ہے لیکن ہم اُسے یہاں ترک کیے دیتے ہیں اور صرف ترجمہ پر اکتفا کرتے ہیں اور آئندہ بھی ایسا ہی کریں گے۔ تنہا) ترجمہ اور نہیں مسلمان ہیں اکثر لوگ مگر کہ شرک کرتے ہیں یعنی اکثر لوگ جو دعوئے ایمان کا رکھتے ہیں سو وہ شرک میں گرفتار ہیں، پھر اگر کوئی سمجھانے والا اُن لوگوں سے کہے کہ تم دعویٰ ایمان کا رکھتے ہو اور افعال شرک کے کرتے ہو سو یہ دونوں راہیں ملائے دیتے ہو، اُس کا جواب دیتے ہیں، کہ ہم تو شرک نہیں کرتے۔ بلکہ اپنا عقیدہ انبیاء و اولیاء کی جناب میں ظاہر کرتے ہیں۔ شرک جب ہوتا کہ ہم اُن انبیاء اور اولیاء کو اور پیروں اور شہیدوں کو اللہ کے برابر سمجھتے سو یوں تو ہم نہیں سمجھتے بلکہ ہم اُن کو اللہ ہی کا بندہ جانتے ہیں اور اُسی کا مخلوق۔ اور یہ قدرت تصرف اُسی نے اُن کو بخشی ہے، اُس کی مرضی سے عالم میں تصرف کرتے ہیں اور اُن کا پکارنا عین اللہ ہی کا پکارنا ہے۔ اُن سے مدد مانگنی عین اُسی سے مدد مانگنی ہے اور وہ لوگ اللہ کے پیارے ہیں جو چاہیں سو کریں۔ اور اُنکی جناب میں ہمارے سفارشی ہیں اور وکیل، اُن کے ملنے سے خدا ملتا ہے اور اُن کے پکارنے سے اللہ کا قرب حاصل ہوتا ہے، اور جتنا ہم اُن کو مانتے ہیں اتنا ہم اللہ سے نزدیک ہوتے ہیں اور اسی طرح کی خرافاتیں کہتے ہیں، اور ان باتوں کا سبب یہ ہے کہ خدا اور رسول کے کلام کو چھوڑ کر اپنی عقل کو دخل دیا اور جھوٹی کمائیوں کے پیچھے پڑے اور غلط غلط رسموں کی سنڈیکڑی، اور اگر اللہ و رسول کا کلام تحقیق کرتے تو سمجھ لینے کہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے بھی کافر لوگ ایسی ہی باتیں کرتے تھے۔ اللہ صاحب نے اُن کی ایک نہ مانی اور اُن پر غصہ کیا اور اُن کو جھوٹا بتایا۔ چنانچہ سورہ یونس میں اللہ صاحب نے فرمایا ہے..... تو جی۔۔۔ اور پوچھتے ہیں ورے اللہ کے ایسی چیز کو کہ نہ کچھ فائدہ دیوے اُن کو نہ کچھ نقصان اور کہتے ہیں یہ لوگ ہمارے سفارشی ہیں اللہ کے پاس کہ کیا بتاتے ہو تم اللہ کو جو نہیں جانتا وہ آسمانوں میں اور نہ زمین میں۔ سو وہ نرالا ہے اُن سے جگہ بیہ شریک

بتاتے ہیں (فائدہ) یعنی جن کو لوگ پکارتے ہیں اُن کو اللہ تعالیٰ نے کچھ قدرت نہیں دی، نہ فائدہ پہنچانے کی نہ نقصان کر دینے کی اور یہ جو کہتے ہیں کہ یہ ہمارے سفارشی ہیں اللہ کے پاس۔ سو یہ بات اللہ نے تو نہیں بتائی۔ پھر کیا تم اللہ سے زیادہ خبردار ہو، سو اُسکو بتاتے ہو جو وہ نہیں جانتا۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ تمام آسمان اور زمین میں کوئی کسی کا ایسا سفارشی نہیں ہے کہ اُسکو مانے اور اُسکو پیکارے تو کچھ فائدہ یا نقصان پہنچے۔ بلکہ انبیاء و اولیاء کی سفارش جو ہے سو اللہ کے اختیار میں ہے، اُن کے پیکارنے نہ پیکارنے سے کچھ نہیں ہوتا اور یہ بھی معلوم ہو کہ جو کوئی کسی کو سفارشی بھی سمجھ کر پوجے وہ بھی مشرک ہوتا ہے اور اللہ صاحب نے سورہ زمر میں فرمایا ہے..... تو سمجھا۔ اور جو لوگ کہہ لہراتے ہیں درے اللہ سے اور حمایتی کہتے ہیں پوجتے ہیں ہم اُن کو سو اسی لیے کہ نزدیک کر دیں ہم کو اللہ کی طرف مرتبہ میں۔ بے شک اللہ حکم کرے گا ان میں، اُس چسپیز میں کہ اُس میں اختلاف ڈالتے ہیں۔ بے شک اللہ راہ نہیں دیتا جھوٹے ناشکرے کو (فائدہ) یعنی جو بات سچی تھی کہ اللہ بندے کی طرف جسکا زیادہ نزدیک ہے۔ سو اُس کو جھوٹ کر جھوٹی بات بنائی کہ اوروں کو حمایتی ٹھہرایا اور یہ جو اللہ کی نعمت تھی کہ وہ محض اپنے فضل سے بغیر واسطے کسی کے سب مُرادیں پوری کرتا ہے اور سب بلائیں مائل دیتا ہے سو اُس کا حق نہ پہچانا اور اُسکا شکر نہ ادا کیا، بلکہ یہ بات اوروں سے چاہنے لگے۔ پھر اُس اُلٹی راہ میں اللہ کی نزدیکی ڈھونڈتے ہیں، سو اللہ ہرگز اُن کو راہیں دیگا اور اس راہ سے ہرگز اُس کی نزدیکی نہ پائیں گے۔ بلکہ جوں جوں اس راہ میں چلیں گے اُس سے دور ہو جاویں گے۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ جو کوئی کسی کو اپنا حمایتی سمجھے گو کہ یہی جانکر کہ اُسکے پوجنے کے سبب سے خدا کی نزدیکی حاصل ہوتی ہے، سو وہ بھی مشرک ہے، اور جھوٹا اور اللہ کا ناشکر اور اللہ صاحب نے سورہ مومنوں میں فرمایا ہے.....

.... تو سمجھا۔ کہہ کون ہے وہ شخص کہ اُس کے ہاتھ میں ہے تصرف ہر چیز کا اور وہ حمایت کرتا ہے اور اُس کے مقابل کوئی حمایت نہیں کر سکتا۔ جو تم جانتے ہو سو وہ بھی کدینکے کہ

اللہ ہے۔ کہ پھر کہاں سے خطی ہو جاتے ہو۔ (فائدہ) یعنی جب کافروں سے بھی پوچھے کہ سارے عالم میں تصرف کس کا ہے اور اُس کے مقابل کوئی حمایتی کھڑا ہو سکے تو وہ بھی یہی کہیں گے کہ یہ اللہ ہی کی شان ہے، پھر اوروں کو ماننا محض خطا ہے۔ (فائدہ) اس آیت سے معلوم ہوا کہ اللہ صاحب نے کسی کو عالم میں تصرف کرنے کی قدرت نہیں دی اور کوئی کسی کی حمایت نہیں کر سکتا۔ اور یہ بھی معلوم ہو کہ پیغمبر خدا کے وقت میں کافر بھی اپنے بتوں کو اللہ کے برابر نہیں جانتے تھے بلکہ اُسی کا مخلوق اور اُسی کا بندہ سمجھتے تھے، اور اُن کو اُس کے مقابل کی طاقت ثابت نہیں کرتے تھے۔ مگر یہی پکارنا اور منیتیں ماننی اور نذر دنیا ز کرنی اور اُن کو اپنا دکیل اور سفارشی سمجھنا بھی اُن کا کفر و شرک تھا جو کوئی کسی سے یہ معاملہ کرے گو کہ اُس کو اللہ کا بندہ و مخلوق ہی سمجھے، سو اب وہی اہل اور وہ شرک میں برابر ہے، سو سمجھنا چاہیے کہ شرک اسی پر موقوف نہیں کہ کسی کو اللہ کے برابر سمجھے اور اُس کے مقابل جانے بلکہ شرک کے معنی یہ کہ جو چیزیں اللہ نے اپنے واسطے خاص کی ہیں اور اپنے بندوں کے ذمہ نشان بندگی کے ٹھہرائے ہیں وہ چیزیں اور کسی کے واسطے کرنی جیسے سجدہ کرنا اور اُس کے نام کا جانور کرنا اور اُسکی منت ماننی اور مشکل کے وقت پکارنا اور ہر جگہ حاضر و ناظر سمجھنا اور قدرت تصرف کی ثابت کرنی سوان باتوں سے شرک ثابت ہو جاتا ہے گو کہ پھر اللہ سے چھوٹا ہی سمجھے اور اُسی کا مخلوق اور اُسی کا بندہ، اور اس بات میں اولیا و انبیاء میں اور جن و سر شیطان میں اور بھوت و پری میں کچھ فرق نہیں یعنی جس سے کوئی یہ معاملہ کرے گا وہ شرک ہو چاہے وہ انبیاء و اولیاء سے خواہ پیروں و شہیدوں سے، خواہ بھوت و پری سے۔ چنانچہ اللہ صاحب نے صیانت پوجنے والوں پر غصہ کیا ہے ویسا ہی ہو داور نصارے پر حالانکہ وہ اولیاء و انبیاء سے معاملہ کرتے تھے۔“

## نہال چند لاہوری

**حالات** آپ کا مولد شاہجہان آباد (دہلی) ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ آپ ترک وطن کر کے لاہور میں اقامت گزیریں ہو گئے ہیں۔ اسی وجہ سے آپ اپنے آپ کو لاہوری لکھتے ہیں ڈاکٹر جان گلکرسٹ کے ماتحت جو شعبہ تصنیف و تالیف کلکتہ میں قائم ہوا تھا۔ آپ بھی وہاں پہنچے اور ایک قصہ کو جو فارسی زبان میں تھا اردو میں ترجمہ کیا اور اس کا نام مذہب عشق معرّف بہ گل بکاؤلی رکھا۔ مذہب عشق تاریخی نام ہے جبکہ اعداد (۱۲۱۷) ہوتے ہیں۔ پس یہ کتاب مسئلہ ہجری میں ترجمہ ہو کر اختتام کو پہنچی، فارسی میں اس قصہ کو شیخ غوث اللہ بنگالی نے لکھا تھا۔ جو غزہ ذی الحجہ ۱۲۱۷ھ ہجری میں فوت ہوا۔ یہ قصہ اب تک تین جون بدل چکا ہے پہلے فارسی تھا۔ نہال چند لاہوری نے اسکو اردو میں لکھا۔ اس کے بعد پنڈت دیانند کشن نے اس کو نظم اردو کا لباس پہنایا۔ اور یہ مثنوی گلزارِ نسیم مقبول خاص و عام ہوئی۔ زیادہ تر لوگ اسکو نظم ہی میں پڑھتے ہیں، اگرچہ نثر کا قصہ بھی سوا سو برس پڑانا ہو گیا ہے تاہم برابر چھپے جاتا ہے اور بازار میں فروخت ہوتا ہے۔ مترجم کے حالات کا پتہ اس سے زیادہ نہیں ملتا جو وہ خود اپنی کتاب مذہب عشق کے ابتدائی صفحات میں (دو چار سطریں) لکھ گئے ہیں۔ چنانچہ وہ سبب تالیف میں لکھتے ہیں:-

”اشرف البلاد کلکتہ میں آب و خورشید کھینچ لائی اور یہ خاکسار کپتان ولورٹ صاحب بہادر کی خدمت میں سابق سے بندگی رکھتا تھا۔ اُن کی دستگیری سے صاحب گلکرسٹ بہادر مدظلہ کے دامن دولت تک دسترس پایا۔ غرض کہ صاحب بہادر کے تفضلات سے بخوبی اس ضعیف کی اوقات بسر ہونے لگی اور امید زیادہ تر ہونے لگی کہ اگر بحجت مددگار رہے اور یہ دامن دولت اپنے ہاتھ ہے تو حشمت قدم کے ساتھ ہے۔ پھر ایک روز خداوندِ نعمت نے ارشاد کیا کہ تاج الملوک اور بکاؤلی کا قصہ فارسی میں ہے، ہندی ریختہ کے محاورہ میں ترجمہ کر کہ تیری یادگار اور مضر خدائی کا موجب اور ہماری خوشنودی کا سبب ہو، چنانچہ اس شخص نے حسب الارشاد فیض بنیاد اپنے

حوصلے کے موافق فلاطوں فطنت ..... مارکوس ولزلی کے عہد میں ترجمہ کیا اور نام اسکا  
مذہب عشق رکھا۔

کتاب کے آخر میں یہ مین شعر درج کیے ہیں، پہلا شعر خاتمہ الکتاب سمجھنا چاہیے اور بقیہ  
دو شعر قطعہ تاریخی خیال کرنے چاہئیں۔

غرض جس طرح سے کیا اُن کو شاد ہماری بھی دے یا الٰہی مراد

یہ قصہ ہوا جب بخوبی مت م تو پھر سنکر تاریخ تھی صبح و شام

یہ ایک ٹی میں نے آواز غیب کہ ہے مذہب عشق تاریخی نام

ان اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ کبھی کبھی آپ فکر سخن بھی کر لیتے تھے، اگرچہ اس فن میں آپ

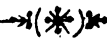
مبتدی معلوم ہوتے ہیں، البتہ نثر آپ خوب لکھتے ہیں۔ نمونہ حسب ذیل ہے۔ میر شیر علی  
افسوس کی اصلاح کے بعد یہ ترجمہ چھپا ہے۔

نمونہ از مذہب عشق ”سمار سرائے کارخانہ سخن اس داستان کی بنا کا حال اس طرح کہتا ہے

کہ تاج الملوک کے غلاموں میں ساعد نام اُس بیابان میں سیر کرتا پھرتا تھا، ناگاہ اُس کی نظر کئی،  
لکڑہاروں پر کہ لکڑیوں کے بوجھ لیے جاتے تھے جا پڑی، اُس نے پوچھا کہ تم کون ہو اور یہ لکڑیاں کہاں  
لیے جاتے ہو۔ انہوں نے جواب دیا کہ ہم شہر شرفستان کے لکڑہارے ہیں۔ یہی ہمارا کسب ہے  
اسی سے ہمارے لڑکے بالے جینے ہیں، دانہ پانی کھاتے پیتے ہیں، اُس نے کہا کہ آج تم یہ گتھے  
سیرے آقا کے بادچی خانہ میں لے چلو، دولت خانہ اُس کا نزدیک ہے، اُس نے اس دیرانہ  
میں ایک منہر آباد کیا ہے۔ واجبی قیمت ملیگی بلکہ ایسا انعام پاؤ گے کہ پھر کہیں اور لکڑیاں بیچنے نہ جاؤ  
اُنہوں نے کہا کہ ہماری تمام عمر اسی کام میں اور اسی بیابان سے لکڑیاں لیجائے گزرتی ہے، لیکن  
آبادی کا یہاں نشان نہ دیکھا، نہ سنا۔ ساعد نے کہا ذرا تم آگے بڑھ کر دیکھو، اگر میرے کہنے  
کا کچھ اثر ظاہر ہو تو بہتر نہیں تو نہ ہمارے پھر آنے کا کوئی مانع نہوگا۔ لکڑہارے انعام کے لالچ  
سے ساعد کے آگے ہو لیے۔ پھر مٹوڑی سی دور جا کر سب ایک بارگی مچا اُٹھے کہ نعوذ باللہ من الشیطان الرجیم

اے میاں! تم ہم کو آگ میں جھونکنے کو لیے جاتے ہو۔ چولے میں جائے انعام اور بھاریں بڑے اکرام۔ بس ہمیں معاف کرو، ہم نے بھربایا۔ ساعد نے کہا یہ شعلہ آتش نہیں، حویلی کے جواہر چمک رہے ہیں، تم ہرگز اندیشہ نہ کرو اور میرے ساتھ چلے آؤ، وہ اُس کے کہنے سے کچھ اور بھی بڑھے۔ آگے ساری زمین سونے کی نظر آئی۔ سب نے اُسکی بات سچی پائی، قدم اٹھائے بیدھڑک چلے۔ آخر وہ حضو میں اُن کو لے گیا تاج الملوک نے ایک ایک تھان میں قیمت ہر ایک کو دیکر رخصت کیا اور فرمایا کہ اگر تم یہاں آیا کرو تو اس سے دنا ہر روز پایا کرو مگر ہار دے جب پہلے دن ایسا انعام پایا اور آئندہ کی بھی اُمید بندھی تو اپنا وطن چھوڑ کر ہر ایک وہاں آ رہا یہ خبر اُن کے ہمسایہ میں پہلی اور جا بجا شہر ہوئی غرض جو کوئی شہر کے دیکھنے کو جاتا۔ ہرگز وہاں سے پھر کر گھر نہ آتا اور وہیں رہتا، کو تو ال شرفستان کا رعیت کے بھاگنے کی خبر روز وزیر کے حضو میں کہتا چنانچہ ایک دن اُس نے خبر دی کہ آج رات ہزار گھبراہل حوفہ کے خالی ہوئے اور وہ بھاگ گئے، وزیر نے کہا کہ کچھ یہ بھی تو جاننا ہے کہ کہاں جاتے ہیں۔ تب وہ بولا کہ غلام نے سنا ہے کہ کسی نے درندوں کے جنگل میں دس کوس تک سونے کی زمین بنا کر اُس پر اس طرح کا شہر آباد کیا ہے اور ایک قصر اور باغ بھی جواہر کا ایسا بنایا ہے کہ روئے زمین پر دوسرا نہیں ہے۔ جو دیکھتا ہے یہ مطلع پڑھتا ہے۔

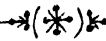
اگر فردوسِ بر روئے زمین ست      ہمیں ست وہیں ست وہیں ست



## میرزا کاظم علی جوان

آپ کا نام کاظم علی اور جوان تخلص ہے۔ آپ بھی دہلی کے تھے۔ بعد ازاں لکھنؤ میں آئے اور وہاں سے سترہ سالہ عمر میں کلکتہ کے فورٹ ولیم کالج میں آئے۔ آپ نے سترہ سالہ میں شکنتلا کا قصہ اردو میں لکھا اور اُس کا نام شکنتلا نامک رکھائی کتاب سترہ سالہ میں چھپ کر

شائع ہوئی۔ نواز کبیشہ نے جو برج بھاکا میں (۱۷۷۷ء) شکنتلا کی کہانی لکھی تھی اُس کا یہ ترجمہ ہے۔ آپ نے ایک بار وہ ماسہ بھی لکھا ہے، اور اس میں ہندو سنانوں کے تئوہاروں کا ذکر ہے، جس کا نام دستور ہند ہے اور جو ۱۸۱۲ء میں چھپا، افسوس ہے آپ کی دونوں کتابیں دستیاب نہیں ہوئیں، لہذا نمونہ پیش کرنے سے معذوری ہے۔ جو ان نے تاریخ فرشتہ سے خاندان بھٹی کا ترجمہ بھی ہندوستانی میں کیا (۱۸۰۹ء) نیز للوال کی شرکت میں سنگھاسن تپسی کا ترجمہ ہندوستانی زبان میں کیا (۱۸۰۵ء) +



## سری للوال کوی

سری للوال کوی گجرات کا برہمن تھا جو شمالی ہند میں آکر آباد ہو گیا تھا، اُس نے فورٹ ولیم کالج کی نگرانی میں ہندی کی بعض کتابیں مثلاً پریم ساگر، راج منتی و لطائف ہندی ترجمہ یا تالیف کیں۔ سنگھاسن تپسی، سری للوال اور کاظم علی جو ان نے ملکر ۱۸۰۷ء میں لکھی، جو آدھی اردو آدھی ہندی ہے۔

پریم ساگر بازار میں فروخت ہوتی ہے۔ لیکن سری للوال کی اصل کتاب نہیں ملتی، منشی نوٹکشور کے مطبع سے آجکل کی زبان میں شائع ہوئی ہے۔ لہذا اُس کا اقتباس اصل کتاب کا اقتباس نہیں کہلا جا سکتا۔ اس لیے ہم نے موجودہ پریم ساگر کا نمونہ نہیں دیا۔ کیونکہ وہ ہمارے مقصد کے اظہار میں کوئی مدد نہیں دے سکتا۔

سری للوال نے فصیح ہندی نثر کی بنیاد ڈالی اور متعدد کتابیں لکھیں اور فی الحقیقت ہندی نثر کے حق میں سیجائی کی۔ اگرچہ آپ کا سارا کام ہندی نثر سے متعلق ہے لیکن یہاں آپ کا ذکر اس وجہ سے کیا گیا کہ ہندی سے جو بعض ترجمے اردو میں ہوئے اُن میں آپ نے مدد دی۔ مثلاً شکنتلا نامک کے ترجمے میں مرزا کاظم علی جو ان کو آپ سے مدد ملی۔ اسی طرح منظر علی والا اور آپ نے بن کر

بیٹال بھیجی جس کی زبان اردو ہندی کا خوبصورت سیل ہے۔ نیز آپ نے دلا کو بہت سی باتوں سے ماحول کے قصبے کے ترجمے اور نالیف میں بہت مدد دی۔ آپ نے لطائف ہندی جس کا ذکر اوپر کیا گیا مرتب کی، اُس میں پُر لطف قصبے کہانیاں، لطیفے، اشعار، متل و جگت وغیرہ درج ہیں، یہ کتاب ہندوستانی اور ہندی دونوں زبان میں ہے کتاب کے آخر میں ہندوستانی انگریزی الفاظ کی فرہنگ بھی ہے (منسلع)۔



## مولوی اکرام علی

**حالات** آپ نے منسلع میں رسائل اخوان الصفا میں سے ایک رسالہ کا ترجمہ عربی سے اردو میں کیا جس میں شاہ اجنہ کے سامنے انسان و حیوان کا جھگڑا درپیش ہے کہ ہم دونوں میں کون افضل ہے؟ یہ بخلاؤں رسائل کے ہے جو بصیر کی مشہور رسوائی اخوان الصفا کے اہتمام سے لکھے گئے تھے، آپ کلکھہ مولوی تراب علی صاحب اپنے بھائی کی طلبی پر گئے تھے اور وہاں سٹر ابراہیم لاکٹ نے فورٹ ولیم کالج میں ملازم کر دیا تھا۔ چنانچہ کپتان جان ولیم ٹیلر کے ایاد سے رسالہ نکال کر ترجمہ کیا کتاب کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:- ”فرمایا کہ رسالہ اخوان الصفا کا انسان و بہائم کے مناظرے میں ہے تو اس کا زبان اردو میں ترجمہ کر لیکن نہایت سلیس کہ الفاظ مغلط اُس میں نہ ہو دیں بلکہ اصطلاحات علمی اور خطبے بھی اُس کے کہ تکلف سے خالی ہنیں میں قلم انداز کر مرثیہ خلاصہ مضمون مناظرے کا چاہیے۔ راقم نے بموجب فرمانے کے فقط حامل مطلب کو محاورہ اردو میں لکھا، خطبوں کو نکال ڈالا اور اکثر اصطلاحات علمی کہ مناظرے سے ان کو علاوہ نفعاً ترک کیں مگر بعض خطبے اور اصطلاحات ہندی وغیرہ کہ اصل مطلب سے متعلق تھے باقی رکھے..... مصنفین اس کے ابو سلمان، ابو الحسن، ابو احمد وغیرہ دس آدمی باتفاق یکدیگر بصرے میں رہتے تھے اور ہمیشہ علم و دین کی تحقیق میں اوقات اپنی بسر کرتے چنانچہ

اکادون رسالے تصنیف کیے بیشتہ علوم عجیبہ وغریبہ ان میں لکھے۔ یہ ایک رسالہ ان میں سے  
 انسانوں اور حیوانوں کے مناظرے میں ہے طریقہ کی دلائل عقلی و نقلی اس میں بخوبی بیان کیں  
 آخر بہت قیل و قال کے بعد انسان کو غالب رکھا، اور غرض انکو اس مناظرے سے فقط کلام  
 انسانی بیان کرتا ہے۔ چنانچہ اس رسالے کے آخر میں لکھا ہے کہ جن دفعوں میں انسان حیوان پر غالب  
 آئے وہ علوم معارف الٰہی ہیں کہ ان کو جتنے اکادون رسالے میں بیان کیا ہے لہذا اس رسالے میں  
 مقصود یہی تھا کہ حقائق و معارف حیوانات کی زبانی بیان کیجیے تاکہ غافلوں کو اس کے دیکھنے سے کلام  
 حاصل کرنے کے واسطے رغبت ہو، ترجمہ اس رسالے کا..... نواب گورنر جنرل لارڈ ونٹو بہادر  
 دام اقبالہ کے عہد حکومت میں ۱۲۲۵ھ ہجری اور ۱۸۰۸ء میں مرتب ہوا۔

رسالہ اخوان الصفا اور ہمارے پیش نظر ہے ۱۸۰۸ء میں مطبع فنی نو لکھنؤ سے شائع ہوا تھا  
 غالباً اب عرصہ سے یہ کتاب چھپی بند ہو گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دہلی اور لکھنؤ کے کتب فروش اس  
 کتاب کا نام سنکر کانوں پر ہاتھ دھرتے ہیں، خیر ہم اپنے ایک دوست کے ممنون ہیں جن کی کوشش  
 سے یہ رسالہ ہمیں مل گیا۔ مضمون نہایت دلچسپ ہے۔ ایک بار پڑھنا شروع کیجیے تو بغیر ختم کیے کتاب  
 کو چھوڑنا مشکل ہو جائے، عبارت بھی صاف اور سلیس ہے جیسا کہ دیا جی میں خود مترجم نے کہا  
 ہے مغلک اور غریب الفاظ سے پرہیز کیا گیا ہے۔ کتاب عام فہم ہے، اور اس قابل ہے کہ دوبارہ  
 چھپے اور ملک کے ہر گوشہ میں اس کے مضمون سے لوگ استفادہ حاصل کریں۔

ذیل میں چند صفحات بطور نمونہ نقل کیے جاتے ہیں:-

### فصل لکھیوں کے سردار کے احوال میں

نمونہ از رسالہ ”انسان جس وقت اپنے کلام سے فارغ ہوا، بادشاہ نے حیوانوں کی طرف خیال  
 کیا، ناگاہ ایک مہین آواز کان میں پہنچی۔ دیکھا تو لکھیوں کا سردار عیوب سامنے  
 اُڑتا اور خدا کی تسبیح و تہلیل میں نغمہ سرائی کرتا ہے، پوچھا تو کون ہے؟ اس نے کہا میں خشرات الارض

کا بادشاہ ہوں۔ فرمایا تو آپ کیوں آیا جس طرح اور حیوانوں نے اپنے قاصد اور وکیل بھیجے، تو نے اپنی رعیت اور فوج سے کسی کو کیوں نہ بھیجا، اُس نے کہا میں نے اُن کے حال پر شفقت اور مہربانی کی تاکہ کسی کو کچھ تکلیف نہ پہنچے۔ بادشاہ نے کہا یہ وصف اور کسی حیوان میں نہیں ہے۔ تجھ میں کیونکر ہوگا؟

کہا مجھ کو اللہ تعالیٰ نے اپنی عنایت و مرحمت سے یہ وصف عطا کیا۔ اس کے سوا اور بھی بہت سی بزرگیاں اور خوبیاں بخشی ہیں۔ بادشاہ نے کہا بزرگیاں اپنی بیان کر کہ ہم بھی معلوم کریں۔ اُس نے کہا اللہ تعالیٰ نے مجھ کو اور میرے جد و آبا کو بہت سی نعمتیں بخشیں، کسی حیوان کو اس میں شریک نہیں کیا۔ چنانچہ ملک دنیوت کا مرتبہ مجھ کو بخشا اور ہمارے جد و آبا کو نسل در نسل اس کا ورثہ پہنچایا۔ یہ دو نعمتیں اور کسی حیوان کو نہیں دیں۔ اس کے سوا اللہ تعالیٰ نے ہم کو علم ہندسہ اور بہت سی نعمتیں سکھائیں کہ اپنے مکانات کو نہایت خوبی سے بناتے ہیں، تمام جہان کے پھل اور پھول ہم پر چلا کیے۔ بے غلش کھاتے ہیں، ہمارے لعاب سے شہد پیدا کیا کہ جس سے تمام انسانوں کو شفا حاصل ہوتی ہے، اس مرتبے پر ہمارے آیات قرآنی ناطق ہیں اور ہماری صورت دسیرت اللہ تعالیٰ کی قدرت پر عاقلوں کے واسطے دلیل ہے کیونکہ خلقت ہماری نہایت لطیف ہے اور صورت بہت عجیب ہے اس واسطے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے جسم میں تین جوڑ رکھے ہیں، بیچ کے جوڑ کو مرج کیا، نیچے کے دھڑ کو لمبا، سر کو مدور بنایا۔ چار ہاتھ پاؤں مانند اضلاع شکل مسدس کے نہایت خوبی سے، مناسب مقدار کے بنائے جنکے سبب نشست و برخاست کرتے ہیں اور گھر اپنے اس خوش اسلوبی سے بناتے ہیں کہ ہوا اُن میں ہرگز نہیں جاسکتی کہ جس کے باعث ہم کو یا ہمارے بچوں کو تکلیف پہنچے، ہاتھ پاؤں کی قوت سے درخت کے پھل، پتے پھول جو کچھ پاتے ہیں اپنے مکانات میں جمع کر رکھتے ہیں۔ شانوں پر چار بادوبنائے جن کے باعث اُڑتے ہیں، اور ہمارے ڈنک میں کچھ زہر بھی پیدا کیا ہے کہ اس کے سبب دشمنوں کے شر سے محفوظ رہتے ہیں اور گردن پتلی بنائی کہ داہنے بائیں سر کو بخوبی پھیرتے ہیں۔ اور اُس کے دونوں طرف دو آنکھیں روشن عطا کی ہیں کہ اُن کی روشنی سے ہر ایک چیز کو دیکھتے ہیں اور منہ بھی بنایا ہے کہ جس سے کھانے کی

لذت جانتے ہیں۔ وہ ہر تہ بھی دیے جن کے سبب کھانے کی چیزیں جمع کرتے ہیں اور ہمارے سپٹ  
 میں قوت ہائے ایسی بخشنے ہے کہ وہ دوطبات کو شہد کر دیتی ہے اور یہی شہد واسطے ہمارے اور اولاد کے  
 غذا ہے جس طرح چار پاؤں کی پستان میں قوت دی ہے کہ اُس کے سبب خون تسلی ہو کر دودھ ہو جاتا  
 ہے۔ غرضکہ یہ تین اللہ تعالیٰ نے ہم کو صلا کی ہیں، اس کا شکر کہاں تک کریں اسی واسطے میں نے رعیت  
 کے معاملہ پر شفقت و مہربانی کر کے اپنے اوپر تکلیف روا رکھی، اُن میں سے کسی کو نہ بھیجا جس وقت یعسوب  
 اپنے کلام سے غرض ہوا۔ بادشاہ نے کہا آفرین۔ تو نہایت فصیح و بلیغ ہے۔ سچ ہے کہ تیرے سوا انہیں  
 اللہ تعالیٰ نے کسی جو ان کو نہیں بخشیں۔ بعد اس کے پوچھا کہ تیری رعیت دسپاہ کہاں ہے۔ اُس نے  
 کہا، ٹیلے، پہاڑ و دشت پر جہاں سبیتا پائے ہیں رہتے ہیں اور بعض آدمیوں کے ملک میں جا کر  
 اُن کے گمروں میں سکونت اختیار کرتے ہیں۔ بادشاہ نے پوچھا اُن کے ہاتھ سے کیونکر سلاست رہتے  
 ہیں کہا بیشتر اُن سے چمپکر اپنے نہیں بچاتے ہیں مگر کبھی جو وہ قابو پاتے ہیں تکلیف دیتے ہیں بلکہ اکثر  
 چھتوں کو توڑ کر بچوں کو مار ڈالتے ہیں۔ اور شہد نکال کر آپس میں کھا لیتے ہیں۔ بادشاہ نے پوچھا پھر تم  
 اس ظلم پر اُن کے کیوں صبر کرتے ہو، اُس نے کہا ہم یہ ظلم سب اپنے اوپر گوارا کرتے ہیں اور کبھی جہز  
 ہو کر اُن کے ملک سے نکل جاتے ہیں۔ اُس وقت وہ صلح کے واسطے بہت جیلے پیش کرتے ہیں،  
 طرح طرح کی سوغات، عطریات و خبثات وغیرہ بھیجتے ہیں۔ طبل اور دف بجاتے ہیں۔ غرضکہ انواع و اقسام  
 کے تحفے مختلف دیکر ہم کو راضی کرتے ہیں۔ ہمارے مزاج میں شرف و فساد نہیں ہے۔ ہم بھی اُن سے  
 صلح کر لیتے ہیں۔ اُن کے یاں پھر چلے آتے ہیں جس پر بھی ہم سے راضی نہیں ہیں۔ بغیر دلیل و حجت  
 کے دعوے کرتے ہیں کہ ہم مالک یہ غلام ہیں۔

فصل جنوں کی اپنے بادشاہوں اور سرداروں کی اطاعت کے بیان میں  
 بعد اسکے یعسوب نے بادشاہ سے پوچھا کہ جن اپنے بادشاہ و رئیس کی اطاعت کس طرح کرتے ہیں  
 اس سوال کو بیان کیجئے۔ بادشاہ نے کہا، یہ سب اپنے سردار کی اطاعت و فرمانبرداری بخوبی کرتے ہیں،  
 اور بادشاہ جو حکم کرتا ہے، اسکو بجا لاتے ہیں یعسوب نے کہا، اس کو مفصل بیان کیجئے۔ بادشاہ نے

کہا جنوں کی قوم میں نیک و بد اور مسلمان و کافر ہوتے ہیں جس طرح انسانوں میں ہیں، جو کہ نیک ہیں وہ اپنے رئیس کی اطاعت و فرمانبرداری اس قدر کرتے ہیں کہ آدمیوں سے بھی نہیں چوسکتی، اس واسطے کہ اطاعت و فرمانبرداری جنات کی، مثل ستاروں کے ہے، آفتاب ان میں بمنزل بادشاہ ہے اور سب ستارے بجائے فوج و رعیت کے ہیں۔ چنانچہ صریح سہ سالار مشتری قاضی زحل خزانچی، عطارد دوزیر، زہرہ حرم، مہتاب ولیعہد ہے اور ستارے گویا فوج و رعیت ہیں، اس واسطے کہ سب آفتاب کے تابع ہیں۔ اُسی کی حرکت سے حرکت کرتے ہیں، وہ جو ٹہر رہا ہے سب متوقف ہو جاتے ہیں، اپنے معمول و حد سے تجاوز نہیں کرتے، یعسوب نے پوچھا کہ ستاروں نے یہ خوبی اطاعت و انتظام کی کہاں سے حاصل کی بادشاہ نے کہا یہ فیض اُن کو فرشتوں سے حاصل ہے کہ وہ سب اللہ تعالیٰ کی فوج ہیں اور اُسکی اطاعت کرتے ہیں یعسوب نے کہا فرشتوں کی اطاعت کس طور پر ہے، کہا جس طرح اس خمسہ، نفس، ناطقہ کی اطاعت کرتے ہیں، تہذیب و تادیب کے محتاج نہیں یعسوب نے کہا اسکو مفضل فرمائیے، بادشاہ نے کہا کہ حواس خمسہ نفس ناطقہ کے واسطے، موسما کی دریافت معلوم کرتے ہیں۔ محتاج امر و نہی کے نہیں ہیں جس شے کے دریافت کرنے کے لیے وہ متوجہ ہوتا ہے، وہ بے تامل و بلا تاخیر اُس کو دوسری شے سے متنازع کر کے نفس ناطقہ کو پہنچا دیتے ہیں، اسی طرح فرشتے خدا کی اطاعت و فرمانبرداری میں مصروف رہتے ہیں، جو حکم ہوتا ہے اُسکو نافرمانی بجالاتے ہیں اور جنوں میں جو کہ بد ذات اور کافر ہیں، ہر چند کہ قرار واقعی بادشاہ کی اطاعت نہیں کرتے مگر وہ بھی بد ذات انسانوں سے بہتر ہیں۔ اس واسطے کہ بعض جنوں نے باوجود کفر اور گمراہی کے حضرت سلیمان کی اطاعت میں قصور نہ کیا۔ ہر چند کہ اُنہوں نے عمل کے زور سے بہت رنج و مصیبتیں پہنچائیں پر یہ اُن کی فرمانبرداری میں ثبات قدم رہے اور کبھی کوئی آدمی کسی دیرانے یا جھگڑ میں جتن کے خون سے کچھ دعا اور کلام پڑھتا ہے، جب تک اُس مکان میں رہتا ہے کسی طرح کا رنج اُس کو نہیں دیتے۔ اگر بحسب اتفاق کوئی جن کی عورت یا مرد پر مسلط ہو اور کسی عامل نے وہاں اُسکی رہائی کے واسطے جنوں کے رئیس کی حضرات اور دعوت کی فی الفور بھاگ جاتے ہیں اُسکے

سوا ان کے حسن اطاعت پر یہ دلیل ہے کہ ایک پیغمبر آخرا زمان صلی اللہ علیہ وسلم کسی مکان میں قرآن پڑھتے تھے، وہاں جنوں کا گزر ہوا۔ سنتے ہی سب کے سب سلمان ہوئے اور اپنی قوم میں جا کر کتنوں کو اسلام کی دعوت کر کے نعمت ایمان سے بہرہ اندوز کیا چنانچہ چند آیات قرآنی اس مقدمے پر ناطق ہیں۔ انسان ان کے بالکل عکس ہیں طبیعتوں میں ان کی شرک و نفاق بھرا ہوا سراسر متکبر و مغرور ہوتے ہیں۔ بیشتر اخذ منفعت کے واسطے طریق ہدایت سے منحرف ہو کر مشرک و مرتد ہو جاتے ہیں ہمیشہ روئے زمین پر قتال و جدال میں مصروف رہتے ہیں بلکہ اپنے پیغمبروں کی بھی اطاعت نہیں کرتے، باوجود معجزے اور کرامت کے صاف منکر ہو جاتے ہیں۔ اگر کبھی ظاہر میں اطاعت کرتے ہیں، پر دل ان کا شرک و نفاق سے خالی نہیں ہے۔ از بسکہ جاہل و گمراہ ہیں، کسی بات کو نہیں سمجھتے جس پر بھی یہ دعویٰ ہے کہ ہم مالک اور سب ہمارے غلام ہیں۔ انسانوں نے جو دیکھا کہ بادشاہ کھیوں کے رئیس سے ہمکلام ہو رہا ہے، کہنے لگے نہایت تعجب ہے، کہ بادشاہ کے نزدیک حشرات الارض کے رئیس کا یہ رتبہ ہے کہ کسی حیوان کا نہیں جنوں کی قوم سے ایک حکیم نے کہا۔ اس بات کا تم تعجب نہ کرو اس واسطے کہ عیسوی کھیوں کا سردار اگرچہ جسم میں چھوٹا اور منحنی ہے لیکن نہایت عاقل و دانا اور تمام حشرات الارض کا رئیس و خطیب ہے جتنے حیوان ہیں سب کو ریاست و سلطنت کے احکام تعلیم کرتا ہے اور بادشاہوں کا یہی معمول ہے کہ اپنے ہمجنسوں سے جو کہ سلطنت و ریاست میں شریک ہیں ہمکلام ہوتے ہیں اگرچہ وہ شکل و صورت میں مخالف ہو دیں۔ یہ خیال اپنے دل میں نہ لاؤ کہ بادشاہ کسی غرض و مطلب کے واسطے ان کی طرفداری و رعایت کرتا ہے۔ القصد بادشاہ نے انسانوں کی طرف متوجہ ہو کر کہا کہ حیوانوں نے تمہارے ظلم کا جو کچھ شکوہ بیان کیا سب تم نے سنا اور تم نے جو دعویٰ کیا اس کا بھی جواب انہوں نے دیا اب جو کچھ تم کو کہنا باقی ہو اسکو بیان کرو، آدمیوں کے وکیل نے کہا کہ ہم میں بہت خوبیاں اور بزرگیاں ہیں کہ وہ ہمارے صدق و دعویٰ پر دلالت کرتی ہیں۔ بادشاہ نے کہا انہیں بیان کرو۔ رومی نے کہا کہ ہم بہت سے علوم اور حقیقتیں جانتے ہیں،

دانائی اور تدبیر میں سب حیوانوں سے غالب ہیں۔ دنیا اور آخرت کے امور بخوبی سرانجام کرتے ہیں، اس سے یہ معلوم ہوا کہ ہم مالک اور حیوان ہمارے غلام ہیں۔ بادشاہ نے حیوانوں سے کہا، اس نے جو اپنی فضیلتیں بیان کیں تم اس کا جواب کیا دیتے ہو۔ حیوانوں کی جماعت نے یہ بات سن کر سر جھکا لیا، کسی نے کچھ جواب نہ دیا۔ مگر بعد ایک گھڑی کے مکھیوں کے وکیل نے کہا کہ یہ آدمی گمان کرتا ہے کہ ہم بہت علوم اور تدبیریں جانتے ہیں جبکہ سبب ہم مالک اور حیوان ہمارے غلام ہیں، اگر آدمی فکر و تامل کریں تو معلوم ہو کہ ہم اپنے امور میں کس طور پر انتظام و بندوبست کرتے ہیں۔ دانائی و فکریں ان سے غالب ہیں، علم ہندسہ میں یہ ہمارت رکھتے ہیں کہ بغیر مسطر اور پرکار کے انواع و اقسام کے دائرے اور شکلیں مثلث اور مربع کیسے بنتے ہیں، اپنے گھروں میں طرح طرح کے زاویے بناتے ہیں۔ سلطنت و ریاست کے قاعدے آدمیوں نے بھی ہم سے سیکھے، اس واسطے کہ ہم اپنے یہاں دربان اور چوکیدار متعین کرتے ہیں کہ ہمارے بادشاہ کے سامنے بغیر حکم کے کوئی آئے نہیں پاتا۔ درختوں کے پتوں سے شہنشاہی کر جمیع کرتے ہیں اور فراغت سے اپنے گھروں میں بیٹھ کر بل بچوں کے ساتھ کھاتے ہیں، جو کچھ ہمارا محبوب بنا رہتا ہے، یہ سب آدمی اُسکو نکال کر اپنے تصرف میں لاتے ہیں۔ یہ ہنر ہم کو کسی نے تعلیم نہیں کیے مگر اللہ کی طرف سے ہم کو الہام ہوتا ہے کہ بغیر مدد اور اعانت اُس کے ہم اتنے ہنر جانتے ہیں، اگر انسانوں کو یہ گھمنڈ ہے کہ ہم مالک اور حیوان ہمارے غلام ہیں تو ہمارا جھوٹا کیوں کھاتے ہیں۔ بادشاہوں کا یہ طریق نہیں ہے کہ غلاموں کا جھوٹا کھا دیں اور یہ اکثر امور میں ہمارے محتاج رہتے ہیں، ہم کسی امر میں ان سے احتیاج نہیں رکھتے۔ پس یہ دعویٰ بے دلیل ان کو نہیں پہنچتا ہے۔ اگر چیونٹی کے احوال پر یہ آدمی نگاہ کرے کہ باوجود چھوٹے جسم کے کیونکر زمین کے نیچے طرح طرح کے مکان پیدا کرتی ہے، کیسی ہی سیلابی ہو پانی اُن میں ہرگز نہیں جاتا۔ اور کھانے کے لیے غلہ جمع رکھتی ہے، اگر کبھی اُس میں سے کچھ بھیک جاتا ہے نکال کر دھوپ میں سکھاتی ہے جن دانوں میں احتمال جینے کا ہوتا ہے اُن کے چھلکے دور کر کے دوسرے کو ڈالتی

ہے۔ گرمیوں میں بہت چیزیں قلعے کے قافلے جمع ہو کر قوت کے واسطے ہر ایک طرف جاتی ہیں، اگر کسی چیز کو کہیں کچھ نظر آیا اور گرنی کے سبب اُٹ نہ سکا۔ تو ٹوٹا اُس میں سے لیکر اپنے جمع میں آکر خبر کرتی ہے، اُن میں جو آگے بڑھتی ہے وہ اُس چیز کے کچھ ٹوٹا پہچان کے واسطے لیکر وہاں جا پہنچتی ہے۔ پھر سب جمع ہو کر کس محنت و مشقت سے اُس کو اُٹھاتی ہیں۔ اگر کسی چیز نے محنت میں سستی کی اُس کو مار کر نکال دیتی ہیں۔ پس اگر یہ آدمی تامل کرے تو معلوم ہو کہ چیزیں کیا علم و شعور رکھتی ہیں۔ اسی طرح ٹڈی جبکہ فصل ریح میں کھاپی کر سوتی ہوتی ہے کسی نرم زمین میں جا کر گڑھا کھود کر اندادیتی ہے اور اُس کو مٹی سے چھپا کر آپ اُڑ جاتی ہے، جب اُسکی موت کا وقت آتا ہے طائر کھا جاتے ہیں یا گرمی سردی کی کثرت سے آپ ہلاک ہو جاتی ہے، دوسرے برس پھر فصل ریح میں جن دنوں ہوا معتدل ہوتی ہے اُس دن سے ایک چھوٹا بچہ کیرے کی مانند پیدا ہو کر زمین پر چلتا اور گھاس چرتا ہے جس وقت پر اُس کے نکلنے ہیں اور کھاپی کر موتا ہوتا ہے، یہ بھی دستور سابق اندادیکر زمین میں چھپا دیتا ہے۔ غرض اسی طور سال بال بچے پیدا ہوتے ہیں۔ اسی طرح ریشم کے کیرے کہ بیشتر ہارڈوں کے درختوں پر خصوصاً قوت کے درخت پر رہتے ہیں۔ ایام بہار میں جبکہ خوب سوتے ہوتے ہیں، اپنے لعاب کو درخت پر تن کر بارام تمام اُس میں سوتے ہیں جس وقت جاگتے ہیں اسی حال میں اندے دیکر آپ نکل جاتے ہیں، اُن کو تو طائر کھا لیتے ہیں، یا آپ خود بخود گرمی یا سردی سے مر جاتے ہیں اور اندھے سال بھر بچھا طت اُس میں رہتے ہیں، دوسرے سال اُن میں بچے پیدا ہو کر درخت پر چلتے پھرتے ہیں۔ جب یہ تازے اور توانا ہوتے ہیں اسی طور پر اندے دیکر بچے پیدا کرتے ہیں، اور بھڑیں بھی دیواروں اور درختوں پر چھپتے بنا کر اُن میں اندے بچے دیتی ہیں مگر یہ کھانے کے واسطے کچھ جمع نہیں کرتی ہیں۔ روز روز اپنی قوت و خونڈہ لیتی ہیں اور جاڑے کے دنوں میں غاروں یا گڑھوں میں چھپ کر مر جاتی ہیں پرست اُن کا تمام جاڑوں بھر وہاں پڑا رہتا ہے، ہرگز سڑنا کھنا نہیں، پھر فصل ریح میں خدا کی قدرت سے

اُن میں روح آجاتی ہے، بدستور اپنے اپنے گھر بنا کر انڈے بچے پیدا کرتی ہیں۔ غرض اسی طرح تمام حشرات الارض اپنے بچوں کو پیدا کر کے پرورش کرتے ہیں، فقط شفقت و مہربانی سے یہ نہیں کہ اُن سے کچھ خدمت کی توقع رکھتے ہیں۔ بچلات آدمیوں کے کہ وہ اپنی اولاد سے نیکی اور احسان کے امیدوار رہتے ہیں۔ سخاوت اور جو دکشیوہ بزرگوں کا ہے، ہرگز اُن میں نہیں۔ پھر کس چیز سے ہم پر فخر کرتے ہیں اور کبھی، مجھ، ڈانس وغیرہ کا انڈے دیتے اور اپنے بچوں کی پرورش کرتے اور گھربناتے ہیں، صرف اپنے فائدہ کے واسطے نہیں بلکہ اس لیے کہ بعد اُن کے مرنے کے اور کیرٹے آکر آرام پاویں کیونکہ اُن میں سے ہر ایک کو اپنی موت کا یقین کامل حاصل ہے جبکہ موت کے دن پورے ہوتے ہیں، رمضانہندی اور خوشی سے خود فنا ہو جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنی قدرت سے پھر دوسرے سال پیدا کرتا ہے، غرض کہ یہ کسی حال میں اس کا انکار نہیں کرتے جس طرح بعض آدمی لعنت و قیامت سے منکر ہیں۔ اگر آدمی ان حیوانوں کا احوال معلوم کریں کہ یہ اپنی محاسن اور معاد میں ان سے زیادہ تدبیریں جانتے ہیں یہ فخر نہ کریں کہ ہم مالک اور حیوان ہمارے غلام ہیں۔

## فصل

جس گھڑی کھیلوں کا وکیل اس کلام سے فارغ ہوا، جنوں کے بادشاہ نے ہدایت خوش ہو کر اُسکی تعریف کی اور انسانوں کی جماعت کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا کہ اس نے جو کہا سب سنا ستے۔ اب ہمارے نزدیک کوئی جواب باقی ہے۔ اُن میں سے ایک شخص اعرابی نے کہا کہ ہم میں سب ہی فضیلتیں اور نیک خصلتیں ہیں جن سے دعوے ہمارا ثبات ہوتا ہے۔ بادشاہ نے کہا، اُنہیں بیان کرو۔ کہا کہ زندگی ہماری بہت عیش سے گزرتی ہے، انواع و اقسام کی نعمتیں کھانے پینے کی ہم کو میسر ہیں حیوانوں کو وہ نظر بھی نہیں آتیں۔ میوہوں کا مغز اور گودا ہمارے کھانے میں آتا ہے، پوست اور گٹھلی یہ کھاتے ہیں۔ اس کے سوا طرح طرح کے کھانے، شیر مال، باقر خانی، گاؤ دیدہ، گاؤ زبلاں، کلیجے، مطبخ، زیر بربیل، مرغ، شیر، برنج، کباب، قورما، بورانی، فرنی، دودھ، دہی، گھی، قسم قسم کی مٹھائی، حلوا سوہن، جلیبی، لڈو، پریٹے، برنی، امرتی، لوزیات وغیرہ کھاتے ہیں بقیہ

طبع کے واسطے تاج، رنگ، ہنسی، بچل، قسے کہانی میسر ہیں۔ لباس فاخرہ اور زیور طرح بطرح کے پہنتے ہیں۔ مند، قالین، چاندنی، جاجم اور بہت سے فرش و فردش بچھاتے ہیں، جیوانوں کو یہ سامان کہاں میسر ہیں؟ ہمیشہ جنگل کی گھاس کھاتے ہیں اور رات دن تنگ و دھڑنگ غلاموں کی طرح محنت اور مشقت میں رہتے ہیں۔ یہ سب چیزیں دلیل ہیں اسپر کہ ہم مالک اور یہ غلام ہیں۔ طائر دل کا وکیل ہزار داستان سانسے شارب و خنت پر بیٹھا تھا۔ اُس نے بادشاہ سے کہا کہ یہ آدمی جو انواع و اقسام کے کھانے پینے پر افتخار کرتا ہے، یہ نہیں جانتا کہ حقیقت میں ان کے واسطے یہ بہت رنج و عذاب ہے۔ بادشاہ نے کہا یہ کیونکر ہے؟ اسے بیان کر۔ کہا اُس واسطے کہ اس آرام کے لیے بہت محنتیں اور رنج اٹھاتے ہیں، زمین کھودنا، ہل جوتنا، پل کھینچنا، پانی بھرنا، اناج بونا، کاٹنا، تولنا، پینا، تنور میں آگ جلانا، پکانا، گوشت کے واسطے فصائیوں سے جھکڑنا، بنیوں سے حساب کتاب کرنا، مال جمع کرنے کے لیے محنتیں اٹھانا، علم و سہر سیکھنا، بدن کو رنج دینا، اور دور ملکوں میں جانا، دو پیسوں کے واسطے امیروں کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہونا، غرض اس جد و کد سے مال و اسباب جمع کرتے ہیں، بعد مرنے کے وہ غیروں کے حصے میں آتا ہی اگر وجہ حلال سے پیدا کیا ہے تو اُس کا حساب و کتاب ہے، نہیں تو عذاب و عقاب، اور ہم اس رنج و عذاب سے محفوظ رہتے ہیں کیونکہ غذا ہماری فقط گھاس پات ہے، جو چیز زمین سے پیدا ہوتی ہے بے محنت و مشقت اُس کو اپنے تصرف میں لاتے ہیں۔ انواع و اقسام کے پھل اور میوے اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت سے ہمارے واسطے پیدا کیے ہیں، کھاتے ہیں اور ہمیشہ اُس کا شکر کرتے ہیں، فکر و تلاش کھانے پینے کی ہمارے دل میں کبھی نہیں آتی، جہاں جاتے ہیں فضل الہی سے سب کچھ میسر ہو جاتا ہے اور یہ ہمیشہ قوت کی فکر میں غلطان اور پیچاں رہتے ہیں اور طرح طرح کے کھانے جو یہ کھاتے ہیں، ویسے ہی رنج و عذاب اٹھاتے ہیں، امر امنِ غرض میں مبتلا رہتے ہیں، بخار، دردِ سر، ہیضہ، سرام، فالج، لقوہ، جوڑی، کھانسی، بیرقاں، تپ، دق، پھوڑا، پھنسی، کھجلی، داد، خنازیر، چھیش، اسہال، آتشک، سوزاک، فیل پا، نکو اس، غرض اقسام اقسام کی بیماریاں ان کو عارض ہوتی ہیں

دودا دارو کے لیے طبیعوں کے یہاں دوڑے پھرتے ہیں جس پر بے حیائی سے کہتے ہیں کہ ہم مالک اور حیوان ہمارے غلام ہیں۔ انسان نے جواب دیا کہ بیماری کی خصوصیت کچھ ہمارے واسطے نہیں ہے، حیوان بھی بیشتر امراض میں مبتلا ہوتے ہیں، اُس نے کہا حیوان جو بیمار ہوتے ہیں صرف تمہاری آمیزش اور اختلاط سے، کتے، بلی، مرغ، کبوتر وغیرہ حیوانات کہ تمہارے یہاں گرفتار ہیں، اپنے اپنے طور پر کھاتے، پینے نہیں پاتے ہیں۔ اسی واسطے بیمار ہو جاتے ہیں، اور جو حیوان کہ جنگل میں مخلا باطلع پھرتے ہیں ہر ایک مرض سے محفوظ ہیں۔ کیونکہ کھانے پینے کے وقت ان کے مقرر ہیں کمی بیشی اُس میں نہیں آتی، اور یہ حیوانات جو تمہارے یہاں گرفتار ہیں اپنے طور پر اوقات بسر کرنے نہیں پاتے، کھانا بے وقت کھاتے یا مارے بھوک کے انداز سے زیادہ کھا جاتے ہیں، بن کی ریاضت نہیں کرتے، اسی سبب کبھی کبھی بیمار ہو جاتے ہیں۔ تمہارے لڑکوں کے بیمار ہونے کا بھی یہی سبب ہے کہ حاملہ عورتیں اور دایاں حرص سے غیر مناسب کھانے، جن پر تم اتنا فخر کرتے ہو کھا جاتی ہیں، اسی لیے اختلاط غلیظہ پیدا ہوتے ہیں۔ دودھ بگڑ جاتا ہے، اس کے اثر سے لڑکے بد صورت پیدا ہوتے اور ہمیشہ امراض میں مبتلا رہتے ہیں، انہیں مرضوں کے باعث مرگ مفاعبات اور شدت نزع اور غم، غصے میں گرفتار رہتے ہیں۔ غرض کہ تم اپنے اعمال کی ثبات سے ان عذابوں میں گرفتار ہو اور ہم اُن سے محفوظ ہیں، کھانے کے اقسام میں تمہارے یہاں شد نفیس تر اور بہتر ہے، جبکہ کھاتے اور دوا میں ہمتا کرتے ہو، سو وہ کھیوں کا لعاب ہے تمہاری صنعت سے نہیں، پھر کس چیز کا فخر کرتے ہو، باقی بھل اور دانے ان کے کھانے میں ہم تم شریک ہیں اور قدیم سے ہمارے تمہارے جدو آبا شریک ہوتے چلے آتے ہیں جن دنوں تمہارے جدو اعلیٰ حضرت آدم و حوا باغ بہشت میں رہتے تھے، اور بے محنت و مشقت وہاں کے میوے کھاتے، کسی طرح کی فکر و محنت نہ تھی، ہمارے جدو آبا بھی وہاں اس ناز و نعمت میں ان کے شریک تھے جب تمہارے بزرگوار اپنے دشمن کے بھگانے سے خدا کی نصیحت بھول گئے اور ایک دانے کے واسطے حرص کی، وہاں سے نکالے گئے۔ فرشتوں نے نیچے لا کر ایسی جگہ ڈال دیا جہاں پھل

پیتے بھی نہ تھے، میوؤں کا تو کیا دھل؟ ایک مدت تک اس غم میں رویا کیے، آخر کو توبہ قبول ہوئی، خدا نے گناہ معاف کیا، ایک فرشتے کو بھیجا، اُس نے یہاں آکر زمین کھودنا، بونا، پیسنا، پکانا، لباس بنانا سکھایا غرض رات دن اس محنت و مشقت میں گرفتار رہتے تھے جبکہ اولاد بہت پیدا ہوئی اور ایک جگہ جنگل و آبادی میں رہنے لگے، پھر تو زمین کے رہنے والوں پر بدعت شروع کی، گھرانے کے چھینٹنے کتنوں کو پتھر کر قید کر لیا، بہت سے بھاگ گئے۔ ان کے قید و گرفتار کرنے کے واسطے انواع و اقسام کے پھنڈے اور جال بنانا کر درپے ہوئے، آخر کو نوبت یہاں تک پہنچی کہ اب تم کھڑے ہو کر غرور مرتبہ اپنا بیان کرتے ہو۔ مناظرے اور مجادلے کے واسطے مستعد ہو اور یہ جو تم کہتے ہو کہ ہم خوشی کی مجلسیں کرتے ہیں، ناچ رنگ میں مشغول رہتے ہیں، عیش و عشرت میں اوقات بسر کرتے ہیں، لباس فاخرہ اور زیور انواع و اقسام کے پہنتے ہیں، ان کے سوا اور بہت سی چیزیں جو ہم کو میسر نہیں ہیں سچ ہے؛ لیکن ان میں سے ہر ایک چیز کے عوض تم کو عذاب و عقاب بھی ہوتا ہے کہ جس سے ہم محفوظ ہیں، کیونکہ تم شادی کی مجلس کے عوض، ماتم فغانے میں بیٹھتے ہو، خوشی کے بدلے غم اٹھاتے ہو، راگ و رنگ اور مہنی کے بدلے روتے اور رنج کھینچتے ہو، نفس مکانوں کی جگہ تاریک قبر میں سوتے ہو، زیور کے عوض گلے میں طوق، ہاتھوں میں سٹھکڑی، پاؤں میں زنجیر پہنتے ہو، تعریف کے بدلے جو میں گرفتار ہوتے ہو، غرض ہر ایک خوشی کے عوض، غم بھی اٹھاتے ہو اور ہم ان مصیبتوں سے محفوظ ہیں کیونکہ یہ محنتیں اور رنج غلاموں اور بد بختوں کے واسطے چاہیے۔ اور ہم کو تمہارے شہر لو اور مکانوں کے بدلے یہ میدان وسیع میسر ہے، زمین سے آسمان تک جہاں جی چاہتا ہے اڑتے ہیں، ہر ہر اسیرہ دریا کے کنارے بے تکلف چوتے چمکتے ہیں، بے محنت و مشقت رُزق حلال کھاتے اور پانی لطیف پیتے ہیں۔ کوئی منع کرنے والا نہیں۔ رستی ڈول، ششک کو زسے کے محتاج نہیں، یہ سب چیزیں تمہارے واسطے چاہئیں کہ اپنے کاندھوں پر اٹھا کر جا بجا لیے پھرتے اور بیچتے ہو، ہمیشہ محنت و مصیبت میں گرفتار رہتے ہو۔ یہ سب نشانیاں غلاموں کی ہیں۔ یہ کہاں سے ثابت ہوتا ہے کہ تم مالک ہو اور ہم غلام ہیں؟“

## منظر علی و لا

**حالات** وہ نشانِ اُردو جنکا نام ضرور اس بات کا سختی ہے کہ جب تک ہماری زبان قائم ہے ہمیشہ عزت و احترام کے ساتھ لیا جائے کیونکہ یہی وہ اصحاب تھے جنہوں نے نثرِ اُردو کی بنیاد ڈالی اور بعد ازاں اُس پر عمارتیں قائم ہونی شروع ہوئیں، آج گوشہ گمنامی میں عزت گزین ہیں اور بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ اُنہوں نے ابتدا میں ہماری زبان کی کیا کیا خدمات انجام دی ہیں اُس وقت نثرِ اُردو لکھنا ایک قسم کی توہین سمجھا جاتا تھا۔ بالفاظِ دیگر نثرِ اُردو لکھنے کے یہ معنی تھے کہ لکھنے والا فارسی میں اظہارِ خیال کی قدرت نہیں رکھتا۔ وہ زمانہ تو پھر بھی ہم سے بہت دور ہے غدر کے بہت بعد تک عام طور پر یہی حال رہا کہ دوستانہ خط و کتابت معمولی اشخاص بھی فارسی زبان ہی میں کرتے رہے۔ اور اُنیسویں صدی کے اختتام تک بھی اکثر زعماءِ شادی فارسی زبان میں لکھے جاتے تھے۔ البتہ بیسویں صدی سے یہ سب باتیں داستانِ پارینہ ہو گئیں، صرنا سحرِ نویسی الٹا لکھی فارسی میں ہوتی ہے۔ جبکہ فارسی زبان کا یہ زور اور اثر ہو، واقعی ہم لوگوں کو اُن کا نہایت احسان مند ہونا چاہیے جنہوں نے اپنی علمیت پر مبنی لکھنے کو قبول کیا اور اُردو نثر میں کتابیں تصنیف و تالیف یا ترجمہ کیں، ان بزرگوں میں منظر علی و لا کا نام نامی بھی ہمیشہ شامل رہیگا۔ اُنہوں نے بیٹا لکھی کو جو محمد شاہ کے زمانہ میں سنکرت سے برج بھاشا میں آئی تھی اور ۱۸۰۳ء میں عام فہم اُردو ہو کر ناگری میں لکھی گئی تھی اُردو میں لکھا۔ افسوس ہے کہ منظر علی و لا نے اپنے متعلق ایک لفظ بھی یہاں تک کہ اپنا نام بھی کتابِ مذکور میں درج نہیں کیا۔ آج اُن کے حالاتِ زندگی کچھ اُن کی سکونت تک کا پتہ نہیں۔ مجبوراً ہم بھی اُن کے حالاتِ زندگی سے قطع نظر کرتے ہیں اور کتابِ مذکور کا بہت مختصر نمونہ ہدیہ ناظرین کرتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اب یہ کتاب دیکھی سے مطالعہ نہیں کی جاسکتی۔ زبانِ صاف اور سلیس نہیں ہے، علاوہ ازیں بہت سے ہندی الفاظ استعمال کیے گئے ہیں جن میں سے بعض بعید از فہم ہیں۔ اب تک یہ کتاب عام طور پر

باز ایں فروخت ہوتی ہے لیکن اب وہ دن بہت قریب آنے والا ہے جبکہ بیتال پچسی اور اس کی ہم عصر بنیں صفحہ قرطاس سے محروم ہو جائیں گی، کیونکہ اب ان کتابوں کے پڑھنے والے بہت کم ہو گئے ہیں اور وز بروز ان کی تعداد گھٹتی جا رہی ہے، عام طور پر ناول پڑھے جاتے ہیں اور پڑانے قصوں سے کوئی دلچسپی باقی نہیں رہی۔ آپ نے مادہ حوصل کا ترجمہ بھی اردو میں کیا جیسا کہ تخلص سے ظاہر ہے، آپ شاعر بھی تھے اور صاحبِ دیوان تھے۔ تاریخ شیر شاہی کا ترجمہ بھی آپ نے اردو میں کیا (۱۸۵۰ء) جو غالباً شائع نہیں ہوا۔

**بیتال پچسی** میں ہمیں کہانیاں ہیں اور اسی وجہ سے اس کا نام پچسی ہے، چونکہ کہانیاں کہنے والا ایک شخص بیتال نامی ہے اس لیے اس کا نام بیتال پچسی رکھا گیا ہے اور وہ شخص کیا ہے بلکہ ایک مردہ ہے جو قوم کا تپتی ہے اور جسکو جوگی نے ”سسان“ بنا کر رکھا ہے، وہ اس طرح حکایات بیان کرتا ہے۔

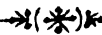
### نمونہ از بیتال پچسی پہلی کہانی

”ایک راجہ پر تائب ٹکٹ نام بنار کا تھا، اور اُس کے بیٹے کا نام بجر ٹکٹ جسکی ناری کا نام ہما دی۔ ایک دن کنورا پنے دیوان کے بیٹے کو ساتھ لے شکا رو گیا اور بہت درد جنگل میں جا نکلا اور اُسکے بیچ ایک مند رنایا ب دیکھا کہ اُس کے کنارے ہنس، چکوی، چکوا، بگلے، مرغابیاں سب کے سب کھول میں تھے، چاروں طرف پختہ گھاٹ بنے ہوئے، کنول تالاب میں پھولے ہوئے، کناروں پر طرح طرح کے درخت لگے ہوئے کہ جنگلی گھنٹی گھنٹی جھانڈہ میں ٹھنڈی ہوا آتی تھی اور پیچھی پچھی درختوں پر چھچھوں میں تھے اور رنگ برنگ کے پھول بن میں پھول رہے تھے، اُن پر جھونروں کے جھنڈ کے جھنڈ گونج رہے کہ اس تالاب کے کنارے پہنچے اور منہ ہاتھ دھو کر اوپر آئے۔

لے سسان سے یہ مطلب کہ ایک جوگی نے اس تپتی کو مار ڈالا اور پھر اُسکو ایک درخت میں لٹا دیا، اور جھوٹ بنا دیا۔ اسی کہانی میں ایک موقع پر پشچ کا لفظ استعمال کیا ہے جسکے معنی بھی جھوٹ کے ہیں۔ مینا

وہاں ایک مہادیو کا مندر تھا، گھوڑوں کو باندھ، مندر کے اندر جا، مہادیو کا درشن کر باہر نکلے جتنی دیر اُن کو درشن میں لگی تھی اُسی عرصہ میں کسوراجہ کی بیٹی سیلیوں کا جھنڈا ساتھ لیے چوے اُسی تالاب کے دوسرے کنارے پر اسٹنان کرنے آئی۔ سو اسٹنان دھیان پوجا کر سیلیوں کو ساتھ لیے درختوں کی چھانہ میں ٹہلنے لگی، اُدھر دیوان کا بیٹا بیٹھا اور راجہ کا بیٹا پھر تاحف۔ کہ اچانک اُس کی اور راجہ کی بیٹی کی چار نظریں ہوئیں، دیکھتے ہی اُس کے روپ کو راجہ کا بیٹا فریغیہ ہوا اور اپنے دل میں کہنے لگا کہ اسے چٹال کام دیو جھکوکوں ستا تا ہے اور اس راج پُتری نے اُس کو زکوہ دیکھ سر میں جو کنول کا پھول پوجا کر رکھا تھا وہی پھول ہاتھ میں لے، کان سے لگا، دانت سے کتر، پاؤں تلے دیا، پھر اُٹھا، چھاتی سے لگالیا اور سیلیوں کو ساتھ لے سوار ہوا اپنے مکان کو گئی اور یہ راج پُتری نہایت نراس ہو برہ میں ڈوبا ہوا دیوان کے پاس آیا اور ساتھ شرم کے اُسکے آگے حقیقت کہنے لگا۔

جیسا کہ اوپر ذکر کیا تمناظر علی ولانے ایک اور قصہ ماحونال بھی برج بہا کاسے اردو میں ترجمہ کیا تھا۔ افسوس ہے وہ ہمیں دستیاب نہیں ہوا ورنہ اُس کا بھی نمونہ پیش کرتے۔



## مولوی امانت اللہ

آپ نے اخلاقِ جلالی کا ترجمہ اُردو میں کیا اور ایک کتاب ہدایت الاسلام عربی اور ہندوستانی دونوں زبانوں میں لکھی جس میں مذہبِ اسلام کے ارکان و رسوم کا ذکر ہے (کلمۃ سنیۃ) اس کا ترجمہ ڈاکٹر گلکرا اسٹ نے انگریزی زبان میں کیا۔ علاوہ اس کے ایک کتاب صرف اُردو منظوم لکھی (سنۃ) یہ کتابیں آپ کے کارنامے ہیں لیکن افسوس ہے کہ آپ کی کتابیں باسانی دستیاب ہوتی ہیں اور نہ آپ کے حالاتِ زندگی کا پتہ چلتا ہے + ع۔۔۔ روئے زیں پسینکڑوں آئے چلے گئے +

## مختصر بیہی نرائن

آپ نے کپتان رومک کے بھانے سے دیوانِ جہاں کے نام سے ہندوستانی شعراء کا تذکرہ مع منتخب کلام کے مرتب کیا (۱۸۱۷ء) علاوہ ازیں آپ نے چار گلشن کا بھی ترجمہ کیا (۱۸۱۷ء) آپ بھی کلکتہ فورٹ ولیم کالج میں ملازم تھے +



## میرزا جان طیش

آپ نے مختلف کتابوں کی ترتیب و تالیف میں بمقام فورٹ ولیم کلکتہ مدد دی۔ نیز آپ نے اردو محاورات پر ایک کتاب لکھی جو فارسی محاورات سے ترجمہ کر کے ہندوستانی میں داخل کر لیے گئے ہیں۔ ساتھ ساتھ شواہد و نظائر بھی دیے ہیں۔ آپ کا کلیات آپ کی زندگی ہی میں کالج کی طرف سے شائع ہوا۔ (۱۸۱۷ء)۔ طیش نے بہارِ دانش کے کچھ حصے کا ترجمہ اردو نظم میں بھی کیا جو شائع ہو چکا ہے +



## محمد خلیل اللہ خاں اشک

آپ نے ۱۸۱۷ء میں اکبر نامہ کا ترجمہ اردو میں واقعاتِ اکبر کے نام سے کیا جو شائع نہیں ہوا۔

## خاتمہ

اس دور میں حقیقتاً فورٹ ولیم کالج نے اردو کی بڑی خدمت کی ہم نے جن متوسلین اصحاب کا ذکر کیا ہے ان کی کتابوں کے علاوہ کالج کی طرف سے اور کتابیں مثلاً ہفت گلشن

نوران الوان، تالیخ امیر حمزہ، گلہ سہ حیدری، حکایات لقمان وغیرہ بھی شائع کی گئیں، کالج کے آخر سے اُس زمانہ میں اور لوگوں نے بھی جن کالج سے کوئی تعلق نہ تھا اُردو کتابیں تحریر کیں اور کالج کی مطبوعات کا اُردو زبان پرادر اہل زبان کے ذوق پر یہ نتیجہ خیز اثر پڑا کہ لوگوں میں نشر و ترویج کا بہت اچھا سلیقہ پیدا ہو گیا اور نہ جو نشر مرزا رفیع السواد اور فضل مرحوم نے لکھی تھی غالباً عرصہ تک اُسی قسم کی نشر لکھی جاتی اور ایک مدت کے بعد نشر میں کچھ تبدیلی اور ترقی ہوتی۔ کالج کی بدولت سلیس اور بامحاورہ اُردو نشر کا جلد رواج ہو گیا۔ اور اسی طرز کو آخر کار مقبولیت حاصل ہوئی۔ دوسرے دور کے نثار اُن اُردو نے مقفی و مستح عبارت لکھنی پسند کی اور مضبوطی کے ساتھ اُس پر قائم رہے لیکن تیسرے دور کے مصنفین نے پھر اپنا رنگ بدل دیا سلاست کو پھر اپنا نصب العین بنایا اور رنگینی سے دست کشی اختیار کی ۔

# دوسرا دور

## ۱۸۳۶ء سے ۱۸۵۷ء تک

پہلے دور کے بزرگ اس دنیا سے فانی سے سنہ موڑ کر عالم بقا کو راہی ہوئے اور دوسرے دور کے نوجوانانِ عالی مقام تشرُّر و دو کی بزم میں جلوہ افروز ہوئے۔ اگرچہ پہلے دور کے بزرگوں نے اس خیال کو پیدا کرنے کی کوشش کی تھی کہ اب فارسی زبان کا عہدِ حکومت ختم ہوا اور اُردو کا طفلِ مکتب سرِ سرِ آرائے سلطنت ہوا، لیکن ان نوجوانوں کی رگوں میں فارسی زبانِ خون کی طرح پھیلی ہوئی تھی اور فارسی کو ان سے جدا کرنا گوشت سے ناخن جدا کرنا تھا۔ یہ فارسی کی بچھڑی ہوئی مصلوں کی یاد میں مست السمت تھے اور ان کو نئی مجلس قائم کرنا دشوار تھا۔ لیکن زمانہ بآوازِ بلند ان سے کہہ رہا تھا کہ نیند کے ماتو! اُٹھو اور اس گری بڑی پریشان چیز یعنی رنجِ کی دستگیری کرو، اب فارسی اور ہمارے درمیان منزلوں کا فاصلہ ہو گیا ہے اور روز بروز ہم سے فارسی دور ہوتی جاے گی۔ ملک کی زبان اُردو قرار پائیگی اور اب ہندوستان میں اُردو ہی کا سکہ رواں ہو گا۔ دہلی اور لکھنؤ اس سکہ کے دارالضرب قرار دیے گئے۔ اور ان شہروں کے علاوہ ہر جگہ کی بولی محال باہر بھی گئی۔ آخر کار فقیر محمد خاں گویا، انوار سیلی کے ترجمہ میں مصروف ہوئے اور میرزا رجب علی سرور فارسی کی تقلید میں تشرُّر و دو کی نئی طرز نکالنے میں مشغول ہوئے، ادھر مرزا غالب نے باوجودیکہ فارسی کے حصے زیادہ دلداد دے دی تھی وہ عجیب و غریب تشرُّر و دو کا نمونہ پیش کیا جس پر آج بھی لوگ سر ہنستے ہیں، عبارت میں سادگی، روانی اور شگفتگی ایسی ہے کہ باید و شاید یہ سچ ہے کہ مرزا کے خطوط اگرچہ کتاب کی شکل میں شائع ہوئے ہیں لیکن کتاب نہیں کہلائے جاسکتے تاہم ان میں وہ دلا دینے والی ہے کہ سینکڑوں کتابیں ان پر نثار ہیں اور اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ ان خطوط نے ہمارے طرزِ مکاتیب نویسی کو بالکل بدل ڈالا اور زبان اُردو کی ایک بری خدمت ادا کی غلام امام شہید کی عبارت اگرچہ رنگین ہے اور فارسی کا نتیجہ

پایا جاتا ہے مگر قابلِ تعریف ہے اور اپنے رنگ و صفت سے صاف صاف زبانِ حال کہتی ہے کہ میں نہ پہلے دگر کی سیدھی سادی اُردو ہوں اور نہ تیسرے دگر کی علمی و ادبی زبان ہوں بلکہ دوسرے دور میں پیدا ہوئی ہوں جبکہ پہلے دگر کی سادگی سے قطع نظر کے کسی اور طرز کی ضرورت تھی تاکہ ہر لغزیز اور لایقِ تحسین و آفرین بنوں، غلامِ غوث یہ تجربہ بھی اپنے دگر کی انشاپردازی سے بے خبر نہ تھے۔ انہوں نے بھی اُسی لئے میں اپنی راگنی چھیری جو اُس زمانہ کے لوگوں کو مرغوبِ خاطر تھی۔ رہے منشی امیر احمد مینائی یہ بھی سرور کے ڈھنگ پر چلے، ان کی رفتار و گفتار، وضع و قطع بالکل سرور کی سی ہے۔

کبھی یہ لوگ جوان تھے اور انہوں نے اپنی شیریں زبانی سے سب کو سحر کر رکھا تھا اب بڑھاپے سے بھی گزر کر کنارِ گور میں آرام سے سو رہے ہیں اور ان کی طرزِ عبارتِ آرائی بھی متروک و معقوق ہو گئی ہے۔ البتہ مرزا غالب کا اندازِ بیاں اب بھی محبوب و دلنویس ہے بلکہ عجیب بات یہ کہ آپ نے موت کی آبنائے سے گزر کر آبِ حیات کے چشمہ کو پایا ہے اور ابدِ الابد تک آپ کی طرزِ تحریر کو قبولیت حاصل رہیگی اور آپ کے کلمائے عبارتِ مشام جلد کو ہر زمانہ اور ہر فصل میں اپنی خوشبو سے معطر کرتے رہیں گے۔

انسوس ہے کہ ہمارا الشریحِ زمانہ کی دستِ برد سے محفوظ نہیں رہا اور نہ ہم نے جن بزرگوں کا حال اس دگر میں بیان کیا ہے وہ مصنفین کے اُس حجمِ غفیر کے سامنے جو اس دور میں ہو گئے ہیں محدود سے چند معلوم ہوتے ہیں لیکن تمام مصنفین کے حالاتِ زندگی اور ان کی تصانیف بہم پہنچانا کارِ دار و کا مشغول ہے۔ بے شک انڈیا آئنس لائبریری لندن سے اس کی کوپرا کیا جاسکتا ہے، جیسا کہ عبارتِ ذیل سے ظاہر ہوگا:-

اتفاق سے ایک روز رسالہ معارفِ اعظم گڑھ کا جون ۱۹۹۷ء کا نمبر ہماری نظر سے گزرا اور ہم نے اُس میں ایک مضمون نوشتہ سید سلیمان صاحب ندوی بعنوان ”انڈیا آئنس لائبریری میں اُردو کا خزانہ“ دیکھا، چونکہ اس مضمون میں اُردو کی بہت سی کتابوں کا ذکر ہے

جو مضمون نگار نے لندن میں دیگچی تھیں اور یہاں یعنی ہندوستان میں ناپید ہیں اس لیے ہم وہ فہرست جہاں تک اُسکا تعلق اس دور کی تصنیف شدہ کتابوں سے ہے ذیل میں درج کرتے ہیں اور فہرستوں کرتے ہیں کہ ہم ان کتابوں کے نمونے پیش نہیں کر سکتے اور نہ مصنفین کے حالات ہم پہنچا سکتے ہیں۔ اب یہ ہمارے ناظرین کا فرض ہو گا کہ اگر وہ ان نایاب کتابوں میں سے کسی کتاب کے مالک ہوں تو ہم کو اُس کے اقتباس سے بہرہ یاب کریں۔ اور اگر ممکن ہو تو مصنف کے حالات زندگی بھی جو کچھ معلوم ہوں تحریر فرمائیں تاکہ ہم طبع دوم میں اس کی کوپرا کر سکیں سید یحیٰ مان صاحب لکھتے ہیں:-

”مطبوعہ اردو کتابوں کی اہمیت بھی یہاں میری نگاہ میں کچھ کم نظر نہ آئی۔ اور بخوبی دیر کے لیے مجھے معزور ہونا پڑا کہ اللہ اللہ ہماری زبان بھی اس قدر ترقی یافتہ ہے کہ تین سو صفحہ میں اُسکی فہرست تمام ہوئی ہے۔ یہ فہرست سنہ ۱۹۰۷ء میں چھپی ہے اس لیے موجودہ بیسویں صدی کی کتابوں میں فہرست میں شامل نہیں ہیں، اس فہرست کو دیکھ کر یہ تعجب ہو گا کہ اردو زبان غدر کے پہلے ہی سے ایک علمی زبان بن رہی تھی۔ دوسری بات یہ نظر آئی کہ اس زبان کو علمی زبان بنانے میں مسلمان اور ہندو دونوں اہل قلم کا برابر کا سماج ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستانی یونیورسٹیوں کی تاریخ نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو دو حصوں میں منقسم نہیں کیا تھا بلکہ جب صرف ایک سالم اور متحد ہندوستان دنیا میں موجود تھا۔

بہر حال اردو کتابوں کی یہ فہرست جو صرف مطبوعات پر مشتمل ہے چھپے عنوانوں پر منقسم ہے۔ علوم و فنون۔ تاریخ و جغرافیہ۔ ادبیات۔ کتب تعلیمی۔ الہیات۔ اور مشرقیات ہر ایک عنوان کے تحت میں حسب ذیل تقسیمات ہیں:-

### ۱:- علوم و فنون

- (۱) زراعت و نباتات (۲) صنعت و حرفت (۳) ہیئت و نجوم (۴) علم بطنج  
(۵) نیزنگ و طبیات (۶) علم المنزل و قواعد صحت (۷) نقشہ کشی (۸) اخلاق

|                  |                          |                    |
|------------------|--------------------------|--------------------|
| (۹) دندش و سپهری | (۱۰) متانون              | (۱۱) انگریزی قانون |
| (۱۲) ہندو قانون  | (۱۳) اسلامی قانون        | (۱۴) منطق و فلسفہ  |
| (۱۵) طب و تشریح  | (۱۶) علم الحرب           | (۱۷) موسیقی        |
| (۱۸) لغت         | (۱۹) علم السنہ           | (۲۰) طبعیات        |
| (۲۱) معاشیات     | (۲۲) علم المعانی والبیان | (۲۳) جماعتیات      |
|                  |                          | (۲۴) طبحت آنا      |

## ۲۔ تاریخ و جغرافیہ

|                        |                      |                                         |
|------------------------|----------------------|-----------------------------------------|
| (۲۵) عام سوانح عمریاں  | (۲۶) سوانح محمد صلعم | (۲۷) سوانح ائمہ                         |
| (۲۸) حالات قبائل و فرق | (۲۹) علم الانساب     | (۳۰) جغرافیہ و تعلیم البلدان و ناؤگرافی |
| (۳۱) عام تاریخ         | (۳۲) مقامی تاریخ     | (۳۳) سفرنامہ                            |

## ۳۔ ادبیات

|                         |                      |                       |
|-------------------------|----------------------|-----------------------|
| (۳۴) دواوین             | (۳۵) ڈراما           | (۳۶) خطوط و مکاتیب    |
| (۳۷) استعارات ادبیہ     | (۳۸) شاعری           | (۳۹) عام شاعری        |
| (۴۰) تذکرہ شعراء        | (۴۱) مذہبی شاعری     | (۴۲) مذہبی ہندو شاعری |
| (۴۳) مذہبی اسلامی شاعری | (۴۴) محاورات و امثال | (۴۵) قصص و افسانہ     |
| (۴۶) قصص منظومہ         | (۴۷) قصص منثورہ      |                       |

## ۴۔ کتب تعلیمی

|                                    |                         |                             |
|------------------------------------|-------------------------|-----------------------------|
| (۴۸) قواعد                         | (۴۹) قواعد عربی         | (۵۰) قواعد برگستا (پشتو)    |
| (۵۱) قواعد انگریزی                 | (۵۲) قواعد ہندی         | (۵۳) قواعد ہندوستانی (اردو) |
| (۵۴) قواعد کشمیری                  | (۵۵) قواعد فارسی        | (۵۶) علم الخط               |
| (۵۷) ریاضیات                       | (۵۸) علم الجبر و مقابلہ | (۵۹) علم الحساب             |
| (۶۰) علم الحساب الکلیات و الجزئیات | (۶۱) اقلیدس             | (۶۲) علم المساحت            |

(۶۳) علم وزن و پیمائش (۶۴) علم المخزومات والاشکال (۶۵) علم الثلثات  
(۶۶) کتب ابتدائیہ (ریڈرس) (۶۷) انتخابات

### ۵۔ الہیات

(۶۸) برہمنی اور لاندہی (۶۹) بودھی (۷۰) عیسائی  
(۷۱) بائبل (۷۲) بائبل لٹریچر (۷۳) تاریخ کلیسا  
(۷۴) تعلیمات (۷۵) ادویہ و مزامیر (۷۶) قصص  
(۷۷) مناظرہ و موازنہ ادیان (۷۸) ہندو مذہب (۷۹) جینی مذہب  
(۸۰) اسلام (۸۱) عبادات (۸۲) عقائد  
(۸۳) قرانیات (۸۴) حدیث (۸۵) سیکھ مذہب

### ۶۔ متفكرات

(۸۶) تعلیمات (۸۷) تعلیم السنوان (۸۸) تعلیم الصبيان  
(۸۹) مجموعہ ہائے تقریر و مضامین (۹۰) رسائل موقت الشیوع (۹۱) روداد مجالس

ذیل میں ہر عنوانات سستیں سے چند کتابوں کے نام، بقید نام مصنف، و تاریخ طبع لکھے جاتے ہیں۔ اس انتخاب میں مقصد صرف وہی کتابیں لی ہیں جو قدرت پہلے یا اُس کے بعد کسی قریب زمانہ میں لکھی گئی ہیں قصص و منظومات کو ہاتھ نہیں لگایا ہے کہ ہر شخص جانتا ہے کہ وہ کیا اس کا بڑا ذخیرہ ہو۔ صرف علمی کتابیں لی ہیں۔ ان پر ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ علوم جدیدہ کی مختلف شاخوں میں کس سرعت سے اُردو اس وقت تک ترقی کر رہی تھی جب تک تمام ملک کی مسلم زبان تھی اور نفاق قومی سے نا آشنا تھی۔

### فن زراعت

۱۔ چائے لگانے کی کتاب (۷۷ صفحات) مطبوعہ لاہور ۱۸۵۳ء

۲۔ گنگا کی نہر مترجمہ سداسکھ لال از انگریزی (۲۴ صفحات ۱۸۵۳ء مطبوعہ آگرہ۔

۳ :- کسیت کرم مصنفہ کالی رائے، تین حصے، مطبوعہ دہلی ۱۸۴۶ء

۴ :- پندنامہ کاشتکاری مصنفہ موتی لال آگرہ ۱۸۵۲ء

۵ :- ریشم کا کیرا - از موتی لال، لاہور ۱۸۵۳ء

۶ :- توصیف زراعت از کلب حسین خاں، آگرہ ۱۸۴۸ء

### کتابِ حکمت

۱ :- بحر الحکمت (اسٹیم انجن کا بیان) ریونڈ پارکن ۱۸۴۶ء لکھنؤ

۲ :- بنجار کی کل ایشوری لال ۱۸۵۵ء بنارس

۳ :- نور النواظر احمد علی کانپور ۱۸۵۴ء

۴ :- قانون الطبائع (چھاپہ) سیتل سنگھ دہلی ۱۸۴۸ء

### کتابِ نجوم و ہیئت

۱ :- خلاصہ نظام آسمانی - پنڈت داسی دھیرا - آگرہ ۱۸۵۲ء

۲ :- مختصر احوال نظام آسمانی - آگرہ ۱۸۴۰ء

۳ :- مختصر دقائق النجوم - بڑے صاحب گنٹالے - مدراس ۱۸۴۸ء

۴ :- اصول علم ہیئت - رام چندر - دہلی ۱۸۴۸ء صفحات ۳۳۵

### جغرافیہ

۱ :- فتح گڑھ نامہ (احوال ضلع فتح گڑھ) کالی رائے دہلی ۱۸۴۹ء صفحات ۲۰۴

۲ :- علم جغرافیہ مترجمہ میر غلام علی لکھنؤ ۱۸۵۱ء صفحات ۲۲۰

۳ :- جغرافیہ عالم - دہلی ۱۸۵۳ء صفحات ۱۰۹

۴ :- خلاصہ الجغرافیہ - آگرہ ۱۸۵۴ء

۵ :- جغرافیہ کا پہلا رسالہ مترجم از انگریزی - میر غلام علی، مدراس ۱۸۵۳ء

۶ :- جغرافیہ ہند از انگریزی، پنڈت سواروپ نرائن و سواروپ نرائن دہلی ۱۸۴۴ء صفحات ۱۲۲

## طبیعیات

- ۱۔ عجائب روزگار۔ رام چندر دہلی۔ ۱۸۴۴ء
  - ۲۔ بجلی کی ڈاک۔ جے۔ ڈبلیو۔ بیل، آگرہ ۱۸۵۴ء
  - ۳۔ ہوا کا بیان، بدری لال بنارس ۱۸۵۴ء
  - ۴۔ علم حکمت (میکنکس) چارلس فنک کلکتہ ۱۸۴۳ء صفحات ۳۰۱
  - ۵۔ معدنیات، جواہر لال، آگرہ ۱۸۵۵ء
  - ۶۔ خلاصۃ الصنائع (ترجمہ از انگریزی) جھولانا تھ۔ آگرہ ۱۸۵۴ء صفحات ۱۱۲
  - ۷۔ مرآة العلوم، ہری ورمن لال، بنارس، ۱۸۴۹ء
  - ۸۔ رسالہ متفطیس۔ ترجمہ از انگریزی، سید کمال الدین۔ دہلی ۱۸۵۰ء صفحات ۲۷۱
  - ۹۔ تحصیل فی تجربہ ثقیل۔ سید احمد خاں، آگرہ ۱۸۴۴ء
  - ۱۰۔ اصول علم طبی، ترجمہ از انگریزی، اوجوہیا پرشاد و سیدو پرشاد۔ دہلی ۱۸۴۸ء صفحات ۱۶۹
  - ۱۱۔ اصول تجربہ ثقیل، محمد احسن، بنارس ۱۸۵۴ء
  - ۱۲۔ اصول قواعد مانیات، ترجمہ از انگریزی، اوجوہیا پرشاد، دہلی ۱۸۵۵ء صفحات ۲۶۴
  - ۱۳۔ مقاصد العلوم، ترجمہ انگریزی۔ سید محمد میر ۱۸۴۱ء کلکتہ
  - ۱۴۔ دائرۃ علم (نیچرل فلاسفی) محمد کرم بخش، لکھنؤ ۱۸۶۶ء
- معاشیات (پولیٹیکل اکانومی)
- ۱۔ ترجمہ معاشیات مل۔ وزیر علی، دہلی ۱۸۴۴ء صفحات ۴۱۸
  - ۲۔ اصول علم انتظام بدن۔ ترجمہ انگریزی۔ دھرم نرائن۔ دہلی ۱۸۴۶ء
- منطق
- ۱۔ ترجمہ تمسیہ، مولوی سید محمد، دہلی ۱۸۴۴ء

## فقیر محمد خاں گویا

**حالات** آپ کا نام فقیر محمد خاں ہے اور گویا تخلص ہے۔ آپ حضرت ناسخ کے ارشد

تلامذہ میں شمار کیے جاتے ہیں۔ زمانہ شاہی میں آپ رسالہ دار تھے۔ اور حسام الدولہ کے خطاب سے مخاطب تھے، اور عمائد اراکین واعیان سلطنتِ اودھ میں سے تھے۔ آپ نے انوارِ سہیلی کا ترجمہ اردو میں کیا۔ اور اُس کا نام **بستانِ حکمت** رکھا۔ یہ کتاب چودھویں ذیقعدہ ۱۲۵۱ھ کو خود انہی کے الفاظ میں بوقت صبح جبکہ ہنوز نیرِ اعظم نے علمِ نورانی اُفتی مشرق سے بلند نہیں کیا تھا مقام دار السلطنت لکھنؤ میں ختم ہوئی، اور شیخِ ناسخ نے اس کے اختتام پر یہ تاریخ کہی:-

|                                |                              |
|--------------------------------|------------------------------|
| زہ نہ نسخہ حکمت آمیز نافع      | کہ ہر باب واکرد، صد باب حکمت |
| سمی بہ بستانِ حکمت نمودند      | برائے تماشاے اربابِ حکمت     |
| گلِ بزرگ و شاخ و ثمرِ جلہ حکمت | شد ایں باغ سرسبز با آبِ حکمت |
| بہ طبعِ مسبب کہ زیباست شکرش    | فراہم شدہ جملہ اسبابِ حکمت   |
| پے سالِ تاریخ ات م ناسخ        | خود گفت بستانِ سیرابِ حکمت   |

**ترجمہ پر رائے** مترجم ممدوح الصدقہ اتفاقِ مشورہ چند اُستادانِ نامی و گرامی و زبانِ آوران

لکھنؤ خاص مثل شیخ امام بخش ناسخ و خواجہ وزیر صاحب و وزیر میر یہ ترجمہ فرمایا ہے۔ اُس زمانہ کی تحریک کے مطابق ترجمہ بہت اچھا ہے۔ لیکن عربی فارسی الفاظ بکثرت استعمال کیے ہیں، اکثر جگہ فارسی اشعار بدستور رہنے دیے ہیں اور عربی ضرب الامثال یا مقولے بھی جوں کے توں پائے جاتے ہیں، اسی وجہ سے عبارت آسان اور زود فہم نہیں ہے اور بعض الفاظ ثقیل اور مشکل بھی ہیں۔

کہیں کہیں فارسی اشعار کا اردو اشعار میں ترجمہ بھی کر دیا ہے حقیقت یہ ہے کہ کتب فی الجملہ اصل مضمون کی بدولت قابلِ مطالعہ ہے اور نہایت مفید اور کارآمد ہے۔ اگر یہ کتاب بچوں کو گلستاں اور بوستاں کی طرح اردو میں بھی پڑھائی جائے تو خاصی لیاقت پیدا ہو جائے اور

پند و نصیحت کی بہت سی باتیں معلوم ہو جائیں۔ اب ہم ذیل میں کچھ عبارت بطور نمونہ درج کرتے ہیں۔

**بستانِ حکمت کا نمونہ** ”اور بلا شک جب تک میرے دم میں دم ہے، امر خیر خواہی میں یرغ نہ کروں گا کہ حق تک میری گردن پر ہے، گو اس میں جان جائے یا رہے

اب انصاف اسل بادشاہ کے ہاتھ ہے اور الحق مگر یہ بات بھی سچ ہے۔ اس صورت میں کب میں کسی کو جھٹلا معلوم ہو گا۔ بیت

جس جس سے راست بولا وہ مجھے کج ہوا ہے

خاموش رہ ہمیشہ، سچ بولت بُرا ہے

اور میں یہ جانتا تھا کہ اہل نفاق میرے قتل پر اتفاق کرینگے۔ پر مجھے یہ یقین نہ تھا کہ مکافاتِ خیر خواہی اور نتیجہ خدمت گزاری یہ ہوگا کہ میری بقا بادشاہ کو مسترد اور رنجور کیلگی۔ جبکہ دمنہ نے یہ بات یہاں تک پہنچائی اور شامِ قریب آئی، بادشاہ نے حکم دیا کہ دمنہ کو دارالانصاف میں سپرد کرو، تا قاضی اسکا حال دریافت کرے کہ احکامِ سیاست میں جب تک شرائطِ شرعی تمام نہ ہونگے کچھ حکم نہ کیا جائیگا۔ دمنہ نے کہا کہ کون حاکم راست کار۔ بادشاہ سے زیادہ ہے۔ اور کون قاضی، عادل، شہریار سے بالاتر ہے، الحمد للہ کہ ضمیرِ میر بادشاہ، آئینہ ہے باصفا، بلکہ جامِ جہاں نما، کہ صورتِ حال ہر ملازم و رعایا کی اُس میں جوید ہے۔ رباعی سنو

ایوانِ عدالت میں تہائے امیر شاہ      ہے ظلم کو کیا دخل عیناً ذاً بالہ  
شیئے کا اگر طاق سے ٹوٹے ہے پاؤں      پتھر سے ٹکلتی ہے صدا بسم اللہ

اور یہ یقین اتنا جانتا ہوں کہ کشفِ شہادت اور رفعِ حجاب میں کوئی چیز برابر فرست بادشاہِ جمجاہ کے نہیں ہے۔ اگر خود شہریار بنفسِ نفیس، رائے جہاں آرا کو قاضی میرے حال کا فرمائے تو کذب اور صدق میرا مانند صبح صادق کے، روشن ہو جائے جیسا کہ حافظہ نے فرمایا۔ بیت

عرضِ حاجت و درجِ حضرت محتاج نیست      را دیکس مخفی نہ ماند بر فروغِ رائے تو

شیر نے کہا کہ اسے دمنہ اندیشہ نہ کر کہ اس ہم میں جس تجوئے تمام کی جائیگی اور تحقیق اس کام کی

اس طرح پرکہ زیادتی اس سے مستور نہ عمل میں نہ آئیگی۔ نظم  
 جدا کرینگے ہم اس طرح حق و باطل کو کہ جیسے دودھ سے مکھی نکال لیتے ہیں  
 نکال لیتے ہیں جس طرح عطر پھولوں سے ہر ایک بات کا ہم جی نکال لیتے ہیں  
 و منہ نے کہا کہ میں بے گناہی کے سبب مبالغی میں زیادہ اہتمام کرتا ہوں اور یہ بھی جانتا  
 ہوں کہ اس سختی سے اخلاص میرا زیادہ تر ظاہر ہوگا۔ اگر میں اس کام میں گنہگار ہوتا تو حاضر درگاہ  
 شہر بار نہ رہتا اور فرار اختیار کرتا بلکہ فساد فی الارض پڑھکر اور اقلیم کی راہ لیتا کہ ملک  
 خدا تک نہیں اور پاؤں بندے کا لنگ نہیں ہے۔ شیر کی ماں نے کہا کہ اے و منہ تیرا مبالغہ  
 و غدغے سے خالی نہیں ہے، مگر تو زیر کی سے چاہتا ہے کہ آپ کو بیگناہ کر دکھائے، لیکن اگر کوئی اچھی طرح  
 دریافت کر لے گا تو اس مضیق سے خلاصی پانا تیرا فکر محال اور سودائے باطل ہے۔ و منہ نے کہا  
 کہ میرے دشمن بے شمار ہیں، امیدوار ہوں کہ میرا کام ایسے امین کو سپرد ہو کہ غرض اور شبہ سے  
 پاک ہو اور جو کچھ کہ راست بر راست ہو حضور میں باریا باریا بادشاہی کے عرض کیا کرے اور بادشاہ  
 عالیجاہ بعد استماع مبشورہ اپنی رائے جہاں آرا کے کہ آئینہ جہاں نما ہے حکم فرمائے۔ تا میں بجز  
 شبہ کے مارا نہ جاؤں اور شہر بارہ روز جزا، خون ناحق میں مبتلا نہ بازخواست سلطان حقیقی  
 ہوا اور یہ مطلع مولف کا میرے حال کے موافق ہے۔

غم نہیں اسکا مجھے میں مرگیا غم یہ ہے قاتل کا خنجر بھر گیا

سبب ترجمہ جناب گویا نے سبب ترجمہ کتاب میں یوں زبان گویا کی ہے:-

کتاب

”و اب سنا چاہیے کہ ایک روز بندہ اور خواجہ وزیر اور میاں فرخ  
 شاعر کہ یہ دونوں شاگرد ارشد شیخ ناسخ صاحب کے ہیں اور چند احباب اور بھی باہم بیٹھے ہوئے  
 تھے اور وقت شغل انوار سیلی کے مطالعے کا تھا اور اس کے مصنف کی فکر سا پرستے زبان  
 ثنا کھولی تھی کہ سجان اللہ مصنف اس کا عجب حکیم بے مثل تھا، اور عجب کتاب تصنیف کی ہے  
 کہ گنجینہ ہے اسرار الہی کا اور خزینہ ہے فیض غیر متناہی کا، بلکہ قرینہ اس پر دال ہے کہ جو کچھ اس

بیان کیا ہے، منطقتہ ہے کہ بادشاہِ عالم نصیبی ہو، وَاَلَا رَأٰی اَنَاسَانٌ ضعیف النِّیان، کب کُنہ کو اس قدر جزئیاتِ عالم کے پہنچ سکتی ہے، اگر مطالب اس کتاب کے کوئی بخشمِ غور دیکھے تو کوئی دقیقہ فوایدِ دینی اور دنیوی سے باقی نہیں چھوڑا ہے، اور اگر کوئی غریب و فقیر خواہ رئیس و امیر خصوصاً بادشاہ اس کتاب کے مطالب کو اپنا قبلہ مقصد کرے تو یقین ہے کہ سعادتِ دیرین سے سرفرازی پائے اور رونقِ اُس کے ہر امر کی روز بروز ترقی کرتی جائے۔ اس گفتگو میں سب اہل محصل نے اصرار کیا کہ اکثر زبانوں میں ترجمہ اس کا ہو چکا ہے، اگر تم اُردو میں اُسے ترجمہ کر دو تو خوب چیز ہو۔ راقم نے ہر چند عذر کیا، پیش رفت نہ ہوا۔ کچھ منجانب اللہ بندے کو بھی توفیق رفیق ہوئی اور ہمت اس پر آئی کہ دما توفیقی الا باللہ کہہ کر ارادہ کرو۔ اگر فضل الہی شامل حال ہے تو سب بخیر و خوبی انجام ہوگا۔ لہٰذا خدا کی عنایت پر تم کیہ کر کے شروع کیا جاتا ہے۔“

آگے چل کر آپ لکھتے ہیں :-

”جس نے انوارِ سمیعی کو دیکھا ہوگا، آپ نظرِ تامل سے مطالعہ کرے گا، اُس پر خود کشف ہو جائیگا کہ گویا صورتِ کتاب کی اور ہی ہو جائیگی۔ برائے نام ترجمہ کیا جاتا ہے۔ ورنہ یہ کتاب حقیقت میں جدِ اجدا ہے۔ لیکن حق یوں ہے کہ یہ احسانِ نقاشِ اول کا ہے، ورنہ مجھ سے بے مایہ گو کہاں طاقت اس کے بیان کی تھی۔“

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ نے آزادی کے ساتھ ترجمہ کیا ہے، لکھی کی جگہ مکھی نہیں ماری یہی وجہ ہے کہ ترجمہ لکھنے اور معنی خیز ہے۔

## مرزا عجب علی بیگ سرو

**حالات** مرزا عجب علی بیگ، مرزا اصغر علی لکھنوی کے بیٹے تھے، لکھنؤ میں پیدا

ہوئے اور ہیں تعلیم و تربیت حاصل کی۔ سرور تخلص اختیار کیا اور فنِ شعر میں آغا نواز شمس حسین خاں

نوازش کے شاگرد ہوئے۔ اگرچہ آپ مذاقِ سخن رکھتے تھے اور صاحبِ دیوان تھے لیکن آپ کی

شہرت زیادہ تر نثر نگاری کی وجہ سے ہے۔ آپ کی کئی تصنیفات ہیں، لیکن فسانہ عجائب اپنے

خاص رنگ میں بہترین تصنیف ہے جو ۱۸۳۵ء میں بعد نصیر الدین حیدر بادشاہ لکھنؤ لکھی گئی

اور جس کی عبارت متفقہ و مسیح ہے، یہ نگین اور قافیہ پیمائی فارسی تحریرِ دلی میں پائی جاتی ہے،

لیکن اُدویں اس اندازِ تحریر کے آپ ہی موجد ہیں۔ جس طرح اُردو میں آجکل یہ رنگ پسند

نہیں کیا جاتا، حال کی فارسی بھی اس قسم کی تکلفانہ عبارتوں سے معترس ہے۔ اس میں کوئی شبہ

نہیں کہ سرور کی یہ طرزِ عبارت آرائی اس دور کے جملہ مصنفین میں کم و بیش پائی جاتی ہے۔

اگرچہ مرزا غالب مرحوم نے اُردو خط و نویسی میں اس تصنیع اور تکلف کو مطلق جگہ نہیں دی

لیکن کتابوں کی تقریظ یا دیباچہ لکھنے میں اُن کا قلم بھی سرور کی طرح اس طرز سے آزاد نظر نہیں

آتا ہاں مرزا غالب کی سبب نثر میں تصنیع اور دو کا رنگ کم ہے۔ کیونکہ دوسرے فقرے میں تقریباً

دیباچہ ہی بے تکلفی پائی جاتی ہے جیسی پہلے فقرے میں (دیکھو حالات مرزا غالب)

سرور سلطانی، شمشیر خانی کا ترجمہ ہے جو سلطانِ عالم و اجداد علی شاہ کے حکم سے

کیا گیا تھا۔ گلزار سرور بھی حدائقِ العشاق کا ترجمہ ہے۔ اور مہاراج ایسری پرشاد

نارائن سنگھ کی فرمائش سے کیا گیا ہے۔ ان کتابوں کے علاوہ شگوفہ محبت ایک اور قصہ ہے

اور انشاءً سرور ایک اور کتاب ہے جو آپ سے یادگار ہے۔ ایک نثر اور ایک قصیدہ پرش

آف ویلز و بعد ملکہ و کٹوریہ کے جشنِ شادی کی تہنیت میں لکھا ہے جس کا ایک شعر یہ ہے۔

باپ میں شوکتِ شاہی تھی پسر زینتِ تخت ماں کے پرتو سے پری خانہ ہو شہرِ لندن

ایک نثر ہمارا جہ بندس کی سواری کی تعریف میں لکھی ہے۔ جلد تصانیف کا رنگ ایک ہی ہے جو اب بالکل متروک ہے۔

ایک تذکرہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ۱۸۴۲ء تک لکھنؤ میں رہے، ہمارے نزدیک یہ کہنا صحیح نہیں کیونکہ خود سرور نے گلزار سرور میں لکھا ہے کہ حضرت واجد علی شاہ نے ۹ برس تک حکومت کی اور ۱۸۴۷ء میں اُن کو معزول کیا گیا۔ پس ۱۸۴۷ء سال جلوس ہوا، اور جب کہ آپ نے چند کنامیں بادشاہ کے علم سے لکھیں اور آپ کی دربار شاہی تک رسائی تھی تو کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ آپ ترک وطن پر فوراً آمادہ ہوئے ہوں۔

گلزار سرور میں جس کا نمونہ ہم نے درج کیا ہے عزل شاہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ”شرفا معاش سے تنگ و حیران ہوئے، ایسے نیکلے کہ بے نام و نشان ہوئے، از انجہ فقیر وہاں کس شمار میں تھا“ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انتر اربع سلطنت تک آپ لکھنؤ میں رہے اور بعد ازاں ہمارا راج ایسری پر شاہ نارائن سنگھ کی خدمت میں باریاب ہوئے، سنا ہے کہ ۱۸۶۳ء میں آپ کلکتہ گئے تھے اور وہاں سے واپس آکر تھوڑے ہی دنوں بعد لکھنؤ میں انتقال کیا۔

سرور کی انشا پردازی ایک صاحب سرور کی انشا پردازی کے متعلق لکھتے ہیں کہ:-

”فسانہ عجائب نثر کی اُس طرزِ تحریر کا اعلیٰ نمونہ ہے جس کی بنا پر رائے

قصع اور بناوٹ پر ہے اور جس کی دلدیزئی کا مدار مصنوعی حسن پر ہے، ایک زمانہ میں اردو کے انشا پردازوں میں یہ طرز نہایت مقبول تھی مگر اب کچھ تو غالب اور آزاد کی تقلید اور کچھ انگریزی تہذیب کے اثر سے لوگوں نے اس کو ترک کر دیا ہے، تاہم فسانہ عجائب کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک اعلیٰ درجہ کا انشا پرداز اس رنگ میں بھی کیا کیا رنگینیاں پیدا کر سکتا ہے گواہی کے ساتھ یہ بات بھی اچھی طرح ظاہر ہو جاتی ہے کہ اس طرز کا میدان کس قدر رنگ ہے اور زمانہ حال کی دواؤ و دوش کے لیے کس قدر ناموزوں ہے“

نمونہ از فسانہ عجائب ذیل میں فسانہ عجائب کی مختصر عبارت بطور نمونہ نقل کی جاتی ہے۔

(یہ کتاب بازار میں عام طور پر فروخت ہوتی ہے اس لیے اختصار تہ نظر ہوا)

## طوطا خریدنا جان عالم کا

”ایک روز گزر جان عالم کا گزری میں ہوا۔ انہو کثیر و حجم غفیر نظر آیا۔ شہزادہ اُدھر متوجہ ہوا۔ دیکھا ایک مرد نحیف، سترائی برس کا سن نہایت ضعیف پیچہ ہاتھ میں لیے کھڑا ہے۔ اُس میں ایک جانور مانند سا کبان جنال سبز پوش با منقار گن رطیفے رنگین اور نکتے قابل تعریف و نمکین بیان کرتا ہے۔ شاہزادے کو دیکھتے ہی طوطا اپنے مالک سے بولا۔ اے شخص کوب بخت تیرا افلاس کے بُرج تیرہ سے نکلا، نصیب چمکا۔ طلع بر سر بادری اور زمانہ آمادہ۔ دِگار ہی ہوا دیکھ ایسا شاہزادہ عالی تبار متوجہ اس بے مقدار پر ہوا ہے۔ وہ بیکار شے کا رگاہ بے ثبات میں یس ہوں جس کا طالب کس نہیں۔ بحد کیہ جانور ہوں اور پتی کا کھا جا۔ مگر جو یہ نظر عنایت کرے ابھی تیرا ہاتھ پُر زر ہو۔ واسن گھر سے بھرے۔ جان عالم نے یہ سخن ہوش رُبا اور کلہ حیرت افزا کو سن، طوطے عقل کے اڑا، پیچہ اُس طائر ہمہ واں، جانور سحر بیاں کا ہاتھ میں لیے مالک سے قیمت پوچھی۔ طوطے نے کہا۔ بمیت

کب لگاتا ہے کوئی اس لیے حال کامل سب گھٹائی ہے مفلس کے غرض مال کامل مگر جو حضور کی مرنی۔ جان عالم نے لاکھ روپیہ بخلت کے سوا عنایت کیے اور پیچہ ہاتھ میں لیے دولت سر اور دانہ ہوا۔ گھر میں جا کر ماہ طلعت کو طوطا دکھایا یہ مصرع افشا کا پڑھا۔

بازار ہم گئے تھے اک چوٹ مول لائے

طوطے نے شہزادہ کو سخنان دیکھ پ و قصص عجیب و حکایات غریب سنا کر اپنے دم محبت میں اسیر کیا۔ یہ نوبت پہنچی کہ سوتے جا گئے دربار کے سوا جدانہ ہوتا۔ جب دربار جاتا پیچہ بتا کہ سید حفاظت ماہ طلعت کو سونپ جاتا۔ اور دربار سے دیوانہ وار شوق گفتاریے قرار جلد پھر آتا۔ سرور نے ایک رقعہ دعوت شادی لکھا ہے۔ چونکہ دیکھ پ اس لیے اُس کو ہم یہاں نقل کرتے ہیں۔

## رقعہ دعوتِ شادی

”اس سال نیا ساز و سامان ہے، ہولی شبِ برات بہار سے دست  
 دگر بیان ہے، باغبانِ ازل دھینے چمن نکالے گا۔ بوٹہ پتاجو بن نکالے گا  
 نسیم سحر غنچوں کی گانچہ ٹوٹے لگی عبیر اور گلِ گراں گرہ سے کھولنے لگی۔ تھنہ لالہ چراغاں کا ڈھنگ  
 دکھاتا ہے۔ ہنروں میں فوارہ پچکاری کا رنگ دکھاتا ہے۔ کوسوں تک سنبھل کا فرش بچا ہوا  
 شاداب کوہ و صحرا ہے۔ پتہ پتہ کانِ زمرد کا پتہ دیتا ہے شبنم کا قطرہ ڈربے بہا کا آدیزہ ہے۔  
 کوہ میں کبک درمی کا قہقہہ، باغ میں بلبل کا نالہ ہے صحنِ گلزار میں سبزے نے سر نکالا ہے۔  
 جس قلم تراش میں شاخ کا دستہ ہے۔ قوتِ نامیہ کے فیض سے یکفعلِ گلہ سستہ ہے۔ اس گلشنِ ارجی میں  
 کیا نمونہ قدرت پروردگار ہے کہ دستِ دگر بیاں خزانِ دہار ہے۔ اگر شاخ سے کوئی پتی مُرجھا  
 ٹوٹتی ہے تو برابر سبز کو پل پھوٹی ہے۔ گل کی ہنسی پر گریہ شبنم ہے کہ مہلت یہاں بہت کم ہے۔ بشیر کو  
 لازم ہے کہ فرصتِ غنیمت جا کر اُن خیالوں سے درگزرے۔ جو امر ضروری ہو اُسے کر گزرے۔  
 لہذا صدرِ نشینانِ برہم طرب و سرور۔ انجمنِ آرایانِ حلبہ شادی و سوز کی خدمت میں امیدوار  
 ہوں کہ ازراہِ دوستانہ بے عذر و بے بہانہ رونی بخشِ حلبہ احباب ہوں۔ خاکسارِ بینِ منت کا“  
**گلزارِ سرور** ایک شخصِ رضی بسیر محمد شفیق نے جو نظام الدلہ نواب الہ ویروی خاں عالم  
 بنگالہ کا صاحب تھا، کتابِ صدایق العشاق کو عبارتِ فارسی تحریر کیا تھا۔ مرزا حبیب علی بیگ  
 سرور نے سلطنتِ اودھ کے الحاق کے بعد ہمارا راج الیسری پر شاونا رائے سنگھ بہادر  
 کی فرمائش سے، اُس کو فارسی سے اُردو میں ترجمہ کیا۔ عبارتِ منقحہ و بیح ہے۔ وہی فسانہِ عجائب  
 کا انداز ہے، اور نام اس کتاب کا گلزارِ سرور ہے جسب ذیل عبارت بطور نمونہ نقل کی جاتی ہے:-  
**نمونہ گلزارِ سرور** مذکور آوارہ وطن، خزاں دیدہ چمن، مترجمِ صدایق العشاق رجب علی بیگ  
 سرور عفی عنہ۔

”یہاں سے نقاشِ ثانی، معترفِ نادانی، گردشِ دیدہ، بلارِ سیدہ، یار و دیار سے دور  
 جب علی بیگ سرور، اپنی گذشتہ داستانِ حیرت بیان لکھتا ہے۔ بارہ سو چوبیس ہجری، شہرِ شہباز

میں فلک نے وہ سامان کیا۔ گلزار لکھنؤ پر عین بہار میں خزاں آئی۔ اس شعبدہ باز کہن نے نئی نیرنگی دکھائی۔ بعد خرابی شاہجہان آباد، یہ زمین بسی، سب طرح کی خلقت کا یہاں قیام ہوا، دور دور اس شہر کا شہرہ ہوا، نام ہوا، اس سلیقہ سے آباد ہوا کہ دنیا کی ملک اس کے روبرو ویران تھی، سرزمین شام کی صبح ہو گئی۔ اپنے شہر کی کیفیت اور فضا پر ترجیح دیتے ساکن شیراز و اصفہان تھے۔ ہر گلی گلزار، جو کوچہ نظر پڑا پڑا بہار تھا۔ خزاں بار نہ پاتی تھی، بہار کا دل نہا تھا۔ سب غفلت کے کال، ہر فن کے استاد شامل ایک جاتے جاتے عقل حیران تھی وہ کون تھے کیا تھے۔ جو کسی کماں کا کسی طرف سے آیا، جفا ویدہ روزگار بے برگ و بار تھا۔ بچشم زون سرسبز ہو کے نہال ہو گیا۔ قدر شناسی ہوئی، مالامال ہو گیا۔ سیکڑوں شہر اس کی بدولت بستے تھے، اشرفی روپیہ کے ہنڈیرستے تھے جو چیز گرا نہا جس ملک میں کسی کاریگر نے بنائی وہ بکنے کو ہیں آئی۔ سرد مصر کا بازار تھا، اور کہاں ایسا خریدار تھا۔ بے فکری اس جا کی دور دور مشہور تھی۔ بقول مشہور لگوٹی میں بھاگ کھیلی تھی، فائدہ کشی میں ڈنڈ بیتی تھی، اپنے زعم میں قیصر و فقیر تھی۔ ایسی ہلک نمک ہوئی کہ حد سے گزر گئی۔ ہر کالے راز والے، فلک کو اجاڑنا، اس کا نام و نشان بنائے بگاڑنا، منظر تھا۔ وگرنہ بادشاہ کے دل میں نہ یہاں کی رعایا کی طبیعت میں فتور تھا۔ حضرت واجد علی شاہ سلطان عالم نے نو برس محمد شاہی کی۔ اس پر سرکار سے سرتابی نہ کی بلکہ غدر خواہی کی۔ قیصر باغ کو غیرت گلزار ارام بنایا تھا۔ کیا لکھوں رات دن جو لطف اٹھایا تھا، خدا جانے کس کمبخت کی نظر اس شہر کو کھا گئی، امیر فقیر سب پر تباہی آگئی۔ پہلی سیم اللہ یہ ہوئی، صاحبان عالیشان نے اسکی خرابی کا خیال کیا۔ دیا ہوا ملک بے سبب لیا۔ وہ کلکتہ فریاد کو گئے، اپنی داد کو گئے، بیگم صاحبہ ولیعہد بہادر، جرنیل صاحب یہ قافلہ لندن روانہ ہوا، قصا کو بہانہ ہوا۔ پہلے جناب بیگم صاحبہ نے رحلت فرمائی۔ بعد جرنیل صاحب کو مرگ جوانی آئی۔ مصرع

ایں ماتم سخت است کہ گویند بوال مرد

ہند میں فوج سرکار، قدیم ننگ خوار و پیا وہ اور سوار، شامت اعمال سے چر گئے، غوا سے امرامک

ہلا میں گھر گئے۔ جا بجا شور و شر مچا، قتل و غارت سے فساد ہوا۔ چھوٹے کاکیا بگڑا، ہندوستان اس کچھڑے میں برباد ہوا۔ پہلے دہلی اُجڑی، پھاٹک ٹوٹا، پھر لکھنؤ ٹوٹا، یہاں تک کہ بے چراغ ہوا۔ بے بہمن دوسے پامال خزاں خانہ باغ ہوا۔ شرفا معاش سے تنگ و حیران ہوئے۔ ایسے نیکے کہ بے نشان پڑے ازاں جملہ فقیر و ہاں کس شمار میں تھا، نہ خلیفہ رعیت، نہ غلامان شہر یا میں تھا۔ مگر غرابا نوازی، شرفا پروردی کی راہ سے مہاراج بہادر دام دولہتم نے یاد فرمایا۔ سر کے بل یہ بے سرو پا چلا آیا۔ ملازمت حصول ہوئی، سعادت حصول ہوئی، مسافر پروردی کی، ناموری کی۔ فقیر احمد امیر جو ہر شناس قدردان ہاتھ آیا، زینت باقیماندہ بسر کرنے کو مکان خوب پایا۔ اگر فلک سفلہ پر ورحد شعار جل نہ جائے، چکر کر کے رنگ نہ لائے۔

ایک روز حسب اتفاق نسخہ صدائق العشاق نظر سے گزرا اسکے ترجمہ کر نیکو فقیر سے ارشاد فرمایا۔ ہر چند عذر کیا کہ اب تحریر کا زمانہ نہیں، حواس مختلف ہوش کا ٹھکانا نہیں نشہ جوانی لطفِ زندگانی گھٹ گیا، جہان کی تفتہ کھائی ہو گئی دل ہٹ گیا، قبول نہ ہوا، ناچار الامر فوق الامر ہے۔ سمجھ کے احکام بجا لایا۔ اطاعت سے سرنہ پھرایا۔ خزاں کی باریابی سے معذور ہے، نام اس کا گلزار سرور ہے۔ گو مزے اور کیفیت سے یہ شرعاری ہے۔ فقط تحریر فرماں برداری ہے۔ ناظرین پر تکمیل سے عرض پیرا ہوں، کیا میرا لکھنا اور میں کیا ہوں، صاحب زبان، فارسی کے روبرو ہندی کیا چیز ہے العاقل تکفیفۃ الاشارة شرط تمیز ہے۔“

سلاطین بھری میں مرزا رجب علی بیگ سردار نے شمشیر خانی کا ترجمہ اُردو زبان میں نام سرور سلطانی کیا۔ اس کتاب میں ایران کے مشہور بادشاہوں کا حال درج ہے، غالباً کسی نے فردوسی کے شاہنامہ کو متر کر دیا ہے اور اُس کا ترجمہ سرور نے فرما دیا ہے۔ مختصر عبارت نقل کی جاتی ہے۔“

”راویان اخبار و حاکمان آثار متفق ہیں کہ پہلے جس نے گلزار بے ثبات میں ویش شمشیر خانی سلطنت نکالی، تخت و تاج کی بنا ڈالی، عدل و داد کو رواج دیا، محصول و خراج

لہا وہ کیو مرث تھا۔ ابابود و بایش کوہ و بیابان کی، اور پوشاک پوسٹ حیوان کی، بیٹا اُسکا سیامک نام تھا۔ اُسکو عبادت کے سوا اور نہ کچھ کام تھا۔ دیونے اُسکو مارا۔ کیو مرث کو بہت قلعہ ہوا، ہوسنگ، سیامک کا بیٹا تھا۔ اُس نے باپ کے خون کا بدلہ لایا۔ دیو کو قتل کیا۔ تیس برس کیو مرث نے سلطنت کی، پھر دارقنا سے رحلت کی۔ یہ قول فردوسی ہے۔ اس نام کی تحقیق میں کیو مرث کا ف فارسی اخیر تار فوقانی اور آئمہ اخبار نے اختلاف کیا ہے۔ امام غزالی نے اس دادی سے رم کیا ہے۔ بزرگترین اولاد مبلہ آدم لکھا ہے۔ بعضے کہتے ہیں ولیم بن لاؤ بن سام بن نوح ہے اور مصنف روضۃ الصفا لکھتا ہے کہ یافث بن نوح کا بیٹا ہے، عرب اُس کو عام عجم کیو مرث کہتے ہیں اور علمائے مجوس آدم اسی کو جانتے ہیں کلاشاہ کہتے مانتے ہیں۔ ہزار برس کا سن اور چالیس برس سلطنت کے دن

اس کتاب میں ۹۶ صفحات ہیں جسکو سرور نے دو مینے میں لکھا ہے، کتاب کے آخر میں مشکل الفاظ کی ایک فرہنگ بھی دی ہے جسکو قاموس، برہان، سراج اللغات، مویذ الفضلا فرہنگ شاہناہ، اور غیاث اللغات سے مرتب کیا ہے۔ اس فرہنگ کے آٹھ صفحات ہیں اور اس طرح کل کتاب ۲۰۴ صفحات پر ختم ہو گئی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ فرہنگ منشی فخر کنور نے لکھوائی ہے کیونکہ منشی صاحب نے پہلی مرتبہ اس کتاب کو ۱۷۷۵ء میں چھپوا کر شائع کیا ہے۔



## مرزا اسد اللہ خاں غالب

غالبینام آدم نام فخر خانم میرس ہم اسد اللہ دم اسد اللہ دم

|             |                                                              |
|-------------|--------------------------------------------------------------|
| تاریخ ولادت | میرزا اسد اللہ خاں غالب المعروف بہ میرزا فخر                 |
| و حائدا ن   | دبیر الملک اسد اللہ خاں بہادر نظام جنگ۔ المتخلص بہ غالب واسد |

آٹھویں ماہ جب ۱۲۷۵ ہجری کو شہر آگرہ میں پیدا ہوئے۔ مرزا کے خاندان کا حال یہ ہے کہ ان کے

آیا و اجداد ایک قوم کے ترک تھے اور ان کا سلسلہ نسب تو رابن فریدوں تک پہنچتا ہے۔ جب کیانی تمام ایران و توران پر تسلط ہو گئے اور انہوں کا عہد و جلال دنیا سے رخصت ہو گیا، تو ایک مدت دراز تک کی نسل ملک و دولت سے بے نصیب رہی، مگر تو ارکھی ہاتھ سے نہ چھوٹی چنانچہ خود فرماتے ہیں:-

تو اپشت سے ہے پیشہ آبا سپہ گری کچھ شاعری ذریعہ عزت نہیں مجھے  
بارے ایک مدت کے بعد اسلام کے عہد میں اسی تلوار کی بدولت ترکوں کے بخت خضہ  
نے پھر کر دث بدلی اور سلجوقی خاندان میں ایک زبردست سلطنت کی بنیاد قائم ہو گئی۔ کئی سو  
برس وہ تمام ایران و توران و شام و روم پر حکمران رہے۔ ۶۰۰ ایک مدت کے بعد سلجوقیوں کا  
ستارہ بھی گردش میں آیا اور سلجوقی کی اولاد چاچا مندر پر اگندہ ہو گئی۔ اُنہی میں سے محمد خا  
نام ایک میرزا دے نے سمرقند میں بود و باش اختیار کر لی تھی۔ مرزا کے دادا جو شاہ عالم کے زمانے  
میں سمرقند سے ہندوستان میں آئے وہ اسی ترسم خاں کی اولاد میں تھے۔

مرزا کے دادا کی زبان بالکل ترکی تھی اور ہندوستان کی زبان بہت کم سمجھتے تھے۔ مرزا  
کے دادا کو سلطنت کی حیثیت کے موافق ایک عمدہ منصب اور پہاسو کا سیر حاصل پرگنہ ذات  
اور رسالے کی تخواہ میں دیا گیا۔ اُن کے کئی بیٹے تھے جن میں سے دو کے نام معلوم ہیں۔ ایک  
مرزا کے باپ عبداللہ بیگ خاں عرف میرزا دولہا اور دوسرے نصر اللہ بیگ خاں۔ عبداللہ بیگ  
کی شادی خواجہ غلام حسین خاں کیدان کی بیٹی سے ہوئی تھی جو سرکار میرٹھ کے ایک معرزا نصر  
اور عابد شہر آگرہ میں سے تھے۔ مرزا عبداللہ بیگ خاں نے بطور قاعدہ دادا کے اپنی تمام عمر  
سسرال میں بسر کی اور ان کی اولاد نے بھی وہیں پرورش پائی۔ مرزا عبداللہ بیگ خاں کے  
دو بیٹے ہوئے، ایک مرزا اسد اللہ خاں اور دوسرے مرزا یوسف خاں جو ایام شباب میں مجنن  
ہو گئے تھے اور اُسی حالت میں ۱۷۷۵ء میں انتقال کیا۔ خود مرزا نے ایک موقع پر جبکہ بھائی نے بیماری  
سے سرکار ملک کے اُس قلعہ کو کہتے تھے جو صوبہ کی نسبت چھوٹا اور پرگنہ دھال وغیرہ سے بہت بڑا ہوتا تھا۔

سے شفا پائی ہے یہ قطع کہا ہے ۵

وی مرے بھائی کو حق نے از سر نو زندگی میرزا یوسف ہے غالب یوسف ثانی مجھے  
مرزا کے والد عبداللہ بیگ خاں اول لکھنؤ میں جا کر نواب آصف الدولہ کے ہاں نوکر بنے  
اور چند روز بعد وہاں سے حیدر آباد پہنچے، اور سرکار آصفی میں تین سو سوار کی جمیعت سے کئی برس  
تک ملازم رہے مگر وہ نوکری ایک خانہ جنگی کے بھٹیرے میں جاتی رہی اور وہ واپس آگرے میں  
پہلے آئے۔ پھر الوری میں ملازمت کی غرض سے گئے اور وہاں ایک گڑھی کا زمیندار راج سے بچ گیا  
تھا۔ جو فوج اُس کی سرکوبی کے لیے گئی اُسکے ساتھ مرزا عبداللہ بیگ خاں کو بھی بھیجا گیا۔ وہاں  
پہنچتے ہی اُن کے گولی لگی اور وہیں اُن کا انتقال ہو گیا اور راج گڑھ میں دفن ہوئے، چنانچہ مرزا  
ایک قصیدہ میں کہتے ہیں:-

کافی ہو مشاہدہ شاہد ضرور نمیت در خاک راج گڑھ پدرم را بود مرزا  
مرزا غالب کے چچا نصر اللہ بیگ خاں سرکاری فوج میں (لارڈ لیک کے لشکر میں) بھرتہ  
رسالداری ملازم ہوئے۔ اُن کی وفات اور رسالے کی تنخواہ میں دو پرگنے یعنی سونک اور سونا  
جو نواح آگرے میں واقع ہیں سرکار سے اُن کے نام پر مقرر ہو گئے جب تک وہ زندہ رہے  
دونوں پرگنے اُن کے نامزد رہے، اور اُن کی وفات کے بعد اُن کے وارثوں اور متعلقوں کی منتہیں  
سرکار نے فیروز پور جھرمک کی ریاست سے مقرر کرا دیں جس میں سے سات سو روپیہ سالانہ مرزا  
کو آخر اپریل ۱۸۵۷ء تک برابر ملتا رہا۔ مگر فتح دہلی کے بعد تین برس تک قلعے کے تعلقات کے سبب  
یہ پیش بند رہی۔ آخر حیدر علی مرزا کی ہر طرح سے بریت ہو گئی تو پیش پھر جاری ہو گئی اور تین برس کی  
واصلات بھی سرکار نے غایت کی جب تک پیش بند رہی، مرزا کے دوستوں کو نہایت تعلق خاطر رہا  
لطیفہ اکثر لوگ پیش کا حال دریافت کرنے کو خط بھیجتے تھے۔ ایک دفعہ میر ہمدی نے اسی  
مضمون کا خط بھیجا تھا اُس کے جواب میں مرزا صاحب لکھتے ہیں:-

”میاں بے رزق جینے کا ڈھب مجھ کو آ گیا ہے، اس طرف سے خاطر جمع رکھنا۔ رمضان کا

مہینہ روزے کھا کھا کر کھانا، آگے خدارزاق ہے، کچھ اور کھانے کو نہ ملا تو غم تو ہے۔“

**تعلیم** مرزا غالب مع اپنے چھوٹے بھائی کے بن شورشک آگرے ہی میں رہے، اگرچہ سات برس کی عمر سے وہ دلی میں آنے جانے لگے تھے لیکن شادی کے بعد تک اُن کی مستقل سکونت آگرے ہی میں رہی اور شیخ معظم جو اُس زمانہ میں آگرہ کے نامی معلموں میں سے تھے اُن سے تعلیم پاتے رہے۔ اُس کے بعد ایک شخص پارسى نژاد جس کا نام آتش پرستی کے زمانہ میں ہرمزد تھا اور بعد سلمان ہونے کے عبدالصمد رکھا گیا، غالباً آگرے میں سیاحانہ وارد ہوا اور دو برس تک مرزا کے پاس اول آگرے میں اور پھر دلی میں مقیم رہا۔ میرزا نے اُس سے فارسی زبان میں کسی قدر بصیرت پیدا کی، مرزا نے جابجا اُس کے تلمذ پر اپنی تحریروں میں فخر کیا ہے اور اُس کو بلفظ تیمار جو پارسیوں کے یہاں نہایت تعظیم کا لفظ ہے یاد کیا ہے۔ مرزا کی چودہ برس کی عمر تھی جب عبدالصمد اُن کے مکان پر وارد ہوا ہے۔ اور کل دو برس اُس نے وہاں قیام کیا۔ پس جب یہ خیال کیا جاتا ہے کہ مرزا کو کس عمر میں اُس کی صحبت میسر آئی اور کس قدر قلیل مدت اُس کی صحبت میں گزری تو عبدالصمد اور اُس کی تعلیم کا عدم وجود برابر ہو جاتا ہے۔ اس لیے مرزا کا یہ کہنا کچھ غلط نہیں کہ مجھ کو مبدأ فیاض کے سوا کسی سے تلمذ نہیں ہے۔

انچہ در مبدأ فیاض بود آن من است گل جدا نشدہ از شاخ بدان من است  
**شہاب** چونکہ مرزا کے چچا کارشہ نواب فخرالدولہ کے خاندان میں ہو چکا تھا اور اس لیے اُن کے خاندان سے ایک نوع کا تعلق پیدا ہو گیا تھا، مرزا کی شادی نواب فخرالدولہ کے چھوٹے بھائی مرزا الہی بخش خاں معروف کے ہاں قرار پائی۔ تیرہ برس کی عمر میں، رجب ۱۲۵۰ ہجری کو اُن کا عقد ہو گیا۔ اس تقریب سے اُن کی آمد و رفت دلی میں زیادہ ہو گئی اور آخر کار یہیں سکونت اختیار کر لی اور اخیر عمر تک دلی ہی میں رہے۔

دہلی و آگرہ شیراز و صفا بان من است

مردا کے ناناک آگرے میں ایک خاصی سرکار تھی جسکی بدولت اُن کے ملازم اور متوسلین

دش و دن بارہ بارہ ہزار کے مالگزار بن گئے تھے اور مرزا کا بچپن اور عنفوانِ شباب بڑے اعلیٰ ملکوں میں بسر ہوا تھا۔ خود لکھتے ہیں ”اُس کثرے کے ایک کوٹھے پر میں پتنگ اڑاتا تھا اور راجہ بلوان سنگھ سے پتنگ لڑا کرتے تھے۔“

عنفوانِ شباب میں وہ شہر کے نہایت حسین خوش رو لوگوں میں شمار کیے جاتے تھے، اور بڑھاپے میں بھی حسانت اور خوبصورتی کے آثار اُن کے چہرے اور قد و قامت اور ڈیل ڈول سے نمایاں طور پر نظر آتے تھے، مگر اخیر عمر میں قلبِ خوراک اور امراضِ دائمی کے سبب وہ نہایت نحیف و زار و نزار ہو گئے تھے، لیکن چونکہ ہاڑ بہت چکلا، قد کشیدہ اور ہاتھ پاؤں زبردست تھے۔ اس حالت میں بھی وہ ایک نو وارد تورانی معلوم ہوتے تھے۔

**مسکن** دلی میں وہ قریب پچاس برس کے رہے۔ لیکن اپنے لیے نہ کوئی مکان خریدا اور نہ بنایا۔ جب ایک مکان سے جی اُگتا یا، اُسے چھوڑ کر دوسرا مکان لے لیا۔ مگر قائم جان کی گلی یا حبش خاں کے چھانک یا اُسکے قرب و جوار کے سوا کسی اور ضلع میں جا کر نہیں رہے سب سے اخیر مکان جس میں اُن کا انتقال ہوا حکیم محمود خاں مرحوم کے دیوانخانے کے متصل مسجد کے عقب میں تھا جس کی نسبت وہ کہتے ہیں :-

مسجد کے زیر سایہ اک گھر بنالیا ہوا  
یہ بندہ کینہ ہمسایہ حسد ہے

جہاں اب ہندوستانی دواخانہ کی عمارت ہے سڑک کے اُس پار یہ مکان ہوگا  
لیکن اب تو وہ مہطل معلوم ہوتا ہے۔

**مطالعہ و کتب** جس طرح مرزا نے تمام عمر رہنے کے لیے مکان نہیں خریدا اسی طرح مطالعے کے لیے بھی، باوجودیکہ ساری عمر تصنیف کے شغل میں گزری، کبھی کوئی کتاب نہیں خریدی، الا ماشاء اللہ۔ ایک شخص کا یہی پیشہ تھا کہ کتاب فروشوں کی دکان سے لوگوں کو کرائے کی کتابیں لادیا کرتا تھا۔ مرزا صاحب بھی ہمیشہ اُسی سے کرایہ پر کتابیں منگواتے تھے اور مطالعہ کے بعد واپس کر دیتے تھے۔

سفر کلکتہ مرزا نے کبھی کوئی لمبا سفر کلکتہ کے سوا نہیں کیا۔ اسی سفر کی آمد و رفت میں وہ چند ماہ لکھنؤ اور بنارس میں بھی بٹہ رہے تھے۔ کلکتہ جانے کا سبب یہ تھا کہ جب مرزا کے چچا نصر اللہ بیگ خاں نے وفات پائی تھی اُس وقت مرزا کی عمر نو برس کی تھی اور اُن کے بھائی کی عمر سات برس کی تھی۔ نصر اللہ بیگ خاں کی وفات کے بعد اُن کے متعلقوں اور وارثوں کے لیے جن میں مرزا اور اُن کے بھائی بھی شریک تھے جو منشن گورنمنٹ نے ریاست فیروز پور بھکرہ پر محول کر دی تھی جب تک مرزا صغیر سن رہے جو کچھ وہاں سے ملتا رہا پاتے رہے۔ جب بن تیز کو پہنچے اور شادی بھی ہو گئی۔ عالم شباب اور خانہ داری کی ضرورتیں بہت بڑھ گئیں اور گھر میں جو کچھ اثاثہ تھا وہ بھی چند روز میں سب خرچ ہو گیا۔ لاجاً فکر معاش دانگیں ہوئی، اول مرزا کو غلطیاں صحیح یہ خیال پیدا ہوا کہ فیروز پور سے جس قدر منشن ہمارے خاندان کے لیے گورنمنٹ نے مقرر کر لی تھی اُس قدر ہم کو نہیں ملتی۔ ضرورتوں نے سخت تنگ کر رکھا تھا، ادھر قرضوں کی تقاضے سے ناک میں دم آ گیا تھا، اُدھر چھوٹے بھائی کو جنون ہو گیا۔ مرزا جیسے آزاد منش آدمی کے لیے یہ وقت نہایت سخت تھا، اُس کشمکش میں اُن کو اس کے سوا اور کچھ نہ سوچا کہ کلکتہ پہنچ کر گورنمنٹ میں منشن کی بابت ہتھانہ پیش کریں۔ غرض کہ مرزا کی عمر کچھ کم چالیس برس کی تھی جب وہ لکھنؤ ہوئے ہوئے کلکتہ پہنچے وہاں لوگوں نے اُن کی بہت خاطر و مدارات کی اور اُن کو کامیابی کی امید دلائی۔ سٹرلنگ صاحب سکرٹری گورنمنٹ ہند نے جن کی مدد میں مرزا کا فارسی قصیدہ اُن کی کلیات میں موجود ہے وعدہ کیا کہ تمہارا حق ضرور تم کو ملیگا۔ کولبرک صاحب جو اُس وقت دلی میں ریڈنٹ تھے انہوں نے دلی ہی میں مرزا سے عہدہ رپورٹ کرنے کا اقرار کر لیا تھا۔ ان امیدوں کے دھوکے میں وہ پورے دو برس کلکتہ میں رہے، مگر آخر کار نتیجہ ناکامی کے سوا کچھ نہ ہوا جب یہاں سے مرزا کو مایوسی ہوئی تو انہوں نے ولایت میں اہل کیا۔ مگر وہاں بھی کچھ نہ ہوا۔

مجاولہ اہل کلکتہ | کلکتہ کے قیام کے زمانہ میں کچھ لوگوں نے مرزا کے کلام پر اعتراض کیے تھے اگرچہ مرزا کے طرفدار بھی کلکتہ میں بہت تھے مگر انہوں نے تنگ آ کر ایک مثنوی موسوم بہ بادِ مخافت لکھی جس میں اپنی غریب الوطنی کا ذکر اور اہل کلکتہ کی نامہربانی کی شکایت اور اُن کے اعتراضات اور اپنے جواب تہایت عمدگی اور صفائی اور دروانگیر طریقے سے بیان کیے ہیں۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ دلی میں واپس آ کر یہ سب باتیں فراموش ہو گئیں اور وہاں کی سیر اور کلگشت یاد رہی۔ کہتے ہیں ۷

کلکتہ کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشین! اک تیر میرے سینہ پہ مارا کہ ہائے  
وہ سبز زار ہائے سطر آ کہ جو غضب وہ ناز میں بتاں خود آرا کہ ہائے  
صبر آزا وہ اُن کی نگاہیں کہ حق نظر طاقت رُبادہ اُنکا اشارہ کہ ہائے  
وہ میوہ ہائے تازہ و شیریں کہ واہ واہ وہ بادہ ہائے ناب گوارا کہ ہائے

قیام لکھنؤ | لکھنؤ کی ایک صحبت میں جبکہ مرزا وہاں موجود تھے ایک روز لکھنؤ اوسٹی کی زبان پر گفتگو ہو رہی تھی، ایک صاحب نے مرزا سے کہا کہ جس موقع پر اہل دہلی اپنے تئیں بولتے ہیں وہاں اہل لکھنؤ آپ کو بولتے ہیں، آپ کی رائے میں فصیح آپ کو ہے یا اپنے تئیں؟ مرزا نے کہا فصیح تو یہی معلوم ہوتا ہے جو آپ بولتے ہیں، مگر اس میں دقت یہ ہے کہ مثلاً آپ میری نسبت یہ فرمائیں کہ میں آپ کو قرشہ حضاہل جانتا ہوں اور میں اُسکے جواب میں اپنی نسبت یہ عرض کروں کہ میں تو آپ کو کتے سے بھی بدتر سمجھتا ہوں، تو سخت مشکل واقع ہوگی؛ میں تو اپنی نسبت کہوں گا اور آپ ممکن ہے کہ اپنی نسبت سمجھ جائیں۔ سب حاضرین یہ لطیفہ شکر چمڑک گئے۔ مگر یہ فقط ایک لطیفہ اہل صحبت کے خوش کرتے کے لیے تھا ورنہ اہل دہلی بھی اکثر بجائے اپنے تئیں کے آپ کو بولتے ہیں؛ اس میں کچھ اہل لکھنؤ کی خصوصیت نہیں ہے۔

لطیفہ | زبان کے متعلق مرزا کا اسی قسم کا ایک اور لطیفہ مشہور ہے۔ دلی میں رکھ کو بعضے مونث اور بعض مذکر بولتے ہیں؛ کسی نے مرزا صاحب سے پوچھا کہ حضرت! رکھ مونث ہو یا مذکر؟

آپ نے کہا کہ بھیا! جب رتھ میں عورتیں بیٹھی ہوں تو مونٹ کہو اور جب مرد بیٹھیں تو مذکر گھجھو۔

**ملازمت سرکاری** **سے انکار** **سکرٹری گورنمنٹ ہندوستان** نام سے روز کی کالج مشہور ہے اور جو

اس صوبہ کے بعد ازاں لفٹنٹ گورنر ہوئے مدرسین کے امتحان کے لیے دلی میں آئے اور چاہا کہ جس طرح سنار و پیہا ہوا رکا ایک عربی مدرس کالج میں مقرر ہے، اسی طرح ایک فارسی کا مدرس مقرر کیا جائے، لوگوں نے مرزا اور موہن خاں اور مولوی امام بخش کا ذکر کیا۔ سب سے پہلے مرزا صاحب کو بلا لیا گیا، مرزا بالکی میں سوار ہو کر صاحب سکرٹری کے ڈیرے پر پہنچے، صاحب کو اطلاع ہوئی۔ انہوں نے فوراً بلالیا، مگر یہ بالکی سے اتر کر اس انتظار میں ٹھہرے رہے کہ دستور کے موافق صاحب سکرٹری اُن کے لینے کو آئیں گے جب بہت دیر ہو گئی اور صاحب کو معلوم ہوا کہ اس سبب سے نہیں آئے وہ خود باہر چلے آئے، اور مرزا سے کہا کہ جب آپ دربار گورنری میں تشریف لائیں گے تو آپ کا اسی طرح استقبال کیا جائیگا لیکن اس وقت آپ نوکری کے لیے آئے ہیں، اس موقع پر وہ بڑا وٹھیں ہو سکتا۔ مرزا صاحب نے کہا کہ گورنمنٹ کی ملازمت کا ارادہ اس لیے کیا ہے کہ اعزاز کچھ زیادہ ہونے اس لیے کہ موجودہ اعزاز میں بھی فرق آئے۔ صاحب نے کہا: ہم قاعدے سے مجبور ہیں۔ مرزا صاحب نے کہا مجھ کو اس بہت سے معاف رکھا جائے، اور یہ کہہ کر چلے آئے۔

**قید ہونیکا واقعہ** مرزا کو شطرنج اور چو سر کھیلنے کی بہت عادت تھی اور چو سر جب کبھی کھیلے تھے برائے نام کچھ بازی بکری کھیلا کرتے تھے۔ اسی چو سر کی بدولت مسئلہ پھری میں مرزا پر ایک سخت ناگوار واقعہ گزرا یعنی کوتوال کی دشمنی کے باعث اُن کو قید خانہ میں جانا پڑا لیکن آدمی میعاد گزرنے کے بعد وہ خود مجسٹریٹ ہی کی رپورٹ پر رہا کیے گئے۔

یہ واقعہ مرزا صاحب پر نہایت شاق گزرا تھا، اگرچہ نچو جھچھ مینے کے تین مینے جو اُن کو قید خانے میں گزرے اُن کو کسی طرح کی تکلیف نہیں ہوئی۔ وہ بالکل اُسی آرام سے رہے جیسے گھر پر رہتے

تھے، گھانا اور کپڑا اور تمام ضروریات حسبِ دلخواہ گھر سے اُن کو پہنچی تھیں، اُن کے دوست اُن سے ملنے جاتے تھے، اور وہ صرف بطورِ نظر بندوں کے ایک علیحدہ کمرے میں رہتے تھے۔ جب مرزا قید سے چھوٹ کر آئے تو میاں کالے صاحب کے مکان میں آکر رہے تھے ایک روز میاں کے پاس بیٹھے تھے، کسی نے اُن کو قید سے چھوٹنے کی مبارکباد دی، مرزا نے کہا:- ”کون بھڑوا قید سے چھوٹا ہے؟ پہلے گورنر کی قید میں تھا، اب کالے کی قید میں ہوں“

**قلعہ کا تعلق** ۱۶۶۲ء ہجری میں مرحوم ابو ظفر سراج الدین بہادر شاہ نے مرزا کو خطاب بحج الدولہ دبیر السلطنت نظام جنگ اور چھ پارچے کا خلعت مع تین رقوم جو اہر یعنی جیغہ و سرترجی و حامل مرورید کے۔ دربار عام میں محبت فرمایا۔ اور خاندانِ تیمور کی تاریخ نویسی کی خدمت پر پیشا ہر و پچاس روپیہ ماہوار کے مامور کیا۔ مرزا نے تمام کتاب کا نام پر تو لیا اور اُسکے پہلے حصہ کا نام جس میں کچھ مختصر حال ابتدائے آفرینش سے صاحبقران تیمور گہرگان تک اور کسی قدر مفصل حالات تیمور سے نصیر الدین ہمایوں کے اخیر زمانہ تک بیان ہوئے ہیں، مہر نیمروز اور دوسرے حصہ کا نام جس میں جلال الدین اکبر بادشاہ سے لیکر سراج الدین بہادر شاہ کے زمانہ تک تمام واقعات شرح و بسط کے ساتھ درج ہوتے ماہِ نیم ماہ تجویز کیا تھا۔ اُن کو اپنی اس ترکیب پر بڑا ناز تھا۔ دوسرے دستِ خیر بیجا پر جس میں غدر کی تاریخ کا مادہ ہے بہت فخر کرتے تھے۔ پہلا حصہ ختم ہونے کے بعد انہوں نے کچھ دنوں آرام لیا اور دوسرا حصہ شروع کر دیا۔ تھے کہ غدر ہو گیا اور اُس حصہ کا صرف نام ہی نام رہ گیا۔

**خدمتِ اصلاح** ۱۶۸۵ء میں جبکہ شیخ ابراہیم ذوق کا انتقال ہو گیا، بادشاہ کے اشعار اشعار بادشاہ کی اصلاح بھی مرزا سے متعلق ہو گئی تھی، اور وہ اس کام کو بادل نا خواستہ

۱۷ حضرت محمد نصیر الدین عرف میاں کالے صاحب بہادر شاہ مرحوم کے شیخ اور مولانا فخر الدین قدس سرہ کے پوتے تھے۔ مرزا محبت تک اُن کے مکان میں رہے ہیں۔ وہ مرزا سے نہایت محبت رکھتے تھے اور اُنھی کی تقریب سے قلعے میں تعلق پیدا ہوا تھا۔ تنہا

سراخجام کرتے تھے۔

**بدیہ گوئی** جب مرزا کلکتے میں تھے تو مجلس میں ایک صاحب نے فیضی کی بہت تعریف کی، مرزانے کہا ”فیضی کو لوگ جیسا سمجھتے ہیں ویسا نہیں ہے“ اس پر بات بڑھی، اُس شخص نے کہا کہ فیضی جب پہلی ہی بار اکبر کے روبرو گیا تھا اُس نے ڈھائی سو شعر کا قصیدہ اُسی وقت کہہ کر پڑھا تھا۔ مرزا بولے ”اب بھی اللہ کے بندے ایسے موجود ہیں کہ دو چار سو نہیں تو دو چار شعر تو ہر موقع پر سدا بہہ کہہ سکتے ہیں“ مخاطب نے حجب میں سے ایک چکنی ڈلی نکال کر جمیل پر رکھی اور مرزا سے درخواست کی کہ اس ڈلی پر کچھ ارشاد ہو۔ مرزانے گیارہ شعر کا قطعہ اُسی وقت موزوں کر کے پڑھ دیا جو اُن کے دیوان اُردو میں موجود ہے اور جس کا پہلا شعر یہ ہے ۵

ہے جو صاحب کف دست پہ چکنی ڈلی      زیب تیا ہے اسے جس قدر اچھا کہیے

**اولاد** مرزا صاحب کے اولاد کچھ نہ تھی۔ ابتدا میں سات بچے پے درپے ہوئے مگر کوئی زندہ نہیں با  
**حالات غدرو** غدر کے زمانہ میں مرزا دلی سے بلکہ گھر سے بھی باہر نہیں نکلے، جو نئی بغاوت کا  
**کتاب سنبو** فتنہ اٹھا انہوں نے گھر کا دروازہ بند کر لیا، اور گوشہ تنہائی میں غدر کے حالات

لکھنے شروع کیے، اگرچہ فتح دہلی کے بعد ہمارا راج پٹیلہ کی طرف سے حکیم محمود خاں مرحوم اور ان کے ہمسایوں کے مکان چس میں ایک مرزا بھی تھے حفاظت کے لیے پہرہ بیٹھ گیا تھا، اس لیے وہ فتنہ سپاہیوں کی لوٹ کھسوٹ سے محفوظ رہے، مگر پھر بھی اُن کو طرح طرح کی تکفین اٹھانی پڑی مرزا یوسف جو دیوانے ہو گئے تھے اور مرزا کے مکان سے تقریباً دو ہزار قدم کے فاصلے پر ایک مکان میں رہتے تھے زمانہ غدر میں انتقال کر گئے۔ نہ مرزا اپنے بھائی کی تجہیز و تکفین میں شریک ہو سکے اور نہ خاطر خواہ اُس کا انتظام کر سکے، اُس وقت نہ کفن کے لیے کپڑا بازار میں مل سکتا تھا، نہ غسل اور گورکن کا کہیں پتا تھا۔ نہ شہر سے قبرستان تک جانا ممکن تھا۔ مگر مرزا کے ہمسایوں نے اُنکی بڑی مدد کی اور جوں توں مرزا یوسف کو غسل اور تجہیز و تکفین کے بعد مسجد کے صحن میں سپرد خاک کر دیا۔

لطیفہ ایک روز کچھ گورے مرزا کے مکان میں بھی گھس آئے تھے، راجہ کے سپاہیوں نے ہر چند روکا مگر انہوں نے کچھ التفات نہیں کیا۔ اور اُن کو اور اُنکے دو عزیز بچوں کو اور دو تین نوکروں کو مع چند ہمسایوں کے کرنل براؤن کے روبرو لے گئے۔ سنا ہے کہ جب مرزا کرنل کے سامنے پیش کیے گئے تو اُس وقت کلاہ پانچ اُن کے سر پہ تھی۔ اُس نے مرزا کی نئی وضع دیکھ کر پوچھا کہ ول تم مسلمان ہو؟ مرزا نے کہا آدھا۔ کرنل نے کہا اسکا کیا مطلب؟ مرزا نے کہا ”شراب پیتا ہوں، سو نہیں کھاتا“ کرنل یہ سنکر ہنسنے لگا۔ پھر مرزا نے وزیر ہند کی خطی جو بلکہ منظمہ کے مدحیہ قصیدے کی رسید اور جواب میں آئی تھی، دکھائی، کرنل نے کہا تم سرکار کی فتح کے بعد پہاڑی پر کیوں نہ حاضر ہوئے؟ مرزا نے کہا ”میں چار کہا روں کا افسر تھا“ وہ چاروں مجھے چھوڑ کر بھاگ گئے، میں کیونکر حاضر ہوتا؟ کرنل نے نہایت مہربانی سے مرزا اور اُن کے تمام ساتھیوں کو رخصت کر دیا۔

ایام غدر کی آیتام غدر میں مرزا کی معاش کے دونوں ذریعے یعنی سرکاری پنشن اور ملکہ کی تنخواہ تنگی و عسرت مسدود ہو گئے تھے۔ گھر میں جس قدر بی بی کے پاس زیور یا کوئی اوقیتی چیز تھی وہ دوسری جگہ گارٹنے والے کے لیے بھیج دیا تھا جہاں سے فخریہ سہانے کھود کر سب نکال لیا۔ مگر مرزا نے اس تنگی و عسرت کی حالت میں بھی اپنے متعدد نوکروں میں سے کسی کو جواب نہیں دیا، اور جلات اُن پر اور اُنکے متعلقین پر خوش و ناخوش گزری اُس میں نوکر بھی برابر شریک رہے، نوکروں کے علاوہ جن لوگوں کے ساتھ مرزا امن کے زمانے میں ہمیشہ سلوک کرتے تھے وہ اس حالت میں بھی مرزا کو ستاتے تھے اور چارنا چار اُن کی بھی مرزا کو خبر لسنی پڑتی تھی۔ مرزا لکھتے ہیں کہ ”اس ناواری کے زمانے میں جس قدر کپڑا، اوٹھنا اور بھجونا گھر میں تھا سب بیچ کر کھا گیا، گویا اور لوگ روٹی کھاتے تھے اور میں کپڑا کھاتا تھا“

وظیفہ رامپور غدر کے بعد دو برس تک مرزا کا یہی حال رہا۔ مگر دو برس بعد جنوبی دست علیخان رئیس رامپور نے مور وہیہ ماہوار ہمیشہ کے لیے مرزا کے واسطے مقرر کر دیا۔ جنوبی کلب علیخان نے

بھی بدستور مرزا کے اخیر دم تک جاری رکھا، اور غدر سے تین برس بعد جب مرزا ہر ایک الزام سے بری ثابت ہوئے سرکاری پینشن بھی جاری ہو گئی۔

**لطیفہ** جب نواب یوسف علی خاں کا انتقال ہو گیا اور مرزا تعزیت کے لیے راہ پور گئے چند روز بعد نواب کلب علی خاں کا نواب لفظت گورنر سے ملنے کو بریلی جانا ہوا۔ اُن کی روانگی کے وقت مرزا بھی موجود تھے۔ چلے وقت نواب صاحب نے معمولی طور پر مرزا صاحب سے کہا ”خدا کے سپرد“ مرزا نے کہا حضرت! خدا نے تو مجھے آپ کے سپرد کیا ہے، آپ پھر اُن مجھ کو خدا کے سپرد کرتے ہیں؟

**برہان قاطع** جب مرزا دستنبو کو ختم کر چکے اور اب بھی تنہائی اور ستائے کا وہی عالم رہا تو اُنہوں نے یادداشت کے طور پر برہان قاطع میں جو مقام قابلِ اعتراض نظر آئے اُن کو ضبط کرنا شروع کیا۔ شدہ شدہ ایک کتاب بن گئی جس کا نام قاطع برہان رکھا گیا اور ۱۲۷۳ھ میں چھپکر شائع ہوئی۔ پھر مرزا نے ۱۲۷۳ھ میں باضافہ دیگر مضامین و فوائد اسکو دوسری بار چھپوایا اور اُس کا نام درفش کاویانی رکھا۔

**عربی استعداد و فارسی دانی** مرزا نے عربی میں صرف دیکھ کے سوا اور کچھ اُستاد سے نہیں سیکھا۔ مگر چونکہ علم لسان سے اُن کو فطری مناسبت تھی اُن کی نظم و نثر اُردو و فارسی کے دیکھنے سے کہیں اس بات کا خطرہ تک دل میں نہیں گزرتا کہ یہ شخص عربیت اور فنی ادب سے ناواقف ہو گا۔ عربی الفاظ کو اُنہوں نے ہر جگہ اُسی سلیقہ سے استعمال کیا ہے جس طرح ایک اچھے فاضل اور ادیب کو استعمال کرنا چاہیے، شاعری جس کا ملکہ اُن کی فطرت میں ودیعت کیا گیا تھا اُس سے قطع نظر کہ فارسی زبان اور فارسی الفاظ و محاورات کی تحقیق اور اہل زبان کے اسالیبِ بیاں پر مرزا کو اس قدر عبور تھا کہ خود اہل زبان میں بھی مستثنیٰ آدمیوں کو ایران کے مستند شعرا کی زبان پر اس قدر عبور ہو گا۔ اس کے سوا فنِ عروض میں بھی اُن کو کافی دستگاہ معلوم ہوتی ہے۔ چنانچہ فارسی اُردو میں متعدد غزلیں اور تیر

ایک آدمہ فارسی قصیدہ ایسی ٹیڑھی بحر میں اُنہوں نے لکھا ہے کہ اکثر موزوں طبع بغیر واقفیت عروص کے اُن بحر میں نہیں چل سکتے۔

**بخوم و تصوف** علمِ بخوم سے کسی قدر اور اُس کی اصطلاحات سے پوری واقفیت اُن کو تھی

چنانچہ اُن کی نظم فارسی میں جا بجا اس کا کافی ثبوت ملتا ہے۔ علمِ تصوف سے جس کی نسبت کہا گیا ہے کہ ”برائے شعر گفتن خوب است“ اُن کو خاص مناسبت تھی اور حقائق و معارف کی کتابیں اور رسالے کثرت سے اُن کے مطالعے سے گزرے تھے، اور سچ پوچھیے تو انہیں

متصوفانہ خیالات نے مرزا کو نہ صرف اپنے ہم عصروں میں بلکہ بارہویں اور تیرہویں صدی کے تمام شعراء میں ممتاز بنا دیا تھا۔ فنِ تاریخ اور سیاق و مساحت وغیرہ سے اُن کو مطلق لگاؤ نہ تھا۔

**خطا اور شعر بخوانی** مرزا کا خط نستعلیق شفیعا آمیز نہایت شیریں اور دلآویز تھا، جیسا کہ اکثر

اہلِ اہران کا ہوتا ہے۔ اور باوجود خوشخطی کے نہایت زود نویس اور تیز دست تھے۔ شعر پڑھنے کا انداز بھی خاص مشاعرہ میں حد سے زیادہ دلکش اور مؤثر تھا۔

**مرزا کے اخلاق و** مرزا کے اخلاق نہایت وسیع تھے، وہ ہر ایک شخص سے جو اُن سے ملنے

عادات اور خیالات جاتا تھا، بہت کشادہ پیشانی سے ملتے تھے، جو شخص ایک دفعہ اُن سے مل جاتا

تھا، اُسکو ہمیشہ اُن سے ملنے کا اشتیاق رہتا تھا، دوستوں کو دیکھ کر وہ باغ باغ ہو جاتے تھے، اور

اُن کی خوشی سے خوش اور اُن کے غم سے غمگین ہوتے تھے، اس لیے اُن کے دوست ہر ملت اور

ہر مذہب کے نہ صرف دہلی میں بلکہ تمام ہندوستان میں بے شمار تھے، جو خطوط اُنہوں نے

اپنے دوستوں کو لکھے ہیں، اُن کے ایک ایک حرف سے مہر و محبت و عجز و اری اور یگانگت

ٹپکی پڑتی ہے، ہر ایک خط کا جواب لکھنا وہ اپنے ذمہ فرض مین سمجھتے تھے، اُن کا بہت سا

وقت دوستوں کے خطوں کے جواب لکھنے میں صرف ہوتا تھا۔ بیاری اور تکلیف کی حالت

میں بھی وہ خطوں کے جواب لکھنے سے باز نہ آتے تھے۔ وہ دوستوں کی فرمائشوں سے کبھی

تنگدل نہ ہوتے تھے، غزلوں کی اصلاح کے سوا اور طرح طرح کی فرمائشیں اُنکے بعض

خالص و مفصل دوست کرتے تھے اور وہ ان کی تعمیل کرتے تھے۔ لوگ ان کو اکثر بزرگ خط بھیجتے تھے مگر ان کو کبھی ناگوار نہ گزرتا تھا، اگر کوئی شخص لغافے میں ٹکٹ رکھ کر بھیجتا تھا تو سخت شکایت کرتے تھے۔ انہوں نے میسور کے ایک شہزادے کو اپنی کوئی کتاب بھیجی ہے، اُس نے کتاب کی رسید لکھی ہے اور قیمت دریافت کی ہے، اُس کے جواب میں لکھتے ہیں ”قیمت دریافت کرنا کیا سوال کیونکر قلم کی زبان سے نکلا۔ نیاز سندان بے نوا پر مہربانی فرمانے کا یہ طریقہ نہیں ہے۔ میں بے سرمایہ ہوں لیکن فرومایہ نہیں۔ شاعر ہوں سوداگر نہیں، مؤلفیت پوش ہوں کتاب فروش نہیں۔ بخشش قبول کروں والا ہوں، قیمت لینے والا نہیں۔ جو کچھ آزاد لوگ شہزادوں کی خدمت میں بھیجتے ہیں نذر ہوتی ہے، اور جو کچھ شہزادے فقیروں کو بخشتے ہیں تبرک ہوتا ہے۔ خرید و فرو کا معاملہ نہیں۔ جو کچھ میں نے بھیجا ہے تحفہ ہے، اور جو کچھ میں بھیجو لگا تحفہ ہوگا۔“

**مروت** مروت اور کاظم رزاقی طبیعت میں سجد تھا، اگرچہ عمر کے آخری حصہ میں وہ اشعار کی اصلاح دینے سے بہت گھبراتے تھے لیکن کبھی کسی کا قصیدہ یا غزل بغیر اصلاح کے واپس نہ کرتے تھے، ایک صاحب کو لکھتے ہیں ”جہاں تک ہو سکا، احباب کی خدمت بجالایا اور اہل اشعار لینے لینے دیکھتا تھا اور اصلاح دیتا تھا۔ اب نہ آنکھ سے اچھی طرح سوچے، نہ ماتہ سے اچھی طرح لکھا جائے۔ کہتے ہیں کہ شاہ شرف بوعلی قلندر کو بسبب کبر سن کے خدا نے فرض اور پیہمیر نے سنت معاف کر دی تھی۔ میں متوقع ہوں کہ میرے دوست بھی خدمت اصلاح اشعار سے مجھے معاف کریں۔ خطوط شوقیہ کا جواب جس صورت سے ہو سکیگا لکھ دیا کروں گا۔“

**فراخ حوصلگی** اگرچہ مرزا کی آمدنی قلیل تھی مگر حوصلہ فراخ تھا۔ سائل ان کے دروازہ سے خالی ہاتھ بہت کم جاتا تھا، ان کے مکان کے آگے اندھے، لنگڑے، لولے اور ابا بیج مرد و عورت ہر وقت پڑے رہتے تھے۔ غدر کے بعد ان کی آمدنی کچھ اوپر ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار کی ہو گئی تھی اور کھانے پینے کا خرچ بھی کچھ لیا چڑا نہ تھا، مگر وہ غریبوں اور محتاجوں کی مدد اپنی بابت سے

زیادہ کرتے تھے۔ اس لیے اکثر تنگ رہتے تھے، غدر کے بعد ایک بار نواب لفٹنٹ گورنر کے دربار میں اُن کو حسبِ معمول سات پارچہ کا خلعت مع تین رقوم جو اہر کے ملا تھا لفٹنٹ کے چہرے پر اسی اور عہدار قاعدے کے موافق انعام لینے کو آئے۔ مرزا صاحب کو پہلے ہی معلوم تھا کہ انعام دینا ہوگا۔ اس لیے اُنہوں نے دربار سے آتے ہی خلعت اور رقوم جو اہر بازار میں فروخت کرنے کے لیے بھجوری تھیں، چہرے پر لگا کر مالک مکان میں بٹھا دیا اور جب بازار سے خلعت کی قیمت آئی تب اُن کو انعام دیکر رخصت کیا۔

وہ اپنے اُن دوستوں کے ساتھ جو گردشِ عود گارہ سے بڑھ گئے تھے، نہایت شریفانہ طور سے سلوک کرتے تھے۔ دلی کے حامدین سے ایک صاحب جو مرزا کے دلی دوست تھے اور غدر کے بعد اُن کی حالت متعین ہو گئی تھی ایک روز چھینٹ کا فرغل پہنچے ہوئے مرزا سے ملنے کو آئے، مرزا نے کبھی اُن کو مالیدہ یا جامہ وار وغیرہ کے چنوں کے سوا ایسا حقیر کپڑا پہنے نہیں دیکھا تھا۔ چھینٹ کا فرغل اُن کے بدن پر دھنک کر دل بھر آیا، اُن سے پوچھا کہ چھینٹ آپ نے کہاں سے لی؟ مجھے اس کی وضع بہت ہی بھلی معلوم ہوتی ہے، آپ مجھے فرغل کے لیے یہ چھینٹ منگوادیں۔ اُنہوں نے کہا یہ فرغل آج ہی بنگرا یا ہے اور میں نے اسی وقت اسکو پہنا ہے۔ اگر آپ کو پسند ہے تو یہی حاضر ہے۔ مرزا نے کہا جی تو یہی چاہتا ہوں کہ اسی وقت آپ سے چھینکر پہن لوں مگر جاڑا شدت سے پڑ رہا ہے۔ آپ یہاں سے مکان تک کیا پنکر جائینگے؟ پھر ادھر ادھر دھنک کر کھونٹی پر سے اپنا مالیدہ کا نیا چٹھا اُٹا کر اُنہیں پہنا دیا اور اس خوبصورتی کے ساتھ وہ چٹھا اُن کی نذر کیا۔

**حافظہ** جیسی مرزا کی طبیعت میں دُر آکی اور ذہن میں جو دت اور سرعتِ انتقال تھی، سبطِ اُن کا حافظہ بھی نہایت قوی تھا۔ فکرِ شعر کا یہ طریقہ تھا کہ کثرات کو عالمِ سرخوشی میں فکر کیا کرتے تھے، اور جب کوئی شعر سرانجام ہوتا تھا تو کمربند میں ایک گرہ لگا لیتے تھے۔ اسی طرح آٹھ آٹھ دس دس گرہیں لگا کر سو رہتے تھے، اور دوسرے دن صرف یاد پر سوچ سوچ کر

تمام اشعار قلب بند کر لیتے تھے۔

**شعر نمبر ۱** شعر نمبر ۱ اور کتاب نمبر ۱ میں وہ ایک سستے آدمی تھے۔ کیسا ہی شکل معنوں پر وہ اکثر ایک سرسری نظریں اُسکی تہ کو پہنچ جاتے تھے۔ مولانا آرزوہ نے ”دور نہیں“ ”خواب نہیں“ اس زمین میں غزل لکھی تھی، اُس میں اتفاق سے مطلع بہت اچھا نکل آیا تھا۔ مولانا نے اپنی غزل دوستوں کو سُنا کر اُن سے کہا کہ ”اگرچہ بحر دوسری ہے مگر اسی ردیف و قافیہ میں نظیری کی بھی ایک غزل ہے جس کا مطلع ہے ۷

عشق عصیان است اگر ستونیت      کشتہ جرم زباں مغفور نیست  
اگر وہ اُردو میں مطلع کہتا تو یوں کہتا ۷

عشق عصیاں ہے اگر مخفی و مستور نہیں      کشتہ جرم زباں ناجی و مغفور نہیں

آؤ آج مرزا غالب کے ہاں چلیں اور بغیر اس کے کہ قائل کا نام لیا جائے۔ اپنا مطلع اور نظیری کا یہی اُردو مطلع مرزا کو سنائیں اور پوچھیں کہ کونسا مطلع اچھا ہے ”چونکہ نظیری کا مطلع اُردو ترجمہ سے بہت پست ہو گیا تھا۔ سب کو یقین تھا کہ مرزا نظیری کے مطلع کو ناپسند کریں گے اور مولانا آرزوہ کے مطلع کو ترجیح دیں گے۔ چنانچہ مولانا اور نواب صاحب اور بعض اور احباب مرزا کے ہاں پہنچے۔ معمولی بات چیت کے بعد مولانا نے کہا کہ اُردو کے دو مطلع ہیں ان میں آپ مجھ کو کہیں گے کہ کونسا مطلع اچھا ہے اور اُنہوں نے اول نظیری کے مطلع کا یہی ترجمہ پڑھا۔ ابھی مولانا اپنا مطلع پڑھنے نہیں پائے تھے کہ مرزا اُس مطلع کو سُن کر سر دھنسنے لگے اور متحیر ہو کر پوچھنے لگے کہ یہ مطلع کس نے لکھا اور اس قدر تعریف کی کہ مولانا آرزوہ کو یہ امید پڑی کہ اس سے زیادہ میرے مطلع کی داد ملے گی۔ چنانچہ اُنہوں نے اپنا مطلع نہیں پڑھا اور سب لوگ نہایت تعجب کرتے ہوئے وہاں سے اُٹھے۔

مرزا حقائق و معارف کی کتابیں اکثر مطالعہ کرتے تھے اور اُن کو خوب سمجھتے تھے۔ نواب مصطفیٰ خاں شفیقہ فرماتے تھے کہ میں شاہ ولی اللہ کا ایک فارسی رسالہ جو حقائق و معارف

کے نہایت دقیق مسائل پر مشتمل تھا، سطاالعہ کر رہا تھا اور ایک مقام بالکل سمجھ میں نہ آتا تھا، اتفاقاً اُسی وقت مرزا صاحب آنکھیں میں نے وہ مقام مرزا کو دکھایا۔ انہوں نے کسی قدر غور کے بعد اُس کا مطلب ایسی خوبی اور وضاحت کے ساتھ بیان کیا کہ شاہ ولی اللہ صاحب بھی شاید اس سے زیادہ نہ بیان کر سکتے۔

**ظرافت** ظرافت مزاج میں اس قدر تھی کہ اگر اُن کو بقول مولانا حالی بجائے جوان ناطق کے جوان ظریف کہا جائے تو بجائے، حسن بیاں، حاضر جوابی اور بات میں سے بات پیدا کرنا اُن کی خصوصیات میں سے تھا۔

**لطیفہ** ایک صحبت میں مرزا، میر تقی کی تعریف کر رہے تھے۔ شیخ ابراہیم ذوق بھی موجود تھے، انہوں نے سودا کو میسر پر ترجیح دی۔ مرزا نے کہا ”میں تو تم کو میسر ہی سمجھتا تھا مگر اب معلوم ہوا کہ آپ سودا ملی ہیں“

**لطیفہ** ایک دن مرزا گرمی اور ٹوکے موسم میں ایک تنگ دتا ریک کو ٹھری میں کسی دوست کے ساتھ چوسر یا شطرنج کھیل رہے تھے۔ مولانا آزرہ ٹھیک دوپہر کے وقت مرزا سے ملنے کو چلے آئے اور اُسی کو ٹھری میں پہنچے۔ مرزا کو رمضان کے مہینے میں چوسر کھیلے ہوئے دیکھ کر کہنے لگے کہ ”ہم نے حدیث میں پڑھا تھا کہ رمضان کے مہینے میں شیطان مقید رہتا ہے، مگر آج اس حدیث کی صحت میں تردید پیدا ہو گیا“ مرزا نے کہا ”قبلہ! حدیث بالکل صحیح ہے۔ مگر آپ کو معلوم رہے کہ وہ جگہ جہاں شیطان مقید رہتا ہے وہ یہی کو ٹھری تو ہے۔“

الغرض مرزا کی کوئی بات لطیف اور ظرافت سے خالی نہ ہوتی تھی اور بقول مولانا حالی اگر کوئی اُن کے تمام ملفوظات جمع کرتا تو ایک ضخیم کتاب لطائف و ظرائف کی تیار ہو جاتی۔

**لطیفہ** ایک روز دوپہر کا کھانا آیا اور دسترخوان بچھا۔ برتن جو بہت سے تھے، مگر کھانا نہ تھا۔ قلیل تھا، مرزا نے مسکرا کر کہا ”اگر برتنوں کی کثرت پر خیال کیجئے تو میرا دسترخوان نہ میرا کا دسترخوان معلوم ہوتا ہے اور جو کھانے کی مقدار کو دیکھیے تو یا تمہید کا“

**آموں کی غربت** فواکرمیں آم اُن کو نہایت مرغوب تھا۔ آموں کی فصل میں اُن کے دوست دور دور سے اُن کے لیے عمدہ عمدہ آم بھیجتے تھے اور وہ خود اپنے بعض دوستوں سے تعاضد کر کے آم منگواتے تھے۔

**لطیفہ** حکیم رضی الدین خاں جو مرزا کے نہایت دوست تھے، اُن کو آم نہیں بھاتے تھے ایک دن وہ مرزا کے مکان پر برآمدے میں بیٹھے تھے اور مرزا بھی وہیں موجود تھے، ایک گدھے والا اپنے گدھے لیے ہوئے گلی سے گزرا۔ آم کے پھلکے پڑے تھے۔ گدھے نے سونگھ کر چھوڑ دیے، حکیم صاحب نے کہا۔ دیکھیے آم ایسی چیز ہے جسے گدھا بھی نہیں کھاتا۔ مرزا نے کہا بے شک گدھا نہیں کھاتا۔

**لطیفہ** ایک محبت میں مولانا فضل حق نے مرزا سے آم کی خوبی دریافت کی، مرزا نے کہا۔ ”بھئی میرے نزدیک تو آم میں صرف دو باتیں ہونی چاہئیں، میٹھا ہو اور بہت ہو“ سب حاضرین ہنس پڑے۔

**ناؤ نوش** مرزا کو مدت سے رات کو سوتے وقت کسی قدر پینے کی عادت تھی، جو مقدار انہوں نے مقرر کر لی تھی اُس سے زیادہ کبھی نہیں پیتے تھے جس کبس میں بوتلیں رہتی تھیں اُسکی گنجی داروغہ کے پاس رہتی تھی اور اُسکو سخت تاکید تھی کہ اگر رات کو سرخوشی کے عالم میں مچھکڑ زیادہ پینے کا خیال پیدا ہو تو ہرگز میرا کتا نہ ماننا اور کبھی مچھکڑ نہ دینا۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ وہ رات کو کبھی طلب کرتے تھے اور نشہ کی جھانجھ میں داروغہ کو بہت بُرا بھلا کہتے تھے۔ مگر داروغہ نہایت خیر خواہ تھا ہر گنجی نہ دیتا تھا۔ اول تو وہ مقدار میں بہت کم پیتے تھے۔ دوسرے اُس میں دو تین جھتے گلاب ملا لیتے تھے، جس سے اُسکی حدت اور تیزی کم ہو جاتی تھی، چنانچہ ایک جگہ کہتے ہیں کہ آسودہ باد خاطر غالب کہ جوئے است آمیختن بہ باد صافی گلاب را

مگر باوجود اس قدر احتیاط اور اعتدال کے اس کا فرنیٹے کی عادت نے آخر کار مرزا کی صحت کو سخت صدمہ پہنچایا جس کی شکایت سے اُن کے تمام اہل دور و رقعات بھرے پڑے ہیں۔

**لطیفہ** ایک روز میر ہمدی مجروح بیٹھے تھے اور مرزا پلنگ پر پڑے ہوئے کرا رہے تھے۔ میر ہمدی پاؤں دابے لگے۔ مرزانے کہا بھی تو سید زادہ ہے۔ مجھے کیوں گتھا کرنا ہے؟ انہوں نے نہ مانا اور کہا آپ کو ایسا ہی خیال ہے تو پیر دابے کی اجرت دیدیجئے گا۔ مرزانے کہا ہاں اس کا مضائقہ نہیں جب وہ پیر داب ٹھکے، انہوں نے اجرت طلب کی۔ مرزانے کہا ”بھیا کیسی اجرت؟“ تھے میرے پاؤں دابے، میں نے ہمارے پیسے دابے حساب برابر ہوا۔“

**لطیفہ** ایک دن قبل غروب آفتاب کے مرزا صاحب شام کا کھانا کھا رہے تھے اور کھانے میں صرف شامی کباب تھے۔ مولانا حالی بھی وہاں موجود تھے اور اُن کے سامنے بیٹھے رومال سے کلمبیاں جھل رہے تھے۔ مرزانے کہا ”آپ ناحق تکلیف فرماتے ہیں، میں ان کبابوں میں سے آپ کو کچھ نہ دوں گا۔“

**اسلام کا یقین** مرزا اسلام کی حقیقت پر نہایت پختہ یقین رکھتے تھے اگرچہ انہوں نے تمام عبادات اور فرائض و واجبات میں سے صرف دو چیزیں لے لی تھیں، ایک توحید و جدوی، اور دوسرے نبی اور اہلبیت نبی کی محبت اور اسی کو وہ وسیلہ نجات سمجھتے تھے۔

اگرچہ مرزا کا اصل مذہب صلح کل تھا۔  
 آزادہ و ہوں اور مراصلح کل ہرگز کبھی کسی سے عداوت نہیں مجھے  
 مگر زیادہ تر اُن کا میلان طبع تشیع کی طرف پایا جاتا تھا اور جناب امیر کو وہ رسول خدا کے بعد تمام اُمت سے افضل جانتے تھے۔

**انصاف** جب تک کوئی شعر مرزا کے دل میں نہ چبھتا تھا اس سے مس نہ ہوتے تھے چنانچہ ان کے معاصرین اس بات سے آزرہ رہتے تھے اور جو شعر اُن کے دل میں چبھ جاتا تھا اسکی تعریف بھی ایسی کرتے تھے جو مبالغے کی حد کو پہنچ جاتی تھی۔ وہ درحقیقت کسی کے خوش کرنے کے لیے ایسا نہیں کرتے تھے بلکہ ذوق سخن اُن کو بے اختیار کر دیتا تھا۔ شیخ ابراہیم ذوق خلی نسبت مشہور ہے کہ مرزا کو اُن سے چشمک تھی ایک روز جبکہ مرزا شطرنج میں مصروف تھے منشی غلام علی

مرحوم نے ان کا یہ شعر کئی دوسرے شخص کے منسلک کر ڈھکھا ہے

ابو گمبر کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے  
خانِ مرحوم کہتے تھے کہ مرزا کے کان میں بھی اس کی بھنگ پڑ گئی فوراً شطرنج چھوڑ دی اور مجھ سے  
کہا بھیتانے کیا پڑھا؟ میں نے پھر وہ شعر پڑھا۔ پوچھا کس کا شعر ہے؟ میں نے کہا ذوق کا  
یہ شکر نہایت محبت ہوئے اور مجھ سے بار بار پڑھواتے تھے اور سر دھنتے تھے۔ اسی طرح  
مومن خاں کا جب یہ شعر سنا ہے

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا  
تو اس کی بہت تعریف کی، اور یہ کہا "کاش مومن خاں میرا سارا دیوان لے لیتا اور صرف یہ شعر  
مجھ کو دے دیتا" سو دا کا یہ شعر بھی اُنکو بہت پسند تھا ہے  
دکھائیے لیجا کے تجھے مصر کا بازار لیکن کوئی خواہاں نہیں وہاں جس گراں  
ایک محبت میں نواب مرزا خاں داغ کے اس شعر کو بار بار پڑھتے تھے اور اس پر روتے  
کرتے تھے

مُنِ روشن کے آگے شمع رکھ کر دیکھتے ہیں اُدھر جاتا ہے دیکھیں یا اُدھر پروانہ آتا ہے  
تقریظ لکھنے مرزا پر تقریظوں کی بے انتہا فرمائشیں ہوتی تھیں اور جیسا کہ ظاہر ہے تعریف  
کا ڈھنگ کی سعی فی الحقیقت بہت ہی کم کتابیں ہوتی ہیں۔ مرزا کی طبیعت چونکہ صلح جو  
اور مرتج و مرغباں واقع ہوئی تھی وہ کسی سے انکار تو نہیں کرتے تھے مگر تقریظ نگاری کا انہوں  
نے ایسا طریقہ اختیار کیا تھا کہ کوئی بات رستی کے خلاف بھی نہو اور صاحبِ کتاب خوش بھی ہو جا  
بہت سادہ سہل ہیں، یا مصنف کی ذات اور اُس کے اخلاق یا اُس کی محبت اور دوستی کے  
بیان یا اور لطیف اور پاکیزہ باتوں کے ذکر میں جو بے محل نہوں ختم ہو جاتا تھا۔ اخیر میں کتاب کی  
نسبت چند جملے جو اہلیت سے خالی ہوتے تھے اور مصنف کے خوش کرنے کے لیے کافی ہوتے  
تھے، لکھ دیتے تھے۔ اسی وجہ سے بعض اوقات ایسا بھی ہوتا تھا کہ لوگ مرزا سے شکایت کرتے

تھے کہ آپ نے سائنس میں مصالغہ کیا ہے۔

ایک مرتبہ منشی ہرگوپال تفتہ نے اپنے دیوان کی تقریظ کے متعلق مرزا سے شکایت کی انہوں نے اُس کے جواب میں ایک خط لکھا جس کے چند فقرے ہم یہاں نقل کرتے ہیں:-

”واللہ باللہ اگر کسی شاہزادے یا امیر زادے کے دیوان کا دیباچہ لکھتا تو اُسکی مدح اتنی نہ کرتا کہ جتنی تمہاری مدح کی ہے، ہم کو اور ہماری روش کو اگر پہچانتے تو اتنی مدح کو بہت جانتے۔ فقہ مختصر تمہاری خاطر کی اور ایک فقرہ تمہارے نام کا بدل کر اُسکے عوض ایک فقرہ اور لکھ دیا ہے۔ اس سے زیادہ بھٹی میری روش نہیں، ظاہر اتم خود فکر نہیں کرتے، اور حضرات کے بہکانے میں آجاتے ہو۔ وہ صاحب تو بیشتر اس نظم و شعر کو مہمل کہیں گے کس واسطے کہ اُن کے کان اس آواز سے آشنا نہیں۔ جو لوگ کہ قلیل کو اچھے لکھنے والوں میں جانیگے وہ نظم و شعر کی خوبی کو کیا پہچانیں گے“

**محققانہ نظر** مرزا کی دُرِاکی اور عالی نظری کی بڑی دلیل یہ ہے کہ وہ باوجودیکہ ایسی سائی میں گھرے ہوئے تھے جس میں سلف کی تقلید سے ایک قدم تجاوز کرنا، ناجائز سمجھا جاتا تھا اپنے فن میں محققانہ چال چلتے تھے اور اندھا دھند اگلوں کی تقلید ہرگز نہ کرتے تھے۔ وہ ایک خط میں تفتہ کو لکھتے ہیں ”یہ نہ سمجھا کرو کہ اگلے جو لکھ گئے ہیں وہ حق ہے، کیا اُس وقت آدمی احمق پیدا نہیں ہوتے تھے“

**حق پسندی** مرزا کے کلام پر اگر کوئی ٹھیک اعتراض کرتا تھا، یا کوئی عمدہ تعریف اُنکے شعر میں کرتا تھا، اُس کو فوراً تسلیم کر لیتے تھے اور شعر کو بدل ڈالتے تھے۔

**راست گفتاری** حالانکہ ایشیائی شاعری جس کی بنیاد جھوٹ اور مبالغے پر رکھی گئی ہے مرزا کی رگ و پے میں سرایت کر گئی تھی باوجود اس کے وہ روایت اور حکایت اور وعدہ و اقرارانہ بات چیت میں نہایت راست گفتار اور صادق الہجہ تھے۔ اسی لیے جو شخص اُنکے وعدے یا اقرار کا یقین نہ کرتا تھا اُس سے نہایت ناراض ہوتے تھے۔

تفضل حسین خاں مرحوم خلف دیوان فضل اللہ خاں سے مرزا نے اپنا دیوان مانگا ہے اور اقرار کیا ہے کہ میں اُس کو دیکھ کر واپس بھیج دوں گا۔ اُنہوں نے دیوان دینے سے انکار کیا ہے اُن کے انکار کے جواب میں مرزا لکھتے ہیں ”کیوں صاحب! یہ چاہتے ہیں کہ ہونا اور شاگردی و اُستادی سب پر پانی پھر گیا؟ اگر کوئی ہزار پانسو کی چیز ہوتی اور میں تم سے مانگتا تو خدا جانے تم کیا غضب ڈھاتے؟ میرا کلام! خرید آٹھ دس روپے کی! سودہ بھی میں یہ نہیں کہتا کہ مجھ کو دے ڈالو، تم کو مبارک رہے، مجھ کو مستعار دو، میں اُس کو دیکھ لوں، جو میرے پاس نہیں ہے اُسکی نقل کر لوں، پھر تم کو واپس بھیج دوں، اس طرح کی طلب پر نہ دینا دلیل اس کی ہے کہ مجھ کو جھوٹا جانتے ہو۔ میرا اعتبار نہیں، یا یہ کہ مجھ کو زار دینا اور ستانا بدل منظور ہے، وہ کتاب ابھی میرے آدمی کو دیدو۔ باللہ واللہ میں اُس میں سے جو میرے پاس نہیں ہے نقل کر کے بھیج دوں گا، اگر تم کو واپس نہ دوں تو مجھ پر لعنت اور اگر تم میری قسم کو نہ مانو اور کتاب حامل رقعہ کو نہ دو تو تم کو آفرین“

اسی طرح ایک خط میں نواب علاؤ الدین خاں کو لکھتے ہیں :-

بدستِ مرگ ملے بدتر از گمانِ تو نیست

مکر لکھ چکا ہوں کہ قصیدے کا سودہ میں نے نہیں کھا۔ مکر لکھ چکا ہوں کہ مجھے یاد نہیں کوئی رُباعیاں مانگتے ہو۔ پھر لکھتے ہو رُباعیاں بھیج، قصیدہ بھیج۔ معنی اس کے یہ کہ تو مجھ کو ہاں کہہ دے۔ اب کے تو مقرر بھیجے گا۔ بھائی قرآن کی قسم، انجیل کی قسم، توریت کی قسم، زبور کی قسم، ہنوز کے چار بیڑے کی قسم، دساتیر کی قسم، ژند کی قسم، پاؤند کی قسم، اُستاد کی قسم، گرد کے گرنے کی قسم نہ میرے پاس وہ قصیدہ، نہ مجھے وہ رُباعیاں یاد، کلیات کے باب میں جو عرض کر چکا ہوں

”برہانیم کہ ہستیم وہاں خواہ بود“

مرزا کی اسی راستبازی کا سبب تھا کہ وہ کوئی کام چھپا کر نہیں کرتے تھے۔ جو دل میں تھا وہی زبان پر تھا، جو خلوت میں کرتے تھے وہی جلوت میں بھی کرتے تھے، پس اگر اُن میں کوئی

عیب تھا تو ہی تھا جسکو ہر کس و ناکس جانتا تھا۔ مخفی عیبوں سے وہ بالکل پاک تھے۔

بعض اوقات ایسی فرمائشوں سے جتنے سرانجام کرنے میں اُن کو وقت اٹھانی پڑتی تھی بڑے لطف کے ساتھ پہلو بچاتے تھے، وہ مادہ تاریخ نکالنے سے ہمیشہ گھبراتے تھے۔ ایک بار نواب علاؤ الدین خاں نے اپنے لڑکے کی ولادت کی تاریخ اور اُس کے تاریخی نام کی فرمائش کی، اُس کے جواب میں لکھتے ہیں۔ ”شیر اپنے بچوں کو شکار کا گوشت کھلاتا ہے، طریق صید نگین سکھاتا ہے، جب جوان ہو جاتے ہیں آپ ترگا کر کھاتے ہیں۔ تم سنو ہو گے حسن طبع خدا داد رکھتے ہو، ولادت فرزند کی تاریخ کیوں نہ کہو؟ اسم تاریخی کیوں نہ نکال لو؟ کہ مجھ پر غمزہ دل مردہ کو تکلیف دو۔ علاؤ الدین خاں تیری جان کی قسم! میں نے پہلے لڑکے کو اسم تاریخی نظم کر دیا تھا اسی لئے نہ جیا، مجھ کو اس دہم نے گھیرا ہے کہ وہ میرے عرصہ طالع کی تاثیر تھی۔ یہ اسمدوح جیتا نہیں، نصیر الدین حیدر اور امجد علی شاہ ایک قصیدے میں چل دیے۔ واجد علی شاہ تین قصیدوں کے متحمل ہوئے، پھر نہ بھل سکے جس کی مدح میں دس بیس قصیدے کہے گئے وہ عدم سے بھی پرے پہنچا۔ نا صاحب دُہائی خدا کی! میں نہ تاریخ ولادت کہوں گا، نہ نام تاریخی ڈھونڈوں گا۔“

**تعلقات خانگی** مرزا کی بی بی جو الہی بخش خاں معروف کی بیٹی تھیں، وہ نہایت شفیقہ، پرہیزگار اور نماز و روزے کی سخت پابند تھیں جس قدر مرزا مذہبی معاملات میں بے پروا تھے، اُسی قدر اُنکی بی بی احکام مذہبی کی پابند تھیں، یہاں تک کہ بی بی کے کھانے پینے کے برتن الگ، اور شوہر کے الگ رہتے تھے، تاہم بی بی شوہر کی خدمت گزاری اور خبر گیری میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہ کرتی تھیں۔ مرزا صاحب ہمیشہ مردانے مکان میں رہتے تھے مگر اُن کے کھانے اور دو اٹھنڈائی اور بڑا دل وغیرہ کا انتظام سب گھر میں سے ہوتا تھا۔ مرزا میں جب تک چلنے پھرنے کی طاقت رہی، ہمیشہ وقت معین پر ایک بار وہ گھر میں ضرور جاتے تھے، اور بی بی اور اُن کے تمام رشتہ داروں کے ساتھ نہایت عمدہ برتاؤ رکھتے تھے، اور اپنی جان

سے بڑھکر ان کی ضروریات اور اخراجات کا خیال رہتا تھا۔ مگر چونکہ شوخی اور ظرافت اُن کی  
 طبیعت میں پڑی تھی، اُن کی زبان و لہجہ سے بی بی کی نسبت اکثر ایسی باتیں نکل جاتی تھیں جنکو نہ صرف  
 آدمی نفرت یا بے تعلقی پر محمول کر سکتا ہے۔

**لطیفہ** کسی نے امر او سنگھ نام ایک شاگرد کی دوسری بی بی کے مرنے کا حال مرزا کو لکھا  
 اور اُس میں یہ بھی لکھا کہ اُس کے بچے بچے تھے ہیں۔ اب اگر تیسری شادی نہ کرے تو کیا کرے؟  
 اور بچوں کی کس طرح پرورش ہو؟ مرزا اُس کے جواب میں لکھتے ہیں ”امراؤ سنگھ! کمال ہمارا  
 اُس کے واسطے رحم اور اپنے واسطے رشک آتا ہے۔ اللہ اللہ! ایک وہ ہیں کہ دو دو بار  
 اُن کی بیڑیاں کٹ چکی ہیں، اول ایک ہم ہیں کہ ایک اوپر پچاس برس سے جو بھانسی کا بھندا  
 گلے میں پڑا ہے تو نہ بھندا ہی ٹوٹتا ہے، نہ دم ہی نکلتا ہے، اُسکو سمجھاؤ کہ بھائی تیرے بچوں کو  
 میں پال لوں گا، تو کیوں بلا میں بھنستا ہے“ وہ ہمیشہ تعلقات خانگی کو چھوڑا ہوا ایک سخت  
 مصیبت بتایا کرتے تھے۔

**لطیفہ** جاڑے کے موسم میں ایک دن طوطے کا بچہ اس نے رکھا تھا، طوطا سردی کے سبب  
 پروں میں سمٹ چھپا لے بیٹھا تھا۔ مرزا نے دیکھ کر کہا ”میاں مٹھو! نہ تمہارے جو رو نہ بچے، تم  
 کس فکر میں یوں سر جھکا لے ہوئے بیٹھے ہو؟“

**لطیفہ** ایک دفعہ مرزا مکان بدلنا چاہتے تھے۔ ایک مکان آپ خود دیکھ کر آئے، اُس کا  
 دیوانہ تختہ تو پسند آگیا، مگر مجلس اخوند نے دیکھ سکے۔ گھر پر آکر اُس کے دیکھنے کے لیے بی بی کو بھیجا  
 وہ دیکھ کر آئیں تو اُن سے پسند ناپسند کا حال پوچھا۔ اُنہوں نے کہا کہ اس میں تو لوگ بلا بتاتے  
 ہیں۔ مرزا نے کہا کیا دنیا میں آپ سے بھی بڑھکر کوئی بلا ہے؟

**موت کی آرزو** مرزا یا تو اس وجہ سے کہ اُن کی زندگی فی الواقع مصائب اور سختیوں میں گزری  
 تھی، اور یا اس لیے کہ اُن پر ناظم حالات کا بہت زیادہ اثر ہوتا تھا، آخر عمر میں موت  
 کی بہت آرزو کیا کرتے تھے۔ ہر سال اپنی وفات کی تاریخ نکالنے اور یہ خیال کرتے کہ اس سال

ضرور مر جاؤں گا۔

**لطیفہ** ششہ میں انہوں نے اپنے مرنے کی تاریخ یہ کہی کہ ”غالب مرد“ اس سے پہلے کئی مادے غلط ہو چکے تھے۔ منشی جواہر سنگھ جو ہر تخلص جو مرزا صاحب کے مخصوصین میں سے تھے اُن سے مرزا صاحب نے اس مادے کا ذکر کیا۔ اُنہوں نے کہا حضرت! انشاء اللہ یہ مادہ بھی غلط ثابت ہو گا۔ مرزا نے کہا ”دیکھو صاحب تم ایسی فال منہ سے نہ نکالو، اگر یہ مادہ مطابق نہ نکلا تو میں سر سبز ہو کر مر جاؤں گا۔“

**اخیر عمر کی حالت** مرنے سے کئی کئی برس پہلے سے چلنا پھرنا بالکل موقوف ہو گیا تھا، اکثر وقت پلنگ پر پڑے رہتے تھے، غذا کچھ نہ ہی تھی چمچ چاٹ ساٹ دن میں اجابت ہوتی تھی۔ طشت چوکی پلنگ کے پاس ہی کسی قدر اوجھل میں لگی رہتی تھی جب حاجت معلوم ہوتی تھی تو پردہ ہوجاتا تھا، مگر خطوں کے جواب اس حالت میں بھی برابر یا خود پلنگ پر پڑے پڑے لکھتے تھے یا کسی دوسرے آدمی کو بتاتے جاتے تھے، وہ لکھتا ہوتا تھا مرنے سے چند روز پہلے بیوشی طاری ہو گئی تھی پہر پہر دودھ پیر کے بعد چند

**مرغن الموت کی حالت** سنٹ کے لیے افادہ ہوجاتا تھا۔ پھر بیوش ہو جاتے تھے۔ جس روز انتقال ہو گا اُس سے شاید ایک دن پہلے مولانا حالی اُن کی عبادت کو گئے تھے۔ اُس وقت کئی پہر کے بعد افادہ ہوا تھا اور نواب علاؤ الدین احمد خاں مرحوم کے خط کا جواب لکھوا رہے تھے۔ انہوں نے لوہارو سے حال پوچھا تھا۔ اُس کے جواب میں ایک فقرہ، اور ایک فارسی شعر جو غالباً شیخ سعدی کا تھا لکھوا یا۔ فقرہ یہ تھا کہ ”میرا حال تجھ سے کیا پوچھنے ہو؟“ ایک آدھ روز میں ہمایوں سے پوچھنا ”اور شعر کا دوسرا مصرع مولانا حالی کو یاد رہ گیا اور پہلا یاد نہیں رہا۔ وہ یہ ہے۔“ ”مکر وہ محمد اراکین سر تو سلامت“

مرنے سے پہلے اکثر یہ شعر و روزیاں رہتا تھا

دہم واپس بر سرِ ہواہ ہے عزیز نواب اللہ ہی اللہ ہے

**تاریخ وفات** آخر ذیقعدہ ۱۲۸۵ ہجری کی دوسری اور فروری ۱۸۶۹ء کی پندرہویں کو تہتر برس اور چار مہینے کی عمر میں دنیا سے رحلت کی اور درگاہ حضرت سلطان نظام الدین قدس سرہ میں اپنے خسر کے پائین مزار دفن کیے گئے۔ تاریخ وفات جس میں دس بارہ آدمیوں کو توار دہوا یاد رکھنے کے قابل ہے یعنی ”آہ غالب بجزو“ یہاں مولانا حالی کا قطعہ تاریخ وفات لکھا جاتا ہے :-

غالب نے جبکہ روضہ رضواں کی اہلی  
اُس دن کچھ اہل شہر کی افسردگی نہ پوچھ  
دنیا سے دل ہر اپنے پرائے کا سرد تھا  
دیکھا تو دل پہ ہاتھ تھا اور رنگ زرد تھا  
عینی داؤزی کا مگر ہسم نبرد تھا  
اگلوں کے ساتھ ساتھ مگر رہ نورد تھا  
دل تھا کہ فکر سال میں بے صرفہ گرد تھا  
(پس ہے کہ خواجہ راہ نمائی میں فرد تھا)  
حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا  
۲۴۹۶

غالب نے جبکہ روضہ رضواں کی اہلی  
اُس دن کچھ اہل شہر کی افسردگی نہ پوچھ  
دنیا سے دل ہر اپنے پرائے کا سرد تھا  
دیکھا تو دل پہ ہاتھ تھا اور رنگ زرد تھا  
عینی داؤزی کا مگر ہسم نبرد تھا  
اگلوں کے ساتھ ساتھ مگر رہ نورد تھا  
دل تھا کہ فکر سال میں بے صرفہ گرد تھا  
(پس ہے کہ خواجہ راہ نمائی میں فرد تھا)  
حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا  
۲۴۹۶

(اس میں تاریخ اور فکر کا تخرج ہے)

**جنازے کی نماز** مرزا کے جنازے پر جبکہ دلی دروازے کے باہر نماز پڑھی گئی مولانا حالی اور شہر کے اکثر علماء اور ممتاز لوگ بھیے نواب ضیاء الدین احمد خاں، نواب محمد مصطفیٰ خاں، حکیم حسن الشافعی وغیرہم اور بہت سے اہل سنت اور امامیہ دونوں فرقوں کے لوگ جنازے کی مشابعت میں شریک تھے۔ مسید صفدر سلطان نبیرہ بختی محمد خاں نے نواب ضیاء الدین احمد خاں مرحوم سے کہا کہ مرزا صاحب شیعہ تھے۔ ہم کو اجازت ہو کہ ہم اپنے طریقے کے موافق اُن کی تجہیز و تکفین کریں۔ مگر نواب صاحب نے نہیں مانا اور تمام مراسم اہل سنت کے موافق ادا کیے گئے۔

نظر میں ہے ہماری، جاوہ راہ فنا غالب کہ پیش راہ ہو عالم کے اجزائے پریشاں کا

مرزا کی شاعری اکتسابی نہ تھی بلکہ اُن کی حالت پر غور کرنے سے صاف  
**شاعری اکتسابی نہ تھی** ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ملکہ اُن کی فطرت میں ودیعت کیا گیا تھا۔ اُنہوں

نے گیارہ برس کی عمر میں شعر کہنا شروع کیا تھا اور بقول بعض آٹھ نو برس کی عمر میں۔ خود مرزا  
 کی زبانی سنا گیا ہے کہ میر تقی نے جو مرزا کے ہم وطن تھے، اُن کے لڑکپن کے اشعار سنکر  
 یہ کہا تھا کہ "اگر اس لڑکے کو کوئی کامل استاد مل گیا اور اُس نے اسکو سیدھے رستہ پر ڈال دیا تو  
 لاجواب شاعر بن جائیگا۔ ورنہ محلِ بکنے لگے گا۔" مرزا کے حق میں جو پیشین گوئی اُس ابوالشعر  
 میر تقی نے کی تھی اُسکی دونوں شقیں اُنکے حق میں پوری ہوئیں۔

**نثر اُردو** مرزا شہسوار تک ہمیشہ فارسی میں خط کتابت کرتے تھے۔ مگر سنہ مذکور میں جبکہ وہ  
 تاریخ نویسی کی خدمت پر مامور کیے گئے اور بہت دن بہر نیمروز کے لکھنے میں مصروف ہو گئے اُس وقت  
 بصورت اُن کو اُردو میں خط کتابت کرنی پڑی۔ وہ فارسی نثر اور اکثر فارسی خطوط جن میں قوت  
 متحیدہ کا عمل اور شاعری کا عنصر نظم سے بھی کسی قدر غالب معلوم ہوتا ہے نہایت کاوش سے لکھتے  
 تھے۔ پس جب وہ بہر نیمروز کی ترتیب و انتظام میں مصروف تھے تو اُن کو فارسی زبان میں خط کتابت  
 کرنی اور وہ بھی اپنی طرزِ خاص میں شاق معلوم ہوئی اور اُنہوں نے اُردو زبان میں خط لکھنے شروع  
 کیے۔ چنانچہ وہ ایک خط میں لکھتے ہیں:-

”زبانِ فارسی میں خطوں کا لکھنا پہلے سے متروک ہے۔ پیرانہ سری اور ضعف کے صدور  
 سے محنتِ بزدلی اور جگر کا دی کی قوت مجھ میں نہیں رہی۔ حرارتِ عزیزی کو زوالِ ہوا رہی حالِ ہوا  
 مضحل ہو گئے توئے غالب اب عناصر میں اعتدال کہاں“

غالباً اُردو زبان میں تحریر اختیار کرنے کو مرزا نے اول اول اپنی شان کے خلاف سمجھا  
 ہو گا۔ وہ اُس زمانہ کے خیالات کے موافق اُردو شاعری کو بھی داخلِ کمالات نہیں سمجھتے تھے۔  
 بلکہ اُس میں اپنی کسرِ شان جانتے تھے۔ چنانچہ ایک فارسی قطع میں جکی نسبت مشہور ہے کہ اس میں  
 شیخ ابراہیم ذوق کی طرف خطاب ہے۔ کہتے ہیں ۵

فارسی میں تانبہ بینی نقشہائے رنگ رنگ بگ بگزر از مجموعہ اُردو کہ بے رنگ سن است  
راست میگویم من از راست سرتوان کشید ہرچہ در گفتار فخر تست آل رنگ سن است

مگر بعض اوقات انسان اپنے جس کام کو حقیر اور کم وزن خیال کرتا ہے وہی اُسکی شہرت اور قبولیت کا باعث ہو جاتا ہے۔ مرزا کی عام شہرت ہندوستان میں جس قدر اُن کی اُردو شعر کی اشاعت سے ہوئی ہے ویسی نظم اُردو اور نظم فارسی یا نثر فارسی سے نہیں ہوئی۔ وجہ یہ کہ اُن کو تو فارسی زبان سے ملک میں عام آجہدیت پائی جاتی ہے۔ دوسرے کلام میں بعض خصوصیتیں ایسی ہیں جن سے لوگوں کے مذاق بالکل نا آشنا ہیں۔ اُردو کے اشعار بھی اپنے خاص طرزِ بیاں کی وجہ سے مشکل اور سخت شکل ہیں۔ ہاں نثر اُردو ایسی ہے جس سے خاص و عام سب یکساں لطف اور حظ اُٹھا سکتے ہیں۔

**تصنیفات** اگرچہ مرزا کی اُردو نثر کی قدر بھی جیسی کہ چاہیے ویسی نہیں ہوئی۔ لیکن بھر بھی مرزا کی **نثر اُردو** اُردو نثر کے قدردان بہ نسبت ناقدر دانوں کے ملک میں بہت زیادہ نکلیں گے مرزا کی اُردو نثر میں زیادہ تر خطوط و رقعات ہیں۔ چند تقریریں اور دیباچے ہیں، اور تین مختصر رسالے ہیں۔ جو برہان قاطع کے طرفداروں کے جواب میں لکھے ہیں۔ لطائف غیبی، تسبیح تیز اور نامہ غالب۔ اس کے بواچند اجزاء ایک نام تمام قسطے کے بھی ہیں، جو مرزا نے مرنے سے چند روز پہلے لکنا شروع کیا تھا۔ ان میں سب سے زیادہ دلچسپ اور لطف انگیز اُن کے خطوط ہیں جن میں سے زیادہ تر اُردوئے معلّیٰ میں اور اُس سے کم عود ہندی میں حج کر کے چھپوائے گئے ہیں اور بہت سے خطوط ان دونوں کتابوں کی اشاعت کے بعد دستیاب ہوئے ہیں جو مطبع مجتبائی میں چھپکر شائع ہو گئے ہیں۔

**مولانا حالی کی رائے** مولانا حالی نے جو رائے مرزا غالب کی نثر اُردو کے متعلق مرزا کی طرزِ تحریر پر یادگار غالب میں جیسے ہم نے مرزا کے حالاتِ زندگی اور افادہ کیے ہیں ظاہر کی ہے، ہمارے نزدیک اُسکا اعادہ کرنا اپنی رائے دینے سے بہتر ہے، مولانا حالی

خود اردو کے نامور مصنف، شاعر اور ادیب ہیں اور فنِ تنقید میں بے مثل ہیں اس لیے مولانا مرحوم کی رائے یہاں نقل کی جاتی ہے:-

”مرزا کی اردو خط و کتابت کا طریقہ فی الواقع سب سے نرالا ہے۔ نہ مرزا سے پہلے کسی نے خط کتابت میں یہ رنگ اختیار کیا، اور نہ اُن کے بعد کسی سے اُسکی پوری پوری تقلید ہو سکی۔ اُنہوں نے القاب و آداب کا پُرانا اور فرسودہ طریقہ اور بہت سی باتیں جنکو ستریلین نے نوازم نامہ نگاری میں سے قرار دے رکھا تھا مگر درحقیقت فضول اور دوراز کار محض سب اڑا دیں۔ وہ خط کو کبھی ”میاں“، کبھی ”برخور دار“ کبھی ”بھائی صاحب“ کبھی ”ہمارا راج“ کبھی کسی اور مناسب لفظ سے آغاز کرتے ہیں، اُسکے بعد مطلب لکھتے ہیں۔ اور اکثر بغیر اس قسم کے الفاظ کے سرے ہی سے مدعا لکھنا شروع کر دیتے ہیں۔

ادائے مطلب کا طریقہ بالکل ایسا ہے جیسے دو آدمی بالمشافہ بات چیت یا سوال و جواب کرتے ہیں..... بعضی جگہ مکتوب الیہ کو خطاب کرتے کرتے اُسکو غائب فرض کر لیتے ہیں؛ یہاں تک کہ جو لوگ مرزا کے اندازِ بیاں سے واقف نہیں وہ اُسکو مکتوب الیہ کا غیر سمجھ لیتے ہیں..... مرزا ایسے موقع پر سائل و مجیب کا نام نہیں لیتے اور نہ اُن کے نام کی علامت لکھتے ہیں مگر سوال جواب کے ضمن میں ایک یا لفظ لے آتے ہیں جس سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ سوال کیا ہے؟ اور جواب کیا؟ شاید قہقہے یا ناول میں یہ بات نہ چل سکے مگر خطوط میں تو مرزا نے یہ راہ بالکل صاف کر دی ہے۔

مرزا کی طرزِ تحریر کی جو خصوصیتیں اوپر مذکور ہوئیں یہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ اور لوگ اُس کی پیروی نہ کر سکیں مگر وہ چیز جس نے اُن کے مکاتبات کو ناول اور ڈراما سے زیادہ دلچسپ بنا دیا ہے وہ شوخیِ تحریر ہے جو اکتساب یا مشق و مہارت یا پیروی و تقلید سے حاصل نہیں ہو سکتی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ بعض لوگوں نے خط کتابت میں مرزا کی روش پر چلنے کا ارادہ کیا ہے، اور اپنے مکاتبات کی بنیاد بذلہ سخی و ظرافت پر رکھنی چاہی ہے مگر اُن کی اور مرزا کی تحریر

میں وہی فرق پایا جاتا ہے جو اصل اور نقل یا روپ اور بہروپ میں ہوتا ہے۔ مرزا کی طبیعت میں شوخی ایسی بھری ہوئی تھی جیسے ستار کے تار میں سر بھڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ اور تو تخیل جو شاعری اور غزلیت کی خلاق ہے اُسکو مرزا کے دماغ کے ساتھ وہی نسبت تھی جو قوتِ پُر کھٹا کر کے ساتھ۔ اگرچہ مرزا کے بعد نثر اُردو میں بے انتہا وسعت اور ترقی ہوئی ہے، علمی اخلاقی، پولیٹیکل سوشل اور مذہبی مضامین کے لوگوں نے دریا بہا دیے ہیں، بائیو گرافی، اور ناول میں بھی متعدد کتابیں نہایت ممتاز لکھی گئی ہیں۔ باوجود اسکے مرزا کی تحریر خط کتابت کے محدود دائرے میں بلحاظ دلچسپی اور لطیفیایاں کے اب بھی اپنا نظیر نہیں رکھتی۔

معلوم ہوتا ہے کہ مرزا خط لکھتے وقت ہمیشہ اس بات کو نصب العین رکھتے تھے کہ خط میں کوئی ایسی بات لکھی جائے کہ مکتوب الیہ اُسکو پڑھ کر غصہ اور خوش ہو۔ پھر جس رشتے کا مکتوب ہوتا تھا اُسکی سبب اور مذاق کے موافق خط میں شوخیاں کرتے تھے۔ مثلاً اپنے ایک دوست کو خط لکھا ہے: اُس میں اُن کی لڑکی کو جو بچپن میں مرزا کے سامنے آتی تھی اور اب جوان ہو گئی ہے بعد دعا کے لکھتے ہیں ”کیوں بھئی اب ہم اگر کوں آئے بھی تو ہم کو کیونکر دیکھیں گے؟ کیا ہمارے ملک میں بھتیجیاں چچا سے پر وہ کرنی ہیں؟“ یا مثلاً نواب امیر الدین احمد خاں کو جواب لکھیں وہ بارہویں اُن کے بچپن کے زمانے میں اُن کے رشتے کا جواب جس میں مرزا کو دادا صاحب لکھا تھا اس طرح لکھتے ہیں ”اے مردمِ چشمِ جہاں بینِ غالب! پہلے القاب کے معنی سمجھ لو، یعنی چشمِ جہاں بینِ غالب کی پتلی چشمِ جہاں میں تمہارا باپ مرزا علاء الدین احمد خاں بہادر اور پتلی تم۔ میاں تمہارے دادا تو نواب امین الدین خاں بہادر ہیں، میں تو صرف تمہارا دلدادہ ہوں“ مرزا نے بعض اُردو خطوں میں اور خاص کر اُردو تقریظوں میں مسخ عبارت لکھنے کا التزام کیا ہے۔ اگرچہ اس زمانہ میں ایسا التزام تکلفاتِ باروہ میں شمار کیا جاتا ہے خصوصاً اُردو جو بمقابلہ عربی یا سنسکرت وغیرہ کے ایک نہایت محدود زبان ہے وہ اس قسم کے تصنع اور ساختگی کی متحمل نہیں معلوم ہوتی، مگر مرزا نے جس قسم کی مسخ عبارت اُردو خطوں یا تقریظوں

میں لکھی ہے اُس پر یہ گرفتِ شکل سے ہو سکتی ہے..... مستحِ نثروں میں عموماً یہ عیب ہوتا ہے کہ دوسرے فقرے میں جو پہلے فقرے کی رعایت سے خواہ مخواہ قافیہ تلاش کرنا پڑتا ہے تو انہیں نقص اور آرد کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے اور اس لیے پہلے فقرے کے مقابلہ میں دوسرا فقرہ بسبب لزومِ ملائیم کے کم وزن ہو جاتا ہے۔ مگر مرزا کی صحیح نثر میں یہ بات بہت کم دیکھی جاتی ہے دوسرے فقرے میں تقریباً ویسی ہی بے تکلفی پائی جاتی ہے جیسی پہلے فقرے میں اور یہ بات اُسی شخص سے بن پڑتی ہے جو باوجود خوش سلیقگی اور لطیف طبیعت کے شاعری میں رعایت درجے کا کمال رکھتا ہو اور وزن و قافیہ کی جانچ اور تول میں ایک عمر بسر کر چکا ہو۔ یہاں انکی مثالیں لکھنے کی کچھ ضرورت نہیں ہے۔ مرزا کے اُردو ردقات میں اس کی مثالیں بکثرت موجود ہیں مگر یہ معلوم رہے کہ متفقہ عبارت مرزا خاص کر ان خطوں میں لکھتے تھے جن سے ہنسی، طرافت، اور مخاطب کا خوش کرنا مقصود ہوتا تھا۔ ورنہ واقعات کا بیان یا مصائب کا ذکر یا تعزیت یا ہمدردی کا اظہار ہمیشہ سیدھی سادی نثر عاری میں کرتے تھے۔

مرزا نے چند تقریظیں اور دیباچے بھی اُردو زبان میں لکھے ہیں اور ان سب میں صحیح و متفقہ عبارت لکھنے کا التزام کیا ہے، جو بے تکلفی اور صفائی مرزا کے اُردو خطوں میں پائی جاتی ہے وہ ان تقریظوں اور دیباچوں میں نہیں ہے۔ خصوصاً صحیح کی رعایت نے اُن میں آرد اور اور نقص کا رنگ زیادہ پیدا کر دیا ہے۔ لیکن مرزا کو اُس میں معذرت سمجھنا چاہیے۔ جو لوگ تقریظوں اور دیباچوں کی فرمائش کرتے تھے وہ بغیر ان تکلفاتِ بارود کے ہرگز خوش ہونے والے نہ تھے، جو طریقہ اس زمانہ میں ریویو لکھنے کا نکلا ہے اُس کو اب بھی بہت کم لوگ پسند کرتے ہیں، اور مرزا کے وقت میں تو اس کا کہیں نام و نشان بھی نہ تھا۔

بالنہمہ ان میں سے بعض نثر میں مرزا کی روشِ خاص میں نہایت ممتاز ہیں خصوصاً وہ دیباچہ جو انہوں نے مفتی تیر لال صاحب کی کتاب سراج المعرفت پر لکھا ہے، اُس میں جس خوبی اور متانت سے نصوف کے اعلیٰ خیالات ظاہر کیے ہیں اُس کے لحاظ سے کہا جاسکتا ہے

کہ اردو زبان میں تصوف کے اعلیٰ خیالات نہ اس سے پہلے اور نہ آئندہ ایسی عمدہ شریں کسی نے لکھے۔

اب ہم دیباچہ مذکور کا اقتباس ذیل میں درج کرتے ہیں۔

### دیباچہ راج المعرفت

”حق یوں ہے کہ حقیقت از روئے مثال ایک نام نہ وہم پیچیدہ سرستہ ہے کہ جس کے عنوان پر لکھا ہے ”لا مؤثر فی الوجود الا اللہ“ اور

خط میں مندرج ہے ”لا موجود الا اللہ“ اور اس خط کا لالہ والا اور اس راز کا بتانے والا وہ نامہ آدر اور نام آور ہے کہ جس پر رسالت ختم ہوئی ختم نبوت کی حقیقت اور اس معنی غامض کی صورت یہ ہے کہ مراتب توحید چار ہیں، اثاری، افطالی، صغالی، ذاتی۔ انبیائے پیشین صلوات اللہ علیہ انبیا و علیہم اعلان مدایح سے گانہ پر ماور تھے، خاتم الانبیا کو حکم ہوا کہ حجابِ نقیبات اعتباری اٹھا دیں، اور حقیقتِ پیرنگی ذات کو صورتِ الان کا کان میں دکھا دیں، اب گنجینہ معرفت خواص امت محمدی کا سینہ ہے، اور کلہ لا الہ الا اللہ مفتاحِ بابِ گنجینہ ہے۔  
 نہ ہے عامہ یونین کہ وہ اس کلام سے صرف نفی شرک فی العبادۃ مراد لیتے ہیں اور نفی شرک فی الوجود جمل مقصود ہے اُن کی نظر میں نہیں۔ مگر جب لا الہ الا اللہ محمد الرسول اللہ کیسے گے اُسی توحید ذاتی کے اعتقاد کی قدم گاہ پر آ رہیں گے۔ یعنی ہماری اس کلمہ سے وہ مراد ہے جو خاتم الرسل کا مقصود تھا۔ یہی حقیقت ہے شفاعتِ محمدی کی، اور یہی معنی ہیں رحمۃ اللعالمین ہونے کے، اور اسی مقام سے ناشی ہے ندا سے روح افزائے ”من قال لا الہ الا اللہ“  
 دخل الجنة“

قلم اگرچہ دیکھنے میں دو زبان ہے لیکن وحدتِ حقیقی کا راز داں ہے۔ گفتگوئے توحید میں لذت ہے کہ جی چاہتا ہے کوئی سو بار کہے اور سو بار سنے۔ نبی کی حقیقت ذو جہتین ہے، ایک جہت خالق کہ جس سے اخذ فیض کرتا ہے اور ایک جہت خلق کہ جس سے فیض پہنچاتا ہے۔  
 نبی را دو وجه است دجو کو خلق + یکے سوئے خالق یکے سو کو خلق

بدان وجہ از حق و دستغین بدین وجہ بر خلق باشد مغین

یہ جو صوفیہ کا قول ہے کہ "الوکایۃ افضل من المنیقۃ" یعنی اس کے صاف اور از روئے  
انصاف یہ ہیں کہ ولایت نبی کی کہ وہ وجہ الی الحق ہے افضل ہے نبوت سے کہ وہ وجہ الی الخلق  
ہے۔ نہ یہ کہ ولایت عام افضل ہے نبوت خاص سے جس طرح نبی مستغین ہے حضرت اہل بیت  
سے اسی طرح ولی مستغیر ہے انوار نبوت سے مستغیر کی تعفیل منیر پر اور مستغین کو ترجیح مغین  
پر ہرگز معقول اور عقلا کے نزدیک مقبول نہیں۔ اب وہ ولایت کہ خاصہ نبی تھی نبوت کیسا  
منقطع ہوگی اگر وہ فروغ کہ اخذ کیا گیا ہے مشکوٰۃ نبوت سے ہنوز باقی ہے نقل و تحویل ہوتی  
چلی آتی ہے اور جہلغ سے چراغ جلتا چلا جاتا ہے۔ اور یہ سراج ایزدی تا صبح طور قیامت شش  
رہیگا، اور اب اسی کا نام ولایت اور یہی شغل طریق ہدایت ہے۔ ولایت و ہدایت  
وہی حقیقت توحید ذاتی ہے کہ جواز روئے کلمہ لا الہ الا اللہ مشہور و عیوان اعمیان است  
اور منظور نظر اکابر ملت ہوئی ہے۔ اگر وہ بات کہاں کہ ایک بار لا الہ الا اللہ کہے اور دل  
نور معرفت سے منور ہو جائے۔ اور وہ عناصرین زیر دست کہاں کہ قائل لا الہ الا اللہ کو  
اگرچہ اس کے معنی اچھی طرح نہ سمجھا ہو قد مگاہ توحید پر قائم کر دے یعنی رسول مقبول  
واجب التعظیم قائل انا احمد بلاسم علیہ التحیۃ والتسلیم۔ اب سعادت بقدر ارادت ہے  
اور راحت بعد جراحت۔ سچ بھی تو ہے، آدمی کیونکر سمجھ سکے اور بطلان بدیہیات کے  
جواز پر اسکو کیونکر تسلی ہو، یعنی اس مجموع موجودات کو کہ افلاک و انجم و جبار و جبال اسی  
میں ہیں نیست و نابود محض جان لے اور تمام عالم کو ایک وجود مان لے۔

اے کردہ بار الش گفتا ریسچ در زلف سخن کشودہ راہ خم ویرچ

عالم کہ توجیز دیگرش میدانی ذاتیت بسیط منبسط دیگرش

جب اولیاء اللہ نے کہ وہ اطوار روحانی ہیں، دیکھا کہ نفوس بشری پر وہ غالب ہے  
اور بسبب استیلاء و ہم کے مشاہدہ وحدت ذات سے محروم رہ جاتے ہیں، ہر چند

اُن کو سمجھائیں گے، راہ پر نہ آئیں گے۔ ناچار اشتغال واذکار و صنع کیسے، تا قوتِ تخیل نہیں  
 آجھی رہے، اور رفتہ رفتہ بخودی طاری ہو جائے وحدت وجود اس طرح کی بات تو نہیں  
 کہ نہ ہو اور ہم اسکو بھیر یا بہ تکلف ثابت کیا چاہتے ہوں۔ سع دانی ہمہ دست و نژدانی ہمہ دست  
 وہم صورت گری اور پیکر تراشی کر رہا ہے اور معدومات کو موجود سمجھ رہا ہے۔ پس  
 جب وہ وہم شغل و ذکر کی طرف مشغول ہو گیا بے شبہ اپنے کام سے یعنی صورت گری اور پیکر  
 تراشی سے معزول ہو گیا۔ بیخیری اور بخودی چھا گئی اور وہ کیفیت جو موحّدین کو بحر و دھم حاصل معنی  
 ہے اس شغل کے نفس کو بخودی میں آگئی۔ ایک دریا میں جانکر کودا، ایک کو کسی نے غافل کر کے  
 ڈھکیں دیا۔ انجام دونوں کا ایک ہے۔ وہ لوگ جو وحدت وجود کو سمجھ لیں یہ میں نہیں کہتا کہ نہیں میں  
 مگر ہاں کم ہیں اور کہیں کہیں ہیں، اور ایسے نفوس کہ جو کسبِ حالتِ بخودی کے واسطے محتاج اشتغال  
 واذکار ہیں، بہت ہیں بلکہ بے شمار ہیں۔“

مولانا نذیر احمد کی  
 رائے مرزا کی شاعری پر  
 مولانا نذیر احمد اپنے ایک لکچر کے دوران میں مرزا غالب کی نسبت  
 فرماتے ہیں:-

”اس پر مجھ کو اسد اللہ خاں غالب یاد آئے کہ وہ بڑے مشکل گو شاعر تھے، وہ ابتدا میں  
 فارسی کہا کرتے تھے بلکہ فارسی بھی نہیں پاری اور پاری بھی نا آرمینہ بتازی۔ اس پر انوکھے استدلال  
 اچھوتی تشبیہات، لفظی تعقیدات۔ تو اُن کا کلام مشکل ہو ہی چاہے۔ کوئی شخص کہتا تھا کہ ایک تہ  
 انہی کے شعر کے اُن سے معنی پہچھے تو کچھ دیر تامل کرنے کے بعد فرمایا ”بھی اس وقت تو کچھ سمجھ میں  
 نہیں آتا کہ کیا کہا تھا۔“ اُن کو اپنی فارسی پر بڑا ناز تھا اور ریختہ گوئی کو مبذل اور دن مرتبہ سمجھتے تھے  
 لیکن انگریزی عمارت کی وجہ سے جو انقلابِ عظیم واقع ہو گیا تھا، اسکی صبح نمودار ہو چکی تھی اور زمانہ کہہ رہا تھا  
 کہ مرزا صاحب اس لباط کو نہ کیجئے کہ زبان فارسی نہ تو ہندوستان کی ملکی زبان ہے نہ اس میں علوم  
 ہیں۔ کیوں آپ اس کے پیچھے اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں۔ اگلے لوگ کچھ مستقل مزاج بھی زیادہ  
 ہوتے تھے، مرزا صاحب زیادہ متعلق تک اسی فارسی کو کر پڑے رہے مگر زمانے کے ساتھ کسی کی جہد

کیا چلے، خاص کر شاعری تو پیٹ بھرے کے شغل ہیں۔ اُس وقت جیسا کچھ شاہی دربار تھا، وہاں ریختہ ہی کی قدر تھی۔ ناچار مرزا صاحب نے بھی بادل ناخواستہ ریختہ کا منہ چڑانا شروع کیا میں مرنے مرنے کے طور پر اُن کے اُس وقت کے چند شعر پڑھتا ہوں۔

عمرِ ناز شوخی و مذاں برائے خندہ ہو      دعوئے جمعیتِ احباب جائے خندہ ہو

ہے عدم میں غنچہ جو عبرتِ انجام گل      یک جہاں زانو تاقل در قفائے خندہ ہو

گلہفتِ افسردگی کو عیشِ بیتابی حرام      ورنہ و مذاں و دل افشردن بے خندہ ہو

ایک اور تاکہ یہ خیال نہ ہو کہ میں قصداً اتفاقی بندشوں کو چھانٹ کر لایا ہوں،

لبِ خشک در تشنگی مردگاں کا      زیارتِ کدہ ہوں دلِ آزدگاں کا

ہمہ نا امید ہی ہمہ بدگمانی      میں دل ہوں فریبِ وفا خوردگاں کا

مرزا صاحب کی شاعری اس بات کا نمونہ ہے کہ زمانہ کیونکر اپنی خستہ می میں سے لوگوں کو نکالتا ہے، وہ مرزا جو ریختہ گوئی کو ننگ بچھتے تھے آخر آخر اپنی اُردو سے معنی پر فخر کیا کرتے تھے۔ مرزا کے ساتھ سے اُردو کے ساتھ معنی کا لفظ - فاعبر وایا اولی الابصار -

اور اُس کا جواب ڈاکٹر زمانہ بھی اٹھکھیلیاں کرتا ہوا چلتا ہے۔ کل جو بات مقبول تھی آج عبدالرحمن کی طرف سے مسترد ہے اور جو مسترد تھی وہ مقبول ہے۔ ایک وقت وہ تھا کہ مرزا

غالب کا کلام بڑے بڑے سخن فہم مشکل اور بعض اشعار کو مہمل بتاتے تھے آج وہ وقت ہے کہ اُردو شاعری میں کوئی اُن کا ہمسر نہیں مانا جاتا۔ کلام کے ادق ہونے میں تو آج بھی کسی کو شک نہیں لیکن آج اُن کے اشعار کو مہمل کہنا آسان نہیں۔ جن اشعار خندہ پر مولانا نذیر احمد خندہ کرتے ہیں اُن کی نسبت ایک فاضل اجل ڈاکٹر عبدالرحمن بخوری مرحوم لکھتا ہے:-

”خندہ کیا ہے؟ ارسطو کے زمانہ سے آج تک فلسفی اس سلسلہ پر غور کرتے آئے ہیں۔ ہمارے

زمانے میں کانٹ، اسپنسر، ہیکر، کریپلین، بین، لپس، میری ڈتھ اور برگساں نے اس پر تفصیل سے بحث کی جو، اور عجیب اور نادر نکات پیدا کیے ہیں۔ فقہہ ہمیشہ غلیوں میں بلند

ہوتا ہے، جہاں گرم محبت نہیں، یہ سازمحل بھی نہیں، اسی وجہ سے لکھنؤ کے قیصر باغ کے عیاشانہ  
 طبقوں کے زندہ، انشا اور تجرأت، اور اگرہ کے برت کی بولیوں کے گہنیا نظیر کے قہقروں کی  
 آواز آج تک بلند ہے اور میر تقی، میر درد اور غالب کے کلام میں جو دنیا سے نفور اور ہنگامہ  
 عالم سے دور رہنے والوں میں ہیں کمال سنجیدگی اور خاموشی کا اثر ہے۔ تھقہ، قدرت کا غلبہ، نفس  
 دور کرنے کا ذریعہ ہے، یہ محبت بخش ضرور ہے لیکن خود اخلاط کی زیادتی اور مرض کی علامت ہے۔  
 چنانچہ رنگین اور دیگر ہزل سر اشعار کا اصلی علان بذریعہ فصد ہونا چاہیے تمام مرض کی طبیعت میں  
 خیالات سفیدہ کو بالکل باریں۔ خندہ املا باریعوب کے لیے ایک تازیانہ ہے۔ اس میں نصاف  
 نہیں بلکہ ایک ظلم پایا جاتا ہے۔ سودا اور اکیر کے قہقروں کی یہی شان ہے۔ غالب کی طبیعت  
 میں رحم ہے۔ وہ انسانی کمزوریوں پر لب آسا ہنستے نہیں بلکہ جہم آساروتے ہیں بلکہ خندہ لاطفی  
 کی علامت ہے۔ زندگی کو جو شخص دور سے دیکھتا ہے اور خود بے پروا رہتا ہے وہ ہنستا ہے اور جو  
 قریب سے دیکھتا ہے اور اس میں شریک ہوتا ہے وہ نہیں ہنستا۔ غالب زندگی کی خارجی کیفیات  
 سے اندرونی جذبات کا اندازہ نہیں کرتے۔ بلکہ اپنے اندرونی جذبات سے خارجی کیفیات کا موازنہ  
 کرتے ہیں اس لیے غالب کے لب مہنی سے نا آشنا ہیں۔

خندہ غم سے ناواقف ہونے کی اور لطف خواب کی علامت ہے۔ اطفال شیرخوار سوتے  
 میں ہنستے ہیں لیکن جب بیدار ہوتے ہیں تو روتے ہیں جب تک انسان آلام معائب سے  
 شاسا نہیں ہوتا ہنستا رہتا ہے، لیکن جب دل ٹوٹ جاتا ہے تو بحر غم کے کوئی رفیق نہیں رہتا۔  
 بد نصیب مرزا سے تھقہ نشا طکی امید رکھنا بے جا توقع ہے۔

خندہ غم اور سکون کو چھپانے کا پردہ بھی ہے، اس سلسلہ پر برگساں اور غالب متفق ہیں۔  
 برگساں اپنی کتاب خندہ کے اختتام پر لکھتا ہے۔

”سمند میں سطح پر موجوں میں رقص اور ارتعاش پایا جاتا ہے لیکن عمق قلم میں ہمیشہ  
 امن و سکون ہوتا ہے۔ بالائے آب لہریاں آپس میں ٹکراتی ہیں اور کف لے آتی ہیں۔ بچے کھنکھاتا

کونش جانکوسا مل سے متعلقیت ہیں لیکن جب ہاتھ کو لکھ دیکھتے ہیں تو بحرِ بانی کے کچھ بھی نہیں پاتے۔  
 نغمہ زندگی کے سندر کا کھن ہے، جو شخص اس کے رقص کو فاصلے سے دیکھتا ہے خوش ہوتا ہے  
 اور آفتاب سے اُس کا آہلہ جسم روشن ہو کر طلسم نور نظر آتا ہے، لیکن جو قریب جاتا ہے محض قریب  
 پاتا ہے اور تلخ کام ہوتا ہے۔

مرزا یوں فرماتے ہیں:-

عزمِ نازِ شوخی و نذاں برائے خندہ ہی      دعوئے محبتِ احباب جائے خندہ ہے  
 ہوجن میں غنیمتِ عبرتِ انجیامِ گل      یک جہاں زانو تا مل در قہائے خندہ ہے  
 کھٹکے افسردگی کو میثِ مینائی حرام      در نہ و نذاں در دل افشردنِ نئے خندہ ہے  
 شورشِ باطن کے ہلِ احبابِ منکوردہ نیاں      دل محیطِ گریہ و لب آتشائے خندہ ہے

چونکہ ہم کو مرزا کی شاعری سے یہاں بحث کرنا منظور نہیں۔ بر سبیلِ تذکرہ صرف اس قدر  
 لکھ دیا ہے لہذا جو اصحابِ مرزا کی اردو شاعری سے دلچسپی رکھتے ہیں اُن کے لیے ڈاکٹر عبد الرحمن  
 بجنوری کے مقدمہ و دیوانِ غالب کا مطالعہ ایک ناگزیر شے ہے۔ ڈاکٹر مرحوم کے نزدیک "ہندوستان  
 کی الہامی کتابیں دو ہیں۔ مقدس وید، اور دیوانِ غالب۔ لوح سے تمت تک مشکل سے سو صفحے  
 ہیں، لیکن کیا ہے جو یہاں حاضر نہیں، کونسا نغمہ ہے جو اس سارے زندگی کے تاروں میں بیدار یا خوابیدہ  
 موج نہیں ہے، شاعری کو اکثر شعراء نے اپنی قدحِ نگاہ کے مطابق حقیقت اور مجاز، جذبہ اور وجد  
 ذہن اور تخیل کے لحاظ سے تقسیم کیا ہے۔ مگر تقسیم خود ان کی ناری کی دلیل ہے، شاعری انکشافِ حیات  
 ہے جس طرح زندگی اپنی نمود میں محدود نہیں شاعری بھی اپنے اظہار میں لائقین ہے۔

جمالِ الہی ہر شے میں ردنا ہوتا ہے، آفرینش کی قدرت جو صفاتِ باری میں سے ہے  
 شاعر کو بھی اِزانی کی گئی ہے۔ جہاں ملائکہ کا رخاۂ ایزدی میں پوشیدہ حسنِ آفرینی میں مصروف  
 ہیں۔ شاعریہ کام علی الاعلان کرتا ہے۔

اس لحاظ سے مرزا کو ایک رب النوع تسلیم کرنا لازم آتا ہے۔ غالب نے بزمِ ہستی میں جو

قانون خیال روشن کیا ہے۔ کونسا ”پیکرِ تصویر“ ہے جو اس ”کاغذی پیریں“ پر منانِ دلِ زیست  
 قطع کرتا ہوا نظر نہیں آتا“



## ماسٹر رام چند

آپ کے حالاتِ زندگی یا تاریخِ پیدائش و وفات کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ صرف اس قدر  
 معلوم ہوا ہے کہ پہلے آپ سرکار انگلشیہ کی ملازمت میں بعدہ مدرسی علوم انگریزی کی تعلیم  
 دہلی کالج میں دیتے تھے۔ مولوی محمد حسین آزاد، مولوی نذیر احمد، اور مولوی ذکاء اللہ جکا ذکرِ خیر  
 تیسرے دور کے مصنفین میں کیا گیا ہے آپ کے ارشد تلامذہ میں سے تھے اور اگرچہ آپ کا نام  
 ظاہر کرتا ہے کہ آپ ہندو ہیں لیکن دراصل آپ عیسائی مذہب رکھتے تھے جسکو آپ نے بڑے  
 مباحثوں کے بعد اختیار کیا تھا۔ آپ ریاستِ پٹالہ میں ڈائریکٹر سررشتہ تعلیم بھی مقرر ہو گئے  
 تھے۔ غالب خیال یہ ہے کہ آپ دلی کے رہنے والے تھے۔ اور اقامتِ دہلی ہی کے زمانہ میں  
 آپ نے ایک کتاب تذکرۃ الکاملین تحریر فرمائی۔ اس کتاب میں مشاہیرِ ہندوان دورِ وسہ کا ذکر ہے  
 جو آپ نے انگریزی اور عربی اور دیگر کتابوں سے ماخوذ کیا ہے۔ یہ کتاب آپ نے یکم اکتوبر ۱۸۹۹ء  
 کو اول مرتبہ شائع فرمائی اور اگست ۱۹۰۷ء میں تیسری مرتبہ مطبع نوکشور لکھنؤ سے چھپکر شائع  
 ہوئی۔ اس تیسرے ایڈیشن کا نسخہ ہمارے پیشِ نظر ہے۔ اس عہد کی اُردو کا نمونہ حسبِ ذیل  
 ہے۔ اس کتاب میں دو موصفات ہیں۔ ہر نامو شخص کی شبیہ بھی کتاب مذکور میں دی گئی ہے۔ آخری  
 حصہ میں انگلستان کے نامور فلاسفہ اور شعراء کا بھی ذکر ہے۔ اس کے بعد آپ نے چند  
 فارسی شعراء اور نیز ہندوستان کے نامور شاعر و امیک کا ذکر کیا ہے۔ شکر اچاچ اور  
 مہندس بہا سکر کو بھی اس کتاب میں جگہ دی گئی ہے۔ علاوہ ازیں آپ نے دو کتابیں اور  
 بھی تحریر فرمائی ہیں جن کا نام اصولِ علمِ ہیئت اور عجائبِ روزگار ہے اور جو ۱۸۹۷ء

میں دہلی سے شائع ہوئی ہیں۔

### حال اقلیدس مشہور مهندس یونانی کا

”اقلیدس مینا نوپتس کا“ پوتا نرقیس کا، اور صاحب جو بیڑ یا مشہور ہے۔ یہ حکیم قدیم زمانہ کا یونانی ملک شام میں رہنے والا مشہور صورت ہے اس کو علم ہندسہ میں دستگاہ کامل تھی اور اُسکی کتاب جو ارکان یعنی قواعد مشہور ہے وہ کتاب بزرگ قدر اور بہت مفید اور اصل علم ہندی کی ہے۔ یونان میں پہلے اُس سے اس وضع کی کوئی کتاب جامع نہیں تھی اور نہ بعد اُسکے کوئی ایسا ہوا اور اُس کا جماعت ریاضی دان یونان اور روم اور اسلام کے نے اعتبار کیا پس بعضے اُس کی شرح کرنے والے ہیں، اور بعضوں نے نئی شکلیں اُسکی کتاب میں بڑھائی ہیں اور بعضے فائدے نکالنے والے ہوئے ہیں جھکا ریونان کے اپنے اپنے مدرسوں کے دروازوں پر لکھ دیتے تھے کہ ہرگز مدرسہ میں جو شخص کہ محنت کش نہ ہووے، نہ داخل ہو، اور مراد انکی اس سے یہ تھی کہ وہ آدمی مدرسہ میں داخل نہ ہووے جس نے کتاب اقلیدس نہ پڑھی ہووے اور اور تصنیفات اقلیدس میں سے اس نوع میں کتاب لمفروضات ہے، کتاب لمناظظ کتاب ترکیب آدازوں کی اور سوائے ان کے اور کتابیں ہیں، یعقوب بن اسحق لکنی نے یہ کہا ہے کہ اقلیدس علم ہندسہ میں اپنے زمانہ کا سب سے دانا تر تھا۔ اقلیدس نے، ابو لونیوس کی دو کتابوں کو جو مخروطات میں ہیں تفصیل سے لکھا۔ پھر ایک صد بنایا جس سے معرفت ان پانچوں محبات کی حاصل ہو سکے اور اُسکو تیرہ مقالوں میں جو اقلیدس کی طرف منسوب ہیں داخل ہو گیا اور کتاب اُسکی جو قواعد ہندی میں ہے اُس کو حجاج بن یوسف بن مطر کوئی نے دو تفلیس کیں۔ اُن میں سے ایک ہارونی مشہور ہے، اور دوسری نقل کا نام مامونی ہے اور اُسی پر اعتماد کیا جاتا ہے اور اُسکو اسحق بن حنین نے نقل کیا اور ثنابت بن قرہ حرانی نے اُسکو اصلاح دی اور ابو عثمان دمشقی نے اُس میں سے کئی مقالے نقل کیے، ابن الندیم نے کہا ہے کہ میں نے اُس میں سے دسواں مقالہ

موصول میں علی بن احمد العمرانی کے خزانہ میں دیکھا تھا، سترہم میں۔ اور شکوک اس کتاب کے  
 ابرقن نے دفع کیے اور اُسکی شرح نیربیری اور کراچی نے کی اور لطیف الطیفت نے یہ  
 ذکر کیا ہے کہ اُس نے اقلیدس کا دسواں مقالہ رومی زبان میں دیکھا۔ اُس میں چالیس شکلیں  
 زیادہ تھیں بنیت اُس مقالہ کے جو لوگوں کے پاس ہے، اُس میں ایک سو نو شکلیں ہیں (تو اس  
 میں ۴۹ ہوئیں) اور اُس نے اُسکو عربی میں ترجمہ کرنے کا ارادہ کیا اور یوحنا القس نے ذکر  
 کیا ہے کہ وہ شکل جس کا ثابت اُس مقالہ اولیٰ میں دعوئے کیا ہے اور اپنی بتائی ہے میں نے وہ  
 یونانی میں دیکھی ہے اور لطیف نے ذکر کیا ہے کہ میں نے اُسکو دکھائی ہے اور شرح کتاباقلیدس  
 کی ابو جعفر خراسانی اور ابوالوفا بوجانی نے کی مگر تمام نہیں کی اور ابوالقاسم انطاکی نے تمام  
 کتاب کی تفسیر کی اور سند بن علی نے جو اُسکی تفسیر کی تو نو مقالہ اور کچھ دسویں کی کی ہے  
 اور دسویں کو ابوالیوسف رازی نے تقسیم کیا اور بہت خوب درست ابن عمید کے واسطے کیا ہے  
 کندھی نے کتاب اقلیدس کے اغراض میں ذکر کیا ہے کہ اس کتاب کو ایک شخص ابلیس نامی نے  
 تالیف کیا تھا اور اُس نے پندرہ مقالے لکھے۔ جب بہت زمانہ گزر گیا تو وہ کتاب بترک  
 ہو گئی۔ پھر کسی بادشاہ نے اسکندرانیوں میں سے علم ہندسہ کی طرف توجہ کی اور اُسکے زمانہ میں  
 اقلیدس موجود تھا اُس بادشاہ نے اس کتاب کی اصلاح اور تفسیر کے لیے اقلیدس سے کہا۔  
 اُس نے اُس میں سے تیرہ مقالہ کی تفسیر کی۔ پس وہ اُسکی طرف منسوب ہو گئے۔ پھر بعد اُس کے  
 استقلال دس، اقلیدس کے شاگرد نے دو مقالے پائے، چودھواں اور پندرہواں۔ وہ بطور تحفہ  
 کے بادشاہ کو دیے۔ پس وہ دونوں بھی اُس نے کتاب میں ملا دیے اور یہ تمام واقعہ سکندریہ  
 میں ہوا اور ابوعلی الحسن بن الہشیم بصری نے جو خوش باش مصر کا ہے اس کتاب کے معاودات  
 کی شرح کی ہے اور اُسکے اعتراضات بھی اسی کتاب میں مع اُن کے جواب کے ہیں پھر ابوالحسن  
 قشیری اندلسی نے ذکر کیا کہ اس کتاب پر شرح ہے کسی اندلسی کی اور اُسکا نام وابستہ ہے  
 اور اُس کا یہ قول تھا کہ میری شرح بیت المقدس سنہ پان سو پچانوئیں میں تمام ہوئی اور اقلیدس

کی تصنیف کی اور چند کتابیں ہیں۔ مجملہ اُن کے سوائے اس کتاب کے کتاب الطاہرات ہے، کتاب اختلاف المناظر، کتاب لمعطیات، کتاب النعم بیگانی اسکے نام پر کتاب العتمة ثابِت کی اصلاح ہے۔ کتاب لغوائہ بیگانی، اُسکے نام پر کتاب لقانون، کتاب ثقل اور خفت کی کتاب الترتیب بیگانی اُسکے نام پر کتاب التحیل اُسکے نام پر فقط۔

ذکر کملائے ہند از قوم ہنود، حال والمیسکی جی ہساراج

”صاحبان دانش دینیش پرظا ہر سو کہ زمانہ قدیم میں ایسے ایسے فاضل اور کامل شخص قوم ہنود میں گزرے ہیں کہ وہ فضیلت میں اچھے اچھے حکمائے فرنگ اور یونان کے سے کم نہیں تھے لیکن نہایت افسوس کی بات ہے کہ اُن بزرگوں کے حالات نہیں ملتے، سوائے نام کے ہم اور کچھ نہیں جانتے۔ ہم کیا کریں کہ ہمارے ہوطنوں نے کبھی اس طرف توجہ نہیں کی کہ ایسے ایسے خدائیدہ اور کامل شخصوں کے حالات لکھیں۔ لیکن خیر جیسا کچھ مجھ کو چارپانچ بزرگوں کا حال معلوم ہوا ہے تھے المقدور راست ان چند اوراق میں درج کرتا ہوں، چنانچہ اول میں ذکر والمیسکی جی کا درنگ۔ ہنود میں والمیسکی جو کہ مصنف پاک کتاب رامائن کے ہیں بہت شہور بزرگ گزرے ہیں۔ نہایت افسوس کی بات ہے کہ ہم کو کسی کتاب میں نہیں معلوم ہوتا کہ یہ جناب کس جگہ پیدا ہوئے۔ اہل فرنگ نے اس بات سے کہ یہ بڑے نامی گرامی شخص ہنود میں گزرے ہیں، اُن کے حال کی تحقیقات کی، چنانچہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پندرہ یا سولہ برس پیشترین عیسوی کے والمیسکی جی کے قدم کی برکت سے باغ ہستی کو رونق تھی۔ بیان کرتے ہیں کہ وہ ایک ایک ایک غریب کے گھر پیدا ہوئے تھے اور اس باعث سے کہ اُن کے مربی غفلت تھے اُنہوں نے بڑی عمر تک تربیت نہیں پائی اور بے علم رہے جبکہ بڑی عمر ہوئی تو اُن کو فرص پڑا کہ اپنے ماباپ کی پرورش کریں۔ لاچار اُنہوں نے پیشہ ٹھگی اور قراتی کا اختیار کیا (اور ان دنوں میں یہ بزرگ شخص بالکل علم کی روشنی سے جاہل تھے) اور ایک جنگل میں رہنا شروع کیا۔ اور ضلالت ہو گئی اور کشتناگر تھیں جو مسافر کہ گزرا اُسکو لوٹنا اور قتل کرنا اختیار کیا۔ یہ معلوم نہیں کہ یہ پیشہ

انہوں نے کب تک رکھا، اور سب چھوڑ دینے اس بد پیشہ کا یہ ہوا کہ ایک روز تین برہمن جنگو  
 ہمارے بزرگ برہما اور روشن اور نارو کہتے ہیں اُس جنگل میں سے گزرے جہاں کہ الہیکی جی  
 رہتے تھے۔ والہیکی جی نے جب ان تین برہمنوں کو دیکھا استعداد اُن کے قتل کا ہوا اور چاہا کہ اُن  
 کو جان سے ہلاک کر کر اُن کا مال لے لیجے، لیکن اُن برہمنوں نے کہا کہ اسے والہیکی تو ہماری  
 بات سُن لے بعد ازاں تجھے کو اختیار ہے تو چاہے جو کچھ ہمارا کھیرے۔ والہیکی نے قبول کیا تب اُن تین  
 برہمنوں نے کہا کہ اسے والہیکی تو جو رب العالمین کے بندوں کو مارتا ہے اور ستاتا ہے اور  
 اس گنہ و عظیم میں داخل ہوتا ہے اس کا کیا باعث ہے۔ اُس نے جواب دیا کہ واسطے پرورش  
 اپنے ما اور باپ اور کنہیہ کے یہ کام کرتا ہوں تب اُن برہمنوں نے یہ کہا کہ ایک بات تو اپنے  
 ما باپ سے پوچھ آ کہ تو جو گناہ کرتا ہے اور جانیں تلف کرتا ہے تیرے گناہ کے وہ بھی شریک ہونگے  
 یا نہیں یعنی جبکہ تجھ کو تیرے اعمالوں کی سزا ہوگی تو تیرے شریک تیرے ما اور باپ بھی رہیں گے یا نہیں  
 یہ بات والہیکی نے قبول کی اور اُن تینوں برہمنوں کو تین درختوں سے بخوبی مضبوط باندھ کر خود اپنے  
 گھر اس سوال کا جواب استفسار کرنے چلا گیا جب وہ گھر پہنچا اُس نے اپنی والدہ اور باپ سے  
 پوچھا کہ میں جو تمہارے واسطے یہ گناہ کرتا ہوں اس کے تم بھی شریک ہو یا نہیں، انہوں نے  
 صاف جواب دیا کہ ہم اس باپ میں تیرے شریک نہیں جو کوئی جیسا فعل کر گیا اُس کا عوض  
 رب العالمین خاص اُس شخص کو جس نے فعل مذکور کیا ہے دیکھا۔ یہ سنکر والہیکی جی کے دل میں اثر پیدا  
 ہوا اور دل میں خیال کیا کہ میں اتنا گناہ اُجھرتا ہوں کس واسطے کہ میرا کوئی شریک نہیں اور واپس  
 آنکر ان تینوں برہمنوں مذکور کو درخت سے کھول کر خلاص کیا اور اُن کے رو برو تو یہ کی کہ ایسی  
 حرکت اور فعل نالایق بھرنہ کر دنگا جبکہ والہیکی جی ہمارا جی نے اس امر کو ترک کیا اور قادرِ مطلق  
 کی بنیاد میں توبہ کی اور پشیمان ہوا۔ اور اب توجہ اُن کی اس بات پر ہوئی کہ کسی طرح سے علوم و  
 فنون میں کمال حاصل کرنا چاہیے چنانچہ علم کی تلاش میں وہ تپ بن میں جو کہ ایک جنگل آٹھ میل  
 کے فاصلہ پر جسر کوٹ سے بے چلے گئے۔ (جسر کوٹ ایک پراثر فریب الہ آباد کے ہے)

اور اُن دنوں میں رکیشسر لوگ بھی بڑے فاضل و عالم خداریہ شخص اُس جنگل میں اللہ تعالیٰ کی یاد میں رہا کرتے تھے وہاں جا کر وائیکسی جی مہاراج نے ایک رکیشسر سے علم حاصل کیا اور نہایت کامل حاصل کیا لیکن مدت تحصیل علم بخوبی تحقیق نہیں ہے۔ بعد تحصیل کے وہ اُسی جنگل میں رہا کرتے اور یا وجی اور تحصیل علوم فلسفہ میں مشغول رہیں یہ نہیں معلوم ہوتا کہ کس زمانہ سے وائیکسی جی نے اشعار تصنیف کرنے شروع کیے، لیکن اُن کی استعداد فن شاعری میں بہت کامل تھی، جب مہاراج راجچندر سامی نے راوان دالی انگائیسی سیلون پر فتح پائی اور واپس واسطے لینے راج اجودھیا کے آئے تو تمام رکیشسر واسطے مبارکبادی کے گئے۔ اُس وقت میں مہاراج وائیکسی جی بھی تشریف راجچندر مہاراج کے پاس لے گئے۔ کہتے ہیں کہ سیتا جی قبیلہ رام چندر سامی نے وقت بن وہاں یعنی جلا وطنی میں بیچ جنگل تپ بن کے وائیکسی جی مہاراج کے گھر کو بھر دیا اور خیر خواہ ہم کو نہیں معلوم کہ یہ رکیشسر کب مرے اور کس سال میں اُن کی زندگی کا انجام ہوا۔ اُن کی تصنیفات میں سے نہایت مشہور اور پاک کتاب رامائن ہے۔ ان خداریہ کا حال بہت دلچسپ اور بڑا ہے لیکن چونکہ ہمارا مطلب اس چھوٹے سے رسالہ میں صرف مختصر اُلکھنا حالاتِ کاملین کا ہے اسی واسطے ان ہی چند سطور پر قناعت کی۔

—(\*)—

## مولانا غلام امام شہید

**حالات** آپ شاہ غلام محمد کے بیٹے تھے اور قصبہ امیٹھی ضلع لکھنؤ کے رہنے والے تھے۔ ہندوئیت کے نامور شاعر، مداح نبی اور عاشقِ رسول کے لقب سے مشہور تھے۔ نظم میں قلیل اور صحتفی کے شاگرد تھے۔ علوم متداولہ کی تحصیل مولوی حیدر علی صاحب کی خدمت میں کی تھی۔ فارسی زبان خوب جانتے تھے اور فارسی نظم و نثر میں آغا سید اسماعیل مازندرانی کے شاگرد تھے۔ سرکارِ نظام سے چار سو تیس روپیہ سال بلا شرط خدمت مقرر تھے۔ جو آخر وقت تک اُن کو ملتے رہے۔ آگے

آباد اجداد سب گوشہ نشین اور قناعت گزین تھے۔ لکھنؤ کے اطراف میں اور اگرہ، مراد آباد، رامپور، حیدر آباد اور الہ آباد میں آپ کے بہت مرید تھے۔ سر سالار جنگ بہادر سابق مدارالمہام ریسٹ حیدر آباد دکن، نواب کلب علی خاں رئیس امپور، سعید عالم خاں رئیس سورت اور اکثر رؤسا و امرا آپ کی بڑی عزت کرتے تھے۔ پیرانہ سالی میں آپ نے انتقال کیا۔ آپ کا تخلص شہید ہے۔ افسوس ہے کہ آپ کی تاریخ ولادت و تاریخ وفات معلوم نہیں ہوئی۔

اُردو نظم اور شریکین، جیسا کہ اُس زمانے کا رواج تھا اچھی لکھتے تھے۔ کلام اپنا کبھی جمع نہیں کیا۔ مجموعہ میلاد شریف اور انشائے بہارِ خیراں اور قصائد و غزلیات کا ایک مجموعہ آپ سے یادگار ہے۔

ذیل میں بطور نمونہ ایک فنہ تمینیت و تعزیت آمیز اور تاج گنج کے روضے کی تعریف درج کرتا ہوں، ناظرین آپ کی انشا پردازی کا اندازہ اس نمونہ سے خود کر سکیں گے۔ ۴

حاجتِ مشاطہ نیست روئے دلارام را

قوتِ تمینیت و تعزیت آمیز

مجموعہ انشائے شیریں زبانی، دیباچہ کتاب سخن معانی زاد حشمت، قلم بعد تشریح مراتب اشتیاق و آرزو مندی کے تعزیت کے مضمون سے آئینہ بھی بہا تا ہے اور کچھ خوشی میں آکر مبارکباد کا مضمون بھی زبان پر لاتا ہے۔ زمانے میں خوشی و غم دونوں کا چولی اور دامن کا ساتھ ہے اور دنیا میں چھوٹ چھاؤں کی طرح شادی کے ہاتھ میں ماتم کا ہاتھ ہے۔ دو پھول ایک ہی شاخ میں پھولتے ہیں۔ ایک دولہا دولہن کے سہرے کے کام آتا ہے، دوسرے تمینیت کی تربت پر چڑھایا جاتا ہے۔ دو موتی ایک سیپ میں پیدا ہوتے ہیں، ایک بادشاہ کے تاج میں لگاتے ہیں، دوسرے کو کھل میں پیکر دوایں ملتے ہیں۔ ایک بچی کا فورسہ دہمیں مٹی میں، ایک محفلِ سرود کے کام آتی ہے، دوسری مُردے کے مزار پر جلائی جاتی ہے۔ جن میں کلی اگر کھل کھلا کر مٹی ہے، شبنم بے اختیار اُس کے ہنسنے پر ردتی ہے جس باغ میں خزاں ہود ہاں بہا رہی ہے اور جہاں گل ہود ہاں خارجی ہے، بادام کے پستے

اور مغز کو دیکھیے کہ نرمی اور سختی ایک ہی جگہ نمود ہے۔ برف کو سوچئے تو گرمی اور سردی اُس کے ساتھ ہی موجود ہے۔ سرخی اور زردی گلِ رعنا کی دلیل ہے۔ تقدیر نے اگر صبح کو لباسِ سفید خوشی کا پہنایا تو شام کے واسطے جامہِ سیاہ مانتی بنایا۔ چل یہ کہ آپ کے والد ماجد نے عین عید کے دن انتقال فرمایا۔ گویا اسی گردشِ لیل و نہار کی خزاں و بہار کا تماشا دکھایا۔ اور اس غم نے جتناڑ لایا عتا آپ کی شادی نے اتنا ہی ہنسیا۔ اس فوس میں آسمان جو مانتی لباس پہنے نظر آیا تو شوق کی سرخی نے دہیں خوشی کا رنگ بھی دکھایا۔ رنج میں دو ہتر جو پہلے منہ پر بارا، تو پھر خوشی میں دہی دونوں ہاتھ اٹھا کر یوں دعا مانگی کہ خدا اُس مرحوم کو جنتِ نصیب کرے اور آپ سلامت رہیں اور نیا شادی مبارک ہو۔ بندہ بھی اداسے رحمِ فاتحہ خوانی و شرکتِ محفلِ شادمانی کے واسطے ضرور حاضر ہوا۔  
زیادہ والسلام۔

### تاج گنج کے روضے کی تعریف

آج قلم کا دماغ پھولوں کی خوشبو سے معطر ہے، کاغذ کا صفحہ آنکھ کی سفیدی کی طرح متوتر ہے۔ نظر کا ڈورا، رگِ گل کی طور پر رنگین ہے۔ نگاہ کا رشتہ نگہ سہ کے مانند بہاریں ہے کہیں واسطے کہ مجھے ایک باغ اور مکان کی صفت لکھنی منظور ہے جس کی سیر سے ختمِ مردم میں نور ہے، انگو صحن اور دالان میں خدا کی قدرت کا گل کھلا ہے چمن اور میدان میں صنائع کی صنعت کا تماشا ہے وہ کون مکان؟ اور کیسا گلستان؟ جو شاہجہاں ایسے بادشاہِ عالیجاہ کا قیام گاہ ہے۔ کون قصر؟ اور کیسا ایوان؟ جو جنابِ عالیہ بادشاہِ بگیم کا آرام گاہ ہے جس جگہ یہ دونوں آفتاب مہتاب سوتے ہیں۔ چاند اور سورج دن رات اُس زمین کے نشا ہوتے ہیں، تاجِ بی بی کا روضہ جہان میں مشہور ہے اور ہر چمن اُس کا جنت کی خوشبو سے معمور ہے۔ اکبر آباد کیا بلکہ سارے ہندوستان کو اس مکان سے عزت ہوئی ہے۔ ہندوستان کیا بلکہ تمام روضے زمین کو اُس سے زینت ہوئی ہے۔ اس چمن کی ہوانے جو ٹیکوں کی بوباس سے خیال کے دماغ کو معطر کر دیا تو باغ کی فضا نے دامنِ نظر کو گچھیں کے دامن کی طرح پھولوں سے بھر دیا۔

سبحان اللہ! کیا روضہ ہے! کہ رضوان جس کے لطف و لطافت سے راضی و خوشنود ہو  
 بارگاہ شریک باغ و حسین بہشت کی ہر نعمت موجود ہو۔ سورج اس باغ کا ایک زرد آلو ہے۔ چاند اس  
 چمن کا گلِ شبنو ہے۔ پہلے دروازے کی بلندی دیکھنے کو جو آسمان گردن اور سر اٹھائے تو اسکو  
 آفتاب کی گرہی سنبھالنی دشوار ہو جائے، دونوں بازو کے سرے سے محراب کی چوٹی تک ملے محمد  
 کا سورہ چوبِ قلم سے جو لکھا ہے عقل اس طلسمات سے حیران ہے کہ ہر حرف حبیبانزدیک سے  
 نظر آتا ہے، دیا دور سے دکھائی دیتا ہے۔ اس فن کے مبصر انصاف سے دیکھیں کہ یہ بات  
 کیسی مشکل اور کس طرح کی تقسیمِ کامل ہے۔ سنگ مرمر پر سنگ موسے کی پیچھے کاری کیے یا آنکھوں  
 کی سفیدی پر پتلیوں کی سیاہی کی نموداری حرف میں یا کافور کے قرص پر شکر کے دانے پڑے  
 ہیں۔ لفظ میں یا ہیرے کی تختی پر نسیم کے نگین جڑے ہیں۔ مینار آسمان کی طرف تعجب کا ہاتھ  
 اٹھائے ہے کہ یہ خم دیکھیے، اور اس بارگاہ کے ساتھ ہسری کا دھولے اور دم دیکھیے، محراب کا  
 خم، ابرو سے اشارہ کر رہا ہے کہ اندر جا کر ذرا بہار کا عالم دیکھیے۔ نہیں! نہیں! غلطی ہوئی مجھ سے  
 بلکہ محراب کا اشارہ یہ ہے کہ پہلے جو اس کو یہاں طاق پر رکھ جائیے تب آگے قدم بڑھائیے، پس  
 جو ادھر چمکٹ لائنگے کی عزیمت ہوئی تو ادھر عقل اور حکمت رخصت ہوئی۔ سیرت سیر ہونا تو  
 نگاہ کے ہاتھ ہے لیکن حیرت یہاں ہر قدم کے ساتھ ہے۔ سب کے پہلے ہائے عکس دار بڑی شوکت  
 اور شان کے ساتھ نظر پڑتے ہیں۔ یعنی دورو یہ سرود کے درخت نیک بخت جوان کی طرح حسن کے  
 جو بن سے اکڑتے ہیں۔ زمر کے جھاڑ کی تو کیا حقیقت ہے؟ جو اس کے ساتھ تشبیہ دوں، مگر  
 ہاں لکھوں تو یوں لکھوں کہ اچھے اچھے سبز پوش ہر قطار میں کھڑے ہو کر ناز و انداز سے انگریزوں  
 لے رہے ہیں۔ یا غلمان بہشت سے اگر آسمان کو اس باغ کی خوبیوں کی خبر دے رہے ہیں۔ نشوونما  
 جو ہر چیز کو بڑھاتی ہے شاید سرودی کے لباس میں کمر بستہ یہاں آتی ہے، یا آب و ہوا کی  
 لطافت سے سرود کے پردے میں آپ ہی بڑھی جاتی ہے۔ دونوں قطار کے درمیان جو ایک  
 جو من زمیں دو زاد و طویل ہے گویا فی سبیل اللہ سبیل ہے، صاف پانی سے بھرا ہوا ہے، اس

ہر سرور کے مقابل ایک ایک فوارہ چھوٹ رہا ہے۔ اُدھر سرور نے زمرد کے فوارہ کا نقشہ اُڑا لیا۔ اُدھر پانی کے فوارے نے ہیرے کو پانی کر کے بہا دیا۔ بعد اسکے ایک مربع حوض جو بہت سُتھرا ہے نہایت خوبصورت اور خوشنما ہے۔ آئینہ اُسے دیکھ حیرت میں آتا ہے، نگاہ کا قدم پھسلا جاتا ہے بہشت کی ہر اُسکا خزانہ ہے، آئینہ اُس کا آبدار خانہ ہے۔ بلکہ آئینہ میں یہ روانی کہاں ہے اور وہ موجوں کی سلسلہ جنبانی کہاں ہے پانی اُس کا دودھ سے زیادہ مصفا ہے، برف سے زیادہ ٹھنڈا ہے۔ چونہ جو شیر خشت ہو جائے تو روا ہے۔ پتھر جو بج در بہشت بن جائے تو بجاسے، چاروں طرف سے فوارے چھوٹتے ہیں گویا آسمان سے تارے ٹوٹتے ہیں، پانی کی زین سے پانی کا درخت نکلتا اور پانی ہی کے پھل پھول سے پھولنا، پھلنا خدا کی قدرت ہے، آئینے کے چشے سے موج کا کھرے ہو کر چلنا اور ہوا کے ساتھ زور گر کے اُچھلنا عجب حکمت ہے عقل نے جب فکر کے دریا میں غوطہ لگایا تو ریشے کے اُدھر حوض کے واقع ہونے کا سبب یوں سمجھیں آیا کہ نگاہ پہلے اُس میں نہا کر پاک ہوئے تب روضے کے طواف کی آرزو کرے، اور ناطقہ پہلے اسکے پانی سے کلیاں کر کے مُنہ صاف کرے۔ تب بہا کی صفت میں گفتگو کرے۔ اس حوض کی یاد میں دریا کی سہلی پھر گئی ہے، سینے میں آگ بج رہی تھی ہے جو شمع کھا کر دیکھنے آتا ہے گرد و بار سے سر ٹھوکر پھر جاتا ہے۔ جس طرف آنکھ اٹھائیے اور جدھر خیال دوڑائیے۔ بیلہ، جنبیلی، مونگرا، موتیا، چنپا، جوہی، کیسکی، کبڑا، گلاب، سدا بہار، گیند، داؤدیا، گلِ عباس، گلِ ہندی، نازبو، گلِ رعنا، گلِ فرنگ، گلِ چاندنی، شستہ، کلفا، سیوتی، دوپہرا سورج منجھی، لالہ، نافرمان، سون، ہزار زبان، نرگس حیراں، قلم قسم رنگ رنگ کے پھول پھول رہے ہیں، پیارے سہانے درختوں پر صبح شام کی دھوپ چھاؤں کا عالم، پتوں پر شبنم کی طراوت اور تم، ڈالیوں پر پتوں کا غل، پیروں کی آپس میں چھیر چھیل، اور جوانوں کے غول، ہمجولیوں کی مہنی اور ٹھٹھول۔ کہیں گل کے قہقہے، کہیں بلبل کے چھپے ہیں۔ سو اُدھر شور مچ رہا ہے، اُدھر مستوں کا جنون زور مچ رہا ہے۔ کوئل و ہاں کوک اُٹھتی ہے، سینہ میں یہاں ہوک اُٹھتی ہے پیہا جو اُدھر بولا۔ پی کہاں، تو یہاں بدن میں جی کہاں ہے؟ ڈیر کی اُدھر نئے نئے طوطے دھن سے ہوا دھر

حیات کے جامہ کی ادھیرٹن ہے، طوطی کی جبات ہے گویا نبات ہے، مینا کو شیریں کلامی سے کام ہے، ناکامی کا کام ہی تمام ہے۔ جگنو کا چمکنا، باغ کا ممکنہ، دونوں وقت کا ملنا۔ شبتو کا لہکتا۔ سنبل کا بال بھیرنا۔ پھلیوں کا حوض میں تیرنا۔ ہوا کا چلنا۔ دل کا چلنا۔ سبزی کا لہلہانا۔ چڑیوں کا بچھانا۔ شفق کا چوں گلزار خیال کا تاشا دکھانا ہے، یہ سارا دیکھ کر کوئی بھول سا بھولا نہیں سماتا، کوئی بوٹے گل کی طرح گریبان پھاڑ کر نکلا جاتا ہے، بیلابے لاگ دل کو کھینچتا ہے چنبیلی کی ایلیلی وضع پر روح شیدا ہے۔ مہندی کی ٹمٹیوں پر چاندنی لوٹ پوٹ ہے۔ جسکی بارے چاند کے جگر میں داغ اور دل پر چوٹ ہے، لالہ لعل سے بہتر، سبزہ زمرہ کا ہمسرا، کیاریوں کے کنارے کی ہری دوب کا شانی محل سے زیادہ خوب و مرغوب، درختوں کے ٹھلے میں یا دودھ کے بہرے ٹھوے پیالے ہیں۔ آبشار سے یا آئینہ پشت بدلیا ہے، دانی کی چادر پر جو نقش و نگار ہے، قلم قدرت کا یادگار ہے، نہر کی جو ایسی انھکیلیوں کی چال ہو تو دل کیونکر نہ پامال ہو؟ مٹیاب سرو کے ساتھ ہم آغوش ہے، یا کوئی جوان سبز رنگ بادل پوش ہے۔ گلزار کو دیکھ کر لعل انگاروں پر لوٹتا ہے سبز کے رشک سے زمرہ زہر کھاتا ہے، یہ لالے ہیں یا آتش کے پر کالے ہیں، جس کے دیکھنے سے جھینے کے لالے پڑتے ہیں، اور دل ہی دل میں داغ بڑھتے ہیں۔ چاندنی نے سبزے میں کمیٹ کیا ہے یا سبز محل پر معشیں کتر کے چھڑک دیا ہے۔ کفنی کو قلم کر کے ایسا برابر کیا ہے کہ اُسکے پتے اور پھولوں سے گویا سبز اور سرخ بوٹیوں کا غالیچہ بچھا دیا ہے۔ سولسری کی بھینی بھینی خوشبو ہے تو صبا کو اسی کی جستجو ہے۔ یہ ہارسنگھار کی گلابیاں ہیں یا آگ کی چنگاریاں ہیں۔ بیر بوٹیاں رنگتی ہیں، یا یا قوت کا خون بہہ چلا۔ لالہ زارچمن میں کھلا، یا چنار سے شعلہ نکل پڑا۔ اگر آب و ہوا کی لطافت یہی ہے تو موتی صدف سے نکل کر کلیوں کا روپ دکھائیگا اور مچھلی کا کانا سر سبز ہو جائیگا۔ میوے کا نام زبان پر آیا اور حلاوت کے صف میں بانی بھرا آیا۔ کولا۔ سنگترہ۔ رنگترہ۔ چکو ترہ۔ نارنگی۔ لیمو۔ زرد آلو۔ شفت آلو۔ زار۔ سیب۔ بھی۔ انگور۔ انتاس۔ ناشپاتی۔ کیلا۔ بیر۔ کمرکہ۔ شریفہ۔ کھٹل۔ بڑھل۔ انب۔ املی۔ جامن۔ پھلینہ۔ امرود۔ شہتوت۔ پونڈا۔ کھرنی۔ کوئی پھل ایسا نہیں جو اس باغ میں نہ ہوتا ہو

اور ساگ ترکاری سے لیکر جڑی بونی ٹمک کوئی ایسی شے نہیں جسے باغبان نہ بوتا ہو کہیں کوئے سنگترے  
 سے چمن کا چمن آگ بھوکا ہو گیا۔ کہیں فالے کی رنگت سے زمین کا دامن اودا ہو گیا۔ سیب سے  
 آسیب کی زحمت دفع ہو جاتی ہے۔ بھی بدن میں فرہی لاتی ہے، ناشپاتی سے روح رحت  
 پاتی ہے۔ انار نے خلق کے مُنہ یا قوت اور موتیوں سے بھر دیے۔ نازنینوں کے دانت کھٹے  
 کر دیے۔ ادنیٰ میوہ یہاں کا اخروٹ ہے جس پر ستاروں کا دل لوٹ پوٹ ہے، آسمان  
 دن رات توتوتو طرح تاک جھانک میں رہا۔ تب انگور کی ٹٹی سے ایک خوشہ پردین کا کھپتا  
 لے بھاگا۔ سو یا وصف اس پختہ کاری کے اب تک پکانہ سکا۔ کیلا یہاں ایک ایک گود میں  
 ہزار ہزار بھلتا ہے۔ ماہ تو ہاں آسمان پر اکیلا نکلتا ہے۔ اس زمین کا اگر خپڑہ یا سردا ہے  
 پوست میں مغز اُسکا حلوا ہے۔ ہندوانہ مرغِ روح کا آشیانہ ہے جس میں ایک ہی جگہ  
 موجود آب و دانہ ہے۔ شہتوت تمام عالم کا قوت۔ انجیر بالکل شکر و شیر۔ امرود حلوائے  
 بے دود۔ انبہ نازنینوں کے ہونٹھوں پر مہر خاموشی ہے، کہ میرے سامنے شیرینی کا دعوے  
 ناحق کوئی ہے۔ دوات قلم کی زبان چستی ہے۔ گویا نیشکر نہرایا۔ قلم کا غد کو چاٹتا ہے۔ آپ  
 جیوٹا بنا اور اُسکو مصری بنایا، مالی ڈالیاں سروں پر لیے جا بجا کھڑے ہیں۔ انعام کے لیے  
 اڑے ہیں، کوئی پھولوں کا مارلاتا ہے، کوئی گلدستہ دور سے دکھاتا ہے۔ پھر جو روضہ نظر  
 آیا تو وہ سماں آنکھوں میں سما یا کہ نہ دیدنے خواب کی آنکھوں سے کبھی دیکھا نہ شنیدنے خیال  
 کاؤں سے کہیں سنا۔ الٰہی یہ روضہ ہے یا خلدِ بریں، آسمان ہے یا زمین۔ سنہرا کلس ہے  
 یا سونج کی کرن، گنبد ہے یا نور کا مسکن۔ قبرستان ہے یا روضہ رضوان۔ مکان ہے یا جوارِ شہ  
 کی کان، جو پتھر ہے جو اہرات سے بہتر ہے۔ صبح نے مرمر کے ایسی صفائی پائی۔ تب سنگ  
 مرمر کی صورت بنائی۔ سنگ موٹے کو شعلہ بختی نے طور پر جلایا۔ تب اس درگاہ کے صحن  
 میں آیا۔ کلس کا سایہ دریا میں ایسا رہتا ہے جیسا بُرجِ آبی میں آفتاب۔ حوض میں چاند  
 ایسا نظر آتا ہے جیسا دریا میں حباب۔ دیوار میں مہر نظر آتا ہے گویا آئینہ ہے۔ بجلا کیا ہوا۔

گنبد سے دماغ تازہ ہوتا ہے گویا قرابہ ہے گلاب سے بھرا ہوا۔ صبح کی طباشیر اسٹرکاری کے صرف میں لائی گئی، جواب تک وہی نور کا عالم دکھاتی ہے۔ رات کا مشک اور شفق کی زعفران پیکر کار سے میں ملائی گئی جو آجکے ہی خوشبودار دماغ میں آتی ہے۔ آفتاب کے ترنج کا حرق بخور کر یا تناب کے پیالے میں سوتی کی آب سے ملایا تھا جو چہنے میں یہ نور اور ایسی صفائی ہے بہشت کے کافور کو شفق کے ساتھ آفتاب کی کمرل میں پیکر صبح کے دامن میں چھانا تھا جو رنگ نے یہ آب و تاب پائی ہے، جالیوں کی نزاکت میں عقل کام نہیں کرتی، کہ پتھر کو سوم کر کے بال کا فلم پار کر دیا۔ یا خیال کا جال ابھکر نگاہ کی نوک سے جیسا چاہا کام بنالیا۔ ہر ایک جالی میں وہ ملاحظت ہے کہ دیکھنے میں پتھر کی حالت ہے۔ کاغذ کی دھلی پر جڑوں کا ابھرا پن تو معلوم بھی ہوتا ہے۔ یہاں پتھر پر پتھر کی پتچے کاری کا نہ جو نظر آتا ہے نہ پیوند اور نہ جوڑ کہیں سے بہت ہے نہ بلند پس کہ شہید پس کر۔ اب لکھنے کی مست ہوس کر +



## خان بہادر منشی غلام غوث بختیار

**حالات** آپ کا نام منشی غلام غوث ہے اور جیتھیر تخلص ہے۔ آپ کے مورث اعلیٰ سلطان زین العابدین شاہ کشمیر کے رہنے والے تھے اور حکومت مغلیہ میں ان کے بزرگ عندہ ہائے قضا کشمیر پر مامور ہوئے، ان کے والد خواجہ حضور اللہ ترک وطن کر کے تبت چلے گئے، وہاں سے ریاست نیپال میں آئے اور وہیں اقامت اختیار کر لی چنانچہ جیتھیر ۱۲۳۱ ہجری میں وہیں پیدا ہوئے ان کی چار برس کی عمر تھی کہ والد اور نانا کو گردش زمانہ نے پھر ترک وطن پر مجبور کیا اور اس مرتبہ بنارس میں طرح اقامت ڈالی۔ یہیں سن شعور کو پہنچے اور تعلیم کا سلسلہ تکمیل کو پہنچا ۱۲۸۴ھ میں ملازمت کا سلسلہ شروع ہوا اور اپنے خالو خان بہادر مولوی سید محمد خاں میر منشی نواب لغٹنگ گورنر اضلاع شمال و مغرب کے نائب مقرر ہوئے۔ انہیں ایام میں لارڈ ڈائلن برائے گوالیار پر چڑھائی

کی تو یہ گورنر جنرل کے منشی خانہ میں منسلک ہو کر شریک ہم ہوئے اور جنگ کے خاتمہ پر بہ صلہ کارگزاری خلعت پایا۔ پھر کئی سال بعد اپنے خالو کی بجائے سیر منشی مقرر ہوئے اور ۱۸۵۷ء تک برابر اس عہدہ جلیلہ پر فائز رہے اور حکام میں اعلیٰ درجہ کا اعتبار اور وقار حاصل کیا۔ ۱۸۵۷ء میں سندھ و ضلع ہفت پارچہ مرحمت ہوا۔ آپ کو ملکہ معظمہ کے خطاب شاہی اختیار کرنے پر تمغہ قیصری ملا۔ ۱۸۵۸ء میں ۴ سال کی ملازمت کے بعد آپ نے پنشن لی۔ اور خطاب خان بہادر و اولاد سے مخاطب کیے گئے۔

شاعری اور انشا پر دازی میں آپ کو ایک تیزی درجہ حاصل تھا۔ اور آپ کے تعلقات مرزا غالب مرحوم سے دوستانہ تھے۔ آپ کی دو تصنیفیں خوننا بیچگر اور فغانِ بیخبر آپ سے یادگار ہیں۔ آپ نے پیرانہ سالی میں ۱۹۵۰ء میں انتقال فرمایا۔

مرزا غالب ہم یہاں مرزا غالب کے دو خط جو حاجہ غلام غوثیہ بیخبر کے نام لکھے گئے تھے نقل کرتے ہیں:-

”قبلہ! کبھی آپ کو یہ بھی خیال آتا ہے کہ کوئی ہمارا دوست جو غالب کہلاتا ہے وہ کیا کھانا پیتا ہے؟ اور کیونکر جیتا ہے؟ پنشن قدیم کہیںٹس حسد سے بند اور میں سادہ دل فریج جدید کا آرزو مند۔ اُس پنشن کا احاطہ پنجاب کے حکام پر مدار ہے تو اُن کا یہ شیوہ اور یہ شعار ہے کہ نہ روپے دیتے ہیں نہ جواب نہ مہربانی کرتے ہیں نہ عتاب خیر اُس سے قطع نظر کی، اب سُنئے! ادھر کی ۱۸۵۷ء سے بوجہ تحریر و زیر عطیہ شاہی کا امیدوار ہوں، تقاضا کرتے ہوئے شراؤں، اگر گنگا رہوں، گنگا نہ بہتا تو گولی یا بھانسی سے مرتا۔ اس بات پر کہ میں بے گناہ ہوں، مقتیدار مقتول نہ ہونے سے آپ اپنا گواہ ہوں۔ پیشگاہ گورنمنٹ کلکتہ میں جب کوئی کاغذ بھجایا بصر چیف سیکرٹریس کا جواب پایا ہے۔ اب کی بار دو کتا میں بھیجیں۔ ایک پیش کش گورنمنٹ اولیٰ نذیر شاہی۔ نہ اُس کے قبول کی اطلاع، نہ اُس کے ارسال سے آگاہی ہے۔ جناب سر ولیم میور صاحب بہادر نے بھی عنایت نہ فرمائی، اُن کی بھی کوئی تحریر نہج کو نہ آئی۔ یہ سب ایک طرف، اب

خبریں مختلف۔ کہتے ہیں کہ چیف سکتر بہادر لغٹن گورنر ہوئے۔ یہ کوئی نہیں کہتا کہ اُن کی جگہ کوئسے صاحب عالی شان چیف سکتر ہوئے۔ مشہور ہے کہ جناب ولیم میور صاحب صدر بورڈ میں تشریف لے گئے۔ یہ کوئی نہیں بتاتا کہ لغٹن گورنری کے سرکاری کام کس کو دے گئے۔ آپ کا حال کوئی نہیں کہتا کہ آپ کہاں ہیں؟ ہاں از روئے قیاس جانتا ہوں کہ آپ اُسی منصب اور اُسی دفتر میں شاد و شادماں ہیں جو اب لغٹنی کے سرکاری ہوئے ہونگے اُن سے علاقہ رہتا ہوگا۔ میور صاحب بہادر سے کاہے کو ملتا ہوتا ہوگا؟ لغٹن گورنری اور صدر بورڈ یہ دونوں محکمے الہ آباد آگئے یا آئینگے؟ بہر حال آپ اب کیوں آگرہ کو جائینگے؟ نواب گورنر جنرل بہادر کی روانگی کی بھی خبریں اختلاف ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ ۲۰ جنوری کو گئے۔ کوئی کہتا ہے فروری میں کوچ فرمائینگے۔ میں تو اُدھر سے بھی ہاتھ دھو بیٹھا۔ ہر طرح اپنی قسمت کو رو بیٹھا۔ مگر یہ چاہتا ہوں کہ حقیقت واقعی پر کما حقہ اطلاع حاصل ہوتا کہ تسلی خاطر اور تسکین دل ہو۔ اگر ان مطالب کا جواب نہ محل بلکہ مفصل، نہ دیر بلکہ جلد مرحمت کیجئے گا تو گویا جھکو مول لے لیجیے گا۔ زیادہ اس سے کیا لکھوں۔ فقط

پایان شب سیدہ است ﴿﴾ درنومیدی بسے امید است

قبلہ! آج آپ کی خوشی و خوشنودی کے واسطے اپنی روداد لکھتا ہوں۔ سنا ہے میں لارڈ صاحب بہادر نے میرٹھ میں دربار کیا، صاحب کشن بہادر دہلی، اہلی دہلی کو ساتھ لینگے میں نے کہا کہ ”میں بھی چلوں؟“ فرمایا کہ ”نہیں“ جب لشکر میرٹھ سے دلی آیا۔ میں موافق اپنے دستور کے روز بروز دوشکر مخیم میں گیا۔ میرمنٹی صاحب سے ملا۔ اُن کے خمیہ میں سے اپنے نام کا ٹکٹ صاحب سکتر بہادر کے پاس بھیجا۔ جواب آیا کہ تم قدر کے دنوں میں بادشاہ باغی کی خوشامد کیا کرتے تھے، اب گورنمنٹ کو تم سے ملنا منظور نہیں“ میں گدائے مہرم، اس حکم پر ممنوع نہ ہوا جب لارڈ صاحب بہادر کلکتہ پہنچے، میں نے تقیہ حسب معمول قدیم بھیج دیا، مع اُس حکم کے واپس آیا کہ ”اب یہ چیزیں ہمارے پاس نہ بھیجا کر دو“ میں مایوس مطلق ہو کر

بیٹھ رہا۔ اور حکام شہر سے ملنا ترک کیا اور آخر باؤگڑ شہر یعنی فردری ۱۸۶۴ء میں  
نواب لغٹ گورنر پنجاب دلی آئے۔ ابالی شہر صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر صاحب کشر  
بہادر کے پاس دوڑے اور اپنے نام لکھوائے۔ میں تو بیگانہ محض اور مطلقاً حکام معا  
ملک سے نہ ملا کسی سے نہ ملا۔ دربار ہوا۔ ہر ایک کامگاہ ہوا۔ شنبہ ۸ فردری کو آزادانہ نشی  
من پھول سنگھ صاحب کے خیمہ میں چلا گیا۔ اپنے نام کا ٹکٹ صاحب سکریٹری بہادر کے  
پاس بھیجا، بلالیا۔ مہربان پاکر نواب صاحب کی ملازمت کی استدعا کی۔ وہ بھی حاصل ہوئی  
دو حاکم جلیل القدر کی وہ غنائیں دیکھیں جو میرے تصور میں بھی نہ تھیں جملہ معترضہ سیرنشی  
لغٹ گورنری سے سابقہ معرفت نہ تھا۔ وہ بطریق حسن طلب میرے خواہاں ہوئے تو میں  
گیا۔ جب حکام مجھ کو دستہ عا مجھ سے بے تکلف ملے تو میں قیاس کر سکتا ہوں کہ سیرنشی کی طرف  
سے حسن خلق بایا ئے حکام ہوگا۔ بقیہ رودادیہ ہے کہ دو شنبہ راج کو سواد شہر مخیم خیم گورنری  
ہوا۔ آخر روز میں اپنے شفیق قدیم جناب مولوی انوار حسین خاں صاحب بہادر کے ساتھ گیا  
انٹائے گفتگو میں فرمایا کہ ”مہارادربار اور خلعت بدستور بحال و برقرار ہے“ ستیرانہ میں نے پوچھا  
کہ ”حضرت کیونکر؟“ حضرت نے کہا کہ ”حاکم حال نے ولایت سے آکر مہارے علاقہ کے  
سب کاغذ انگریزی و فارسی دیکھے اور باجلاس کو نسل حکم لکھوایا کہ اسد اللہ خاں کا دربار اور نمبر  
اور خلعت بدستور، بحال و برقرار ہے“ میں نے پوچھا کہ ”حضرت! یہ امر کس اصل پر تفریح ہوا؟“  
فرمایا کہ ”مجھ کو کچھ معلوم نہیں“ بس اتنا جانتے ہیں کہ ”یہ حکم دفتر میں لکھو اگر چہ وہ دن یا پندرہ دن بعد  
ادھر کو روانہ ہوئے ہیں“ میں نے کہا ”سبحان اللہ!“ سنحی

کار ساز مابہ فکر کار ما      فکر یاد کار ما آزار ما

شنبہ ۱۷ مارچ کو بارہ بجے نواب لغٹ گورنر بہادر نے مجھ کو بلا یا خلعت عطا کیا اور فرمایا کہ  
”لارڈ صاحب بہادر کے یہاں دربار خلعت بھی بحال ہے۔ انبالے جاؤ گے تو دربار خلعت  
پاؤ گے“ عرض کیا گیا کہ ”محضو کے قدم دیکھے، خلعت پایا، لارڈ صاحب بہادر کا حکم سن لیا“

میں نال ہو گیا۔ اب یہاں سے کہاں جاؤں؟ جیتا رہا تو اور دربار میں کاسیاب ہو رہوں گا۔“

شعر

کار دنیا کے مت نہ کرو ہرچہ گیر یہ مختصر گیسرید

بیخبر کی انشا پردازی اب منشی غلام غوث بخبر کی انشا پردازی کا نمونہ بدیہ ناظرین ہو۔

صبح

”رات آخر ہوئی، صبح صادق کا جلوہ نظر آنے لگا۔ تارے جرات کی تاریکی میں جھلک مک دکھا رہے تھے اپنی روشنی کو پکی دھچک کر شرمائے اور آہستہ آہستہ غائب ہوئے، جیسے چور نور کا تڑکا ہوتے ہی اپنے اپنے ٹھکانے کو بھاگتے ہیں۔ شب کی سیاہی کا رنگ اڑا، مشرقی افق پر سفیدی نمودار ہوئی۔ گویا محبوب صبح نے رات کے سیاہ بھرے ہوئے بالوں کو چہرے سے سمیٹ لیا اور اُس کی نورانی پیشانی نظر آنے لگی۔ نیم سحری معشوقوں کی طرح خوش خرامی کرتی ہوئی چلی، نرم نرم شاخیں درختوں کی، مستوں کے مانند مجھوٹے لگیں۔ جانوروں نے چھپا ہوا شروع کیا باغ میں غنچے کھلنے لگے، جیسے نیند سے کوئی آنکھ کھولے، دریا میں پتلی پتلی لہریں پڑیں، کاتھرت نے قلم شمع سے زربجہا کرنے کے لیے صفحہ آپ پر مسطر کیا۔ شاہی نوبت خانے کے کوس و دُہل کی آواز بلند ہوئی۔ اُسکی سُرٹا آواز سے لوگ نیند سے چونکے اور اپنے اپنے کام سے لگے۔ میکدہ کا دروازہ کھلا۔ بچوں نے صحن میخانہ کی رفت و روب کی۔ پیر منہ نے مراجمی اور ساغر سنبھال لائیکشو نے شب کے خامسکی سرگرائی دُخ کرنے کی غرض سے صحن کی فکر میں اُس طرف کی راہ لی۔ اُدھر مرغ نے اذان دی، اُدھر موتوں بھی اپنے دربے سے نکل صحن سجد میں آکھڑا ہوا، اُس کے گلے سے گلا ملانے لگا۔

یہ سنکر رات بھر کے جاگے ہوئے عابدانکڑائیاں لیکر سجادہ پر سے اُٹھے۔ جُتہ اور عمامہ سنبھال عصا ہاتھ میں لے مسجد کی راہ ناپنے چلے۔ بلکہ میں گھنٹے اور ناقوس بجے، برہمنوں نے پھول اور سیندور بتوں پر چڑھا کر بھیج دی بھیجن کا ناشروع کیا، صنم پرستوں نے

سجدہ بت کے لیے آمادہ ہو کر بیت الصنم کا ارادہ کیا۔

## دوپہر

”دوپہر کا وقت ہوا، آفتاب سمت الراس پر آیا، زمین تپنے لگی، پاؤں رکھتے چونس خوف آتا تھا کہ چھالے نہ پڑیں۔ بیٹھے ہوئے جی ڈرتا تھا کہ سانس کی گرمی سے لب پر بجائے نہ پڑیں، آسمان سے وہ آتشباری ہونے لگی کہ ہوائے شعلہ جوالہ کی صورت پیدا کی، خاک کے ذروں نے چنگاریوں سے ہیئت بدلی، جانوروں نے ڈر سے اڑنا سو قوت کیا کہ جسم جل کر کباب نہ ہو۔ زمین کی دہشت سے سکتہ کی حالت ہو گئی کہ دھوپ کی گرمی سے پگھل کر آب نہ ہو، دوکانداروں نے دوکانوں کے تختے لگا دیے اور اُس کی آڑ میں ٹہپے لوگوں کا گھروں سے نکلنا چلنا، پھرنا بند ہوا، بازاریں سنان ہو گئیں، دن نے رات کا سناٹا پیدا کیا۔ شہر، شہر خوشاں کا نقشہ بن گیا، چوپائے سائے میں کھڑے ہو کر ہانپنے لگے ہر درخت شکل چنار ہو گیا۔ دھوپ کی تابش سے معلوم ہوتا تھا کہ کھسٹا جل رہا ہے۔ گھاس مر جھا کر زمین سے ایسی لپٹ گئی جیسے کسی نے کاٹ کے ڈال دی ہو، چوروں کا بانی ایسا گرم ہو گیا کہ مسجدوں پر ہتھاموں کا گمان ہونے لگا۔ نوذوؤں نے چپکی سادھی، عابد بھی عبادت چھوڑ کر قبیلہ کی سنت ادا کرنے کے بہانے سے لیٹ رہے۔ برہمن بُتھانے کے کونے میں یوں خاموش ہو کر بیٹھا کہ بت بن گیا۔ سیکدہ میں منغ زانو پر سر رکھ کے اس شکل سے ہو بیٹھا کہ معلوم ہوتا تھا شے پر پالہ اوندھا دیا، غریبوں نے اپنے گھروں میں گھاس کی ٹٹیاں لگالیں مٹی کی صراحیوں پر کپڑا بھگو کے لپیٹ دیا۔ امیروں نے تہ خانوں میں آرام فرمایا جس کی ٹٹیاں چھڑکی جانے لگیں، فرشتی ٹپکے کھینچنے لگے۔ جن کی خوشبو سے ہوا کے جھوکوں پر لہجہ کا یقین آنے لگا۔ صراحیوں برف میں لگائی گئیں۔ شربت کی ٹٹلیاں جمائی گئیں۔“

## شام

”دن تمام ہوا بجٹ پیٹے وقت نے رات کی آمد کی خبر دی، مغربی گوشہ سے

تاریکی کا جوش ہوا۔ جیسے پہاڑ کے غار سے سیاہ ابراؤ منڈے۔ آفتاب دن کا تماشا ختم ہونے سے ایسا اُداس ہوا کہ منہ پر زردی چھا گئی۔ بادل ناخواسۂ مغرب کو چلا، لیلایے لیل نے شرم کے آفتاب جاتے ہوئے اُسے دیکھ نہ لے، سیاہ نقاب منہ پر ڈالا۔ ہوا جو دن بھر زور سے چل رہی تھی، دھیمی ہوئی اور تھکے ہوئے مسافر کی طرح آہستہ آہستہ چلنے لگی، درختوں کے پتوں نے کھر کھرانا، دریا کے پانی نے لہڑانا موقوف کیا، پالے ہوئے جانور جھدن کو چرائی کے صحرائیں کلیل کر رہے تھے، اُن کو زندان خانہ نصیب ہوا۔ جنگلی چوپایوں نے درختوں کے سایہ اور پہاڑ کے غاروں میں پناہ لی۔ دھپور نے فضاے آسمان سے ٹھنڈے موڑ کر کسی نے اپنے آشیانے کو رُخ کیا، کسی نے دشت پر بسیرا لیا۔ مسجدوں میں قندیلیں روشن ہوئیں۔ تنگہ دہلی میں سانجھی دی گئی، میخانوں میں خُم لے ثبات اور ساغر نے گردش سے ثوابت و ستار کے نقشے دکھائے۔ قدح نے، اہ تمام کا کام کیا، وہ روشنی پھیلانی کہ وہاں اندھیرا ہونے نہ دیا۔ آسمان پر ستاروں نے چراغاں کر دیا۔ چراغوں نے اپنی روشنی سے زمین کو آسمان بنا دیا۔ مسافروں نے بھر کے تھکے سراپوں میں آ پڑے۔ اُن کی دن بھر کی تھکائی آخر روز کا منظر اب کے راہ میں رات ہو جائے منزل پر پہنچنے کی جلدی، سرائے میں نا جنوں کی ہمانگی، بھٹیاریوں کی ناز برداری، گھر کا دھیان، اہل و عیال کا خیال، وطن کی یاد، یارانِ وطن کا تصور، دل کی شکستگی ایک قیامت تھی۔ اس مزے کو دہی جانتا ہے جس نے کبھی اپنی صبحِ وطن کو شامِ غربت سے بدلا ہے۔

”شہید کی انشاء بہار بے خزاں کی تعظیم“

”مردمِ دیدہ آج گھر بیٹھے بہشت کی سیر کرتے ہیں۔ اللہ اللہ صفحہ قرطاس پر کیا جوش بہارِ معانی ہے! تاریک گاہ میں بے تکلف موتی پر رونے جاتے ہیں واہ وا! کلبِ گمراہ کی کیا درافتا ہے! سبحان اللہ! یہ کیسی انشاء ہے؟ جس کے دیکھنے سے یہ لطف اُٹھتا ہے۔ کتاب ہے یا کلام؟ بے خزاں؟ جس صفحہ کو دیکھیے حاشیہ فردوس کی روشنیوں پر حاشیہ لکھتا ہے، جدول کے خطوط پر سلسبیل اور کوثر کا جی پانی پانی ہوتا ہے۔ سطرین سنبلستان ہیں، الفاظ گلستان ہیں، حرف

کی کشتوں پر سرواؤر شمشاد کا یقین ہوتا ہے، دائروں سے زرگستان آنکھوں کے تلے پھیلتا ہے جرفوں کی سیاہی سے کاغذ کی سفیدی وہ کیفیت دکھاتی ہے، گویا دھتوں سے چاندنی نے کھیت کیا ہے، کاغذ کی سفیدی پر جرفوں کی سیاہی کی وہ ہمارا نظر آتی ہے، جیسے صحن باغ پر بادل چھا رہا ہے، وہاں قوتِ نامیہ سے دھت ہر سال بھولنے پھلتے ہیں یہاں منبرِ دہاکہ سے جب دیکھیے فقراتِ برجستہ سے معانی تازہ نکلتے ہیں مجبوعہ ہے یا گنجِ شائگان۔

ہر باب میں ایسے ایسے بے بہا جو اہرِ حکمت کے بھرے ہیں کہ جب دیکھ کے جو ہری عقل کی عقل چکراتی ہے۔ ہر فصل میں اتنے نقدِ کامل عیارِ دانش کے انبار دھرے ہیں کہ مقتدار اُسکی صیرفیِ ذہن کے ذہن میں نہیں آتی۔ یہ وہ جو ہر ہے جس کے رکھنے کو حلقہٴ چشمِ درجک ہو تو بجا ہے اور یہ وہ نقد ہے جس کے پرکھنے کو سویدائے دل محک ہو تو زیبا ہے۔ شہرِ علم کے مفلسوں کو صلائے عام ہے کہ اس کی سیر کو آنکھیں کھولیں، دامنِ نگاہ میں موتی رولیں، دیارِ دانش کے ناداروں کو اہازتِ تام ہے کہ اس گنجینہ کے دیکھنے کو آئیں، جتنا حوصلہ ہو اُٹھائیں، خالی ہاتھ نہ جائیں، کتابا لسی کیوں نہ ہو جب مصنف اس کا وہ ہے جسکی فصاحت نے سبحان کے منہ میں قبر کی مٹی سے خاک بھری اور جس کی جادو بیانی نے سحرِ بابل کی قدر مٹی کی۔ یعنی فاضل بے بدل، عالمِ عدیم الشئ، منشیِ اعجازِ نگار، شاعرِ سحرِ گفتار، مولانا غلام امام شہید جن کا ثانی فضل و کمال میں نہ دید ہے نہ شنید۔ تحریرِ عربی سے اُن کی اعشی اور جریر کی پیٹہ قبر میں نہ لگی تھی۔ شرفِ فارسی سے ظہورِ می اور طغرائے خوابِ عدم میں چین سے نہ سوئے تھے شعر نے انورِ می کو بے نور، خاقانی کو ٹکڑا کر دیا تھا۔ اب اُن کی اُردو سے سودا کی روح کو سودا ہو گا، میر اپنا مرنا غنیمت جانیگا، ہوس کو پہلے ہی خوب سوچھی جو تخلص اختیار کیا یعنی درپردہ معذرت چاہی کہ میں تو ہوس کرتا ہوں، کمالِ خی او کسی کا ہے۔ سوز کو بھی اُن کی خبر پہنچ گئی تھی کہ آتشِ رشک سے جگر یہ تخلص اپنے حسبِ حال رکھا، نامِ رخ اب ہوتا تو منصفی سے تخلص اپنا منوِخ مشہور کرتا، آتش نے مرنا تو کیسا کیسا جلتا؟ اُنکی اس شرنے رتبہٴ نظم کا کھودیا، استادوں کا سفینہ

دریائیں ڈبو دیا۔ سچ تو یوں ہے کہ اُن کی حیثیت اور اُردو نویسی زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اسپرچی اگر تفتنِ طبیعت کے لیے ادھر کچھ میل کرتے تو ایسی لکھتے کہ اُن کی اُردو کے سامنے غلامی اپنی نشا سے خطِ غلامی لکھتا۔ بہارِ دانش کی بہار پر خزاں کا وقت آ جاتا۔ سہ شہر ظہوری کو لوگ چھپا ڈالتے طغرائی تحریر کو خطِ باطل کی طرح مٹا ڈالتے۔ پر اس سے مجبور ہوئے کہ فرمائشِ شریعت کی محی کو اُنہیں اُس سے عارتھا، پر حکم ماننا ناچار تھا، لیکن لوٹ جانے کی جا ہے کہ اس سادگی میں سیکڑوں طرحِ حدادی کا مزا بھرا ہے۔ اپنے نزدیک گو کچھ نہ لکھا ہو پر کیا کچھ لکھا ہے، اگر انصاف کیجیے تو ایسی کتاب اُردو میں آج تک کوئی نہیں ہوئی، اُردو کو رتبہ فارسی کا بخشا ہے، اُردو نویوں کو سامانِ انشا پر داؤ کی عطا کیا ہے، اس کی بدولت ہر ایک اُردو نویس اب ایسا منشی بن گیا ہے کہ فارسی اُستادوں کو اُن کے آگے سکتا ہے، ان میں سے کب کوئی دیا لکھ سکتا ہو بلکہ یہ کتاب اُردو نویوں ہی کے حق میں مفیدِ مطلب نہیں ہے، ہر ایک قاعدہ اس کا فارسی دالوں کے حق میں بھی اکیسرا نسخہ ہے۔ مصنف نے جو اس کتاب کی تصنیف عاجز کی تکلیف دینے سے اختیار فرمائی، میری زبان میں کیا ثابت ہوا ہے کہ اس کا شکر ادا کروں۔ یہ تقریظ تو کیا اگر دفتر کے دفتر لکھوں، ایک حرف ادا نہ ہو، اس لیے دعا پر ختم کرتا ہوں۔ الٰہی! جب تک معنی سخن میں اور سخن حرف میں، حرف خط میں اور خط جانِ قالب کتاب میں ہوا نشندوں کا تعویذ جاں اس کتاب کا ہر ایک باب ہو، یہ دعا یہ تجھ کی سبب ہو۔“

تقریظ کیا ہے بالکل قصیدہ مدحیہ ہے، تعریف کرنا اور خوبیاں دکھانا قابلِ اعتراض نہیں لیکن انہوں نے یہ ہے کہ زمین و آسمان کے قلابے تو ملائے جاتے ہیں مگر اتنا بھی نہیں لکھا جاتا کہ اس کتاب میں کیا کیا مضامین و درج ہیں اور مصنف نے کن مباحث پر قلم اُٹھایا ہے۔ کیا کیا خاص بیبا ہیں اور کیا کیا بدلت طرازی ہیں۔ یہ تعریف انشاء ہے ہمارے خزانوں کے لیے مخصوص نہیں اگر کتاب کا نام اور مصنف کا نام بدل دیا جائے تو ہر کتاب کے لیے موزوں ہو سکتی ہے۔ اگر لیر تسلیم بھی کر لیا جائے کہ اُس زمانہ میں تنقید کا رواج نہ تھا اور تعریف ہی تعریف مقصود بالذات تھی

تو ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ ہمارے ان بزرگوں کو محض تعریف کرنا بھی نہیں آتا تھا۔ وہی تعریف سبحان اور نہ شرملا خلموری کی تشبیہ زبان پر چڑھی ہوئی تھی اور وہی سستلہ اور مستاولہ الفاظ و فقرات قلم سے نکلتے تھے۔ دراصل ان لوگوں کی نظر بالکل سطحی تھی اور ژرف نگاہی معدوم تھی۔ ہاں اس دور کے مصنفین میں مرزا غالب اس عیب سے بری ہیں، اُن کے خطوط دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی کتاب کی تقریظ میں مصنف کی ضرورت سے زیادہ تعریف نہ کرتے تھے منشی ہرگوپال تفتہ نے جن سے مرزا غالب کو بجدیگانگت اور محبت تھی اور اکثر اُن کو مرزا تفتہ لکھتے اور بولتے تھے اپنی کسی کتاب کی تقریظ کے متعلق مرزا غالب کو شکایت لکھا کہ آپ نے تقریظ کچھ بھی نہ لکھی یعنی جو طریقہ فرمودہ اُس وقت انہوں نے روزگار کا تھا آپ نے اُسکی تقلید نہ کی تو مرزا صاحب جواب میں لکھتے ہیں:-

”واحد باشد اگر کسی شاہزادے یا امیرزادے کے دیوان کا دیباچہ لکھتا تو اُسکی مدح اتنی نہ کرتا کہ جتنی تمہاری مدح کی ہے۔ ہم کو اور ہماری روش کو اگر پہچانتے تو اتنی مدح کو بہت جانتے۔ قصہ مختصر تمہاری خاطر کی اور ایک فقرہ تمہارے نام کا بد لکھ اُس کے عوض ایک فقرہ اور لکھ دیا ہے۔ اس سے زیادہ بھٹی میری روش نہیں“ (دیکھو حالات مرزا غالب)

### خط مولانا غلام امام شہید کے نام

”قبلہ میری شوخی دیکھیے! یوسف کو آئینہ دکھاتا ہوں، خورشید کو روشنی کی حکایت سناتا ہوں۔ گلزار میں پھول لے جاتا ہوں، صحن میں مُشک تھمے بھجھتا ہوں۔ دریا کے سامنے نہلی کے معانی بیان کر رہا ہوں، چاند کے روبرو نور افشانی کا مہل حل کرتا ہوں، بعل کے حضور میں رنگ کی دُکان کھولتا ہوں، قند کے مواجہ میں شیرینی تولتا ہوں، میسجاسے کہتا ہوں جاں بخشی کی روایت سنئے، موسیٰ سے تمنا کرتا ہوں کہ یدِ بیضا کی چمک دیکھیے یعنی حضرت کا دیوان مرتب کر کے آپ کے حضور میں پیش کرتا ہوں۔ میرے لیے اُس کے دیباچہ لکھنے کا ارادہ کرنا ایسا تھا جیسے ایک فقیر شاہی خزانوں کے اہتمام کا قصد کرے، ایک غیشہ گز میرا ترانے کی آزد

میں مرے۔ اندھا چاہے کہ قدرت کے نظارہ سے خطا اٹھائے، گونگا چاہے کہ فصاحت کا سکہ بٹھائے۔ مگر چونکہ غلبہ شوق میں تنہا باقی نہیں رہتی، یہ خیال نہیں ہوتا کہ میں کیا ہوں اور کیا کرتا ہوں، دیا باج بھی لکھ ڈالا، وہ اُسکے قابل تو کا ہے کو ہے، آپ کے دیوان پر میرا دیا باج ایسا ہے جیسے موتی کی لڑی میں شکریرہ کا آدیزہ لگا ہو یا زربفت کے قبا میں جھینٹ کا حاشیہ لکھا ہو۔ مانی کی تصویر کے گرد ایک نوشق لکیریں بنا دے۔ سبحان کے کلام کی ایک ابجد خواں شرح لکھا دے مگر اس نظر سے کہ ہر چیز اپنی منہ سے پہچانی جاتی ہو بد صورت کے مقابلہ میں حسین کے حسن کو اور رونق ہوتی ہے، شب تار میں شمع کی روشنی زیادہ ضیا دیتی ہے۔ کہاری پانی پینے کے بعد قند کے شربت میں اور ہی مزا آتا ہے صحرانوحی کے بعد باغ کا لطیف کہانیں جاتا ہے۔ خاطر مشکل پسند، پسند کرنے تو ہو سکتا ہے۔ بیشک دیکھنے والوں کو اس کی بُرائی اُس کی خوبی زیادہ دکھا دیگی۔ ستارہ دیکھ کے جو چاند دیکھے اُسے روشنی زیادہ نظر آئیگی۔ میری خوش طالعی ہے اگر یہ قبول ہو، اُس کے لیے شرف ہے اگر دیوان میں داخل ہونے کی عزت اُسے حصول ہو ۛ



## منشی عبد الحکیم

آپ کا بولد و منشاء شہر لکھنؤ ہے۔ آپ جس وقت کلکتہ میں عمدہ میر منشی گری دفتر فارسی ذاب گورنر جنرل بہادر سے متنازع تھے، اُس وقت آپ نے مشہور کتاب الف لیلہ کے ترجمہ کا قاعد کیا لیکن اصل عربی کتاب میسنر آنے سے کچھ دنوں کے لیے یہ ارادہ ملتوی کرنا پڑا آخر پیش لینے کے بعد آپ نے ۱۸۵۷ء میں انگریزی ترجمہ سے اردو میں ترجمہ کیا جو ۱۸۵۸ء میں ختم ہو کر چھپا۔ بعد ازاں ۳۲ سال بعد ۱۸۸۷ء ہجری میں بغرائش مطبع نو لکھنؤ مطبع نظامی میں یہ الف لیلہ کا اردو ترجمہ طبع ہوا۔ اور مترجم نے اس مرتبہ عمدہ عمدہ تصادیر الف لیلہ انگریزی

مطبوعہ لندن سے لیکر ہر محل اور موقع پر شامل کیں تاکہ شائقین کی دلچسپی اور مسرت کا باعث ہو  
ہمارے پیش نظر اس وقت مطبع مصطفیٰ کا چہرہ ر کا چاہو انہو ہے جو ۱۲۹۵ھ  
میں مطبوع ہوا ہے۔ آپ کا سن ولادت و وفات معلوم نہیں ہوا سن ۱۲۹۵ھ ہجری تک یقیناً آپ  
زندہ تھے۔

آپ کا انداز تحریر عبارت آرائی اور رنگینی سے پاک ہے۔ اگرچہ مرزا حبیب علی بیگ  
سرور کی مشہور کتاب فسانہ عجائب شہرت عام و بقائے دوام کے دیباچہ میں جگہ پا چکی  
تھی مگر چونکہ آپ کا زیادہ تر تعلق کلکتہ سے رہا اور آپ نے یہ کتاب اس غرض سے ترجمہ کی  
تھی کہ صاحبان عالی شان کو پسند آئے اور مدارس سرکاریں رواج پائے اس لیے آپ نے  
دورِ اول کے اُن مصنفین کی تقلید کی جن کا تعلق فورٹ ولیم کالج کلکتہ سے تھا اور سرور کی  
تقلید سے آزاد رہے، چنانچہ آپ نے صاف صاف، سیدھی سادی عبارت میں ترجمہ کیا  
اور مقفّے و مسجع عبارت سے پرہیز کیا۔

ہم آپ کے دیباچہ سے بطور نمونہ کچھ عبارت نقل کرتے ہیں اور یہی طرز آپ کی کتاب  
الف لیلہ میں ہر جگہ پایا جاتا ہے۔

”جس طرح مطالعہ کتب تواریخ سے عجائب و غرائب واردات اور حال سلاطین باضیہ  
والشہندوں کو موجب بصیرت کا ہر ایک امر میں ہوتا ہے اسی طرح کتب قصص اور حکایات سے  
کہ ماقولوں نے ہر ایک زبان میں واسطے تجربے اور تفریح خاص و عام کے تالیف کی ہیں،  
ہر ایک کو فوائد کثیر حاصل ہوتے ہیں خصوصاً متبدیوں کو کہ قصد زبان دانی کا رکھتے ہیں۔ ایسی  
کتابوں سے ہمارے لکھنے اور پڑھنے اور بول چال کی جو جاتی ہے اور راقم الشیم کو.....  
ابتداءً شعور سے کمال غور و دیکھنے کتابوں تھے کہانی کا تھا اور سب قصوں میں تنہا الف لیلہ  
کی زیادہ رستی تھی اور وہ عربی میں الف لیلۃ و لیلۃ یعنی ایک ہزار ایک رات سے،  
..... وہ کتاب سواد و سورات کے کہ جس کو شیخ احمد عربی شہر دانی نے

واسطے پڑھانے صاحبان عالیشان کالج کلکتہ کے کمال تلاش عرب سے منگو اگر چھپوایا تحف  
میسر نہ آئی آخر کار جب راقم بسبب شدت امراض کے بعد تقریباً بیس سال سلطنت  
لکھنؤ میں کہ مولد اپنا ہے خانہ نشین ہوا وہ نسخہ تمام و کمال انگریزی زبان میں مع تصویرات  
بہم پہنچا۔ راقم نے اسکو ازل سے آخر تک بسبب استعداد سمجھے انگریزی کے دیکھا۔ از بسکہ تفتہ  
دیکھتے دیکھتے ڈوبرس تک اسکا ترجمہ کرنا رہا اور ۱۲۵۵ھ ہجری میں تمام کیا۔ شہر میں شہرہ ہوا  
اکثر لوگوں نے منگو اگر نقل اس کی لی، کمتر مسودہ راقم کے گھر رہا، دست بدست پھرا کیا۔  
چنانچہ پانچ سات جز تلف ہوئے، راقم کو اس کے لکھنے میں دوبارہ تکلیف کرنا پڑی، اور  
طلب کرنے احباب سے نہایت تنگ آیا، جس کو نہ دیا وہ غنا ہوتا اور دینے میں اپنی کتاب سے  
ہاتھ دھوتا۔ آخر کو خیال ہوا کہ یہ کتاب چھپ چائے تا سبک لاء آئے اور راقم بھی ایک ایک نسخہ  
اسکا عزیزوں اور دوستوں کو بانٹے۔ فقط اسی واسطے راقم نے جس طرح ہو سکا بیچ عہد معدلت  
بادشاہ جم جاہ، خاقان زماں ابوالظفر مصلح الدین محمد امجد علی شاہ بادشاہ غازی ملک  
اودھ خلد اللہ ملکہ اور وزارت وزیر اعظم، نواب امین الدولہ عماد الملک امراء حسین خاں  
بہادر ذوالفقار جنگ دام اقبالہ کے چھپوایا اور سنہ ہجری طبع اس کتاب کے ۱۲۶۳ھ  
عیسیٰ ۱۸۴۷ء میں.....

## منشی احمید مینائی

|           |                                                                                                                                                                                                                                                                                                     |
|-----------|-----------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------|
| ولادت اور | آپ شاہ نصیر الدین حیدر بادشاہ اودھ کے عہد میں ۱۲۱۷ شعبان ۱۲۵۵ھ ہجری                                                                                                                                                                                                                                 |
| خاندان    | روز دوشنبہ بمقام لکھنؤ پیدا ہوئے، آپ کا نسبی سلسلہ بہت ہی قریب حضرت<br>مخدوم شاہ مینا صاحب نور اللہ مرقدہ سے ملتا ہے، جن کا مزار مقدس لکھنؤ میں زیارت گاہ خانقاہ<br>وعام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جناب امیر کے نام نامی کے ساتھ مینائی لکھا اور بدلا جاتا ہے، آپ<br>مولوی کرم محمد مغفور کے خلیف اکبر ہیں۔ |

آپ کا تذکرہ اس چونکہ آپ نے حیدر آباد دکن میں ۱۹ جمادی الآخر ۱۳۱۷ ہجری  
دوڑ میں کیوں کیا گیا مطابق ۱۳ اکتوبر سنہ ۱۹۱۷ء کو رحلت فرمائی ہے، اس لیے آپ کا

ذکر خیر تیسرے دور کے مصنفین کے ساتھ ساتھ ہونا چاہیے تھا لیکن آپ کی کتاب

انتخاب یا دو گار جس کا انتخاب ہم آگے چلکر بدیہ ناظرین کرینگے لمحاظ زبان مرزا

رجب علی بیگ سرور کی فسانہ عجائب سے ملتی جلتی ہے اس لیے ہم نے یہ مناسب

خیال کیا کہ آپ کے حالات زندگی اسی طبقہ کے مصنفین کے ساتھ بیان کیے جائیں۔

علاوہ ازیں تیسرے دور کے مصنفین اس اعلیٰ پایہ کے ہیں کہ ایک یا دو کتاب کے مؤلف

کو اُن صدر نشینانِ بزمِ اُردو کے ہم پلہ جگہ نہیں دی گئی اور نہ دی جاسکتی تھی۔ نواب

محسن الملک۔ مولوی سید کرامت حسین۔ مولوی عزیز مرزا وغیرہم اُن بزرگوں کے پیشین

ہیں حالانکہ قابلیت کے لحاظ سے یہ لوگ بھی کچھ اُن سے کم نہ تھے خصوصاً مولوی سید

کرامت حسین کا درجہ لمحاظ علمیت اُن میں سے اکثر سے فائق و برتر ہے اور اُن کی

کتاب افراد کا سبہ اُن کی علمیت اور حکمت کی تین دلیل ہے۔ نیز آپ کی دو کتابیں

ارشاد السلطان اور ہدایت السلطان۔ فسانہ عجائب کے کچھ ہی بعد کی تصنیف

ہیں اور آپ بلا تکلف دوسرے دور کے مصنفین کے ساتھ پہلو بہ پہلو جگہ پاسکتے ہیں۔

عادات و آپ کو صرف خاندانی فضیلت ہی حاصل نہ تھی بلکہ اپنی ذات سے خود بھی ممتاز

خصائل زہد و تقویٰ۔ صوفی مشرب۔ خدا پرست۔ درویش صفت، منکسر المزاج

آدمی تھے۔ خاندانِ چشتیہ مبارکہ کے سجادہ نشین حضرت امیر شاہ صاحب بیعت

رکھتے تھے اور بعد میں فرقہ خلافت سے بھی سرفراز ہوئے تھے۔

تعلیم آپ کی تعلیم قدیم دارالعلوم فرنگی محل لکھنؤ میں ہوئی تھی۔ فہم سلیم اور ذہانت

قطری کی امداد سے عربی و فارسی میں کامل دستگاہ رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ طب،

جفر، نجوم وغیرہ میں بھی اچھی معلومات تھیں، اور شاعری میں تو آپ سلم الثبوت استاد

تسلیم کیے گئے ہیں۔ اس فن میں آپ کو منفی مظفر علی خاں اسیر سے تلمذ تھا۔ الغرض آپ کا ابتدائی زمانہ تحصیل علوم و فنون ہی میں بسر ہوا۔

**واجد علی شاہ کے** ۱۲۶۹ ہجری میں آپ کو سلطان عالم و اجد علی شاہ اختر کے دربار و بارو میں دربار میں ماریا بی میں باریابی ہو گئی اور حسبِ حکم سلطانی دو گنا میں ارشاد السلطان اور ہدایت السلطان تصنیف کیں جن کے جلد و میں خلعتِ فاخرہ اور انعام عطا ہوا۔ اور اُس وقت سے آپ کی شہرت کا زمانہ شروع ہوا۔ اسی اثنا میں اودھ کا الحاق ہو گیا اور چند روز آپ خانہ نشین رہے۔

**رامپور کی طلبی اور** بعد ازاں ۱۲۷۵ ہجری میں آپ کی معجز بیانی کا شہرہ منکر فردوس مگلا **مستقل سکونت** نواب محمد یوسف علی خاں بہادر ناظم تخلص نے طلب فرمایا، اُس وقت سے آپ کی مستقل سکونت بجائے لکھنؤ، رامپور ہو گئی۔ ریاست کی طرف سے عدالت دیوانی کے ایک رکن ہو گئے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب کہ دہلی اور لکھنؤ کے تمام اہل کمال نواب صاحب کی قدردانی و قدر افزائی کے سبب یہیں آکر جمع ہو گئے اور جن میں سے اکثر آخر وقت تک وہیں رہے۔

نواب فردوس مگلاں کے انتقال کے بعد ۱۲۷۸ ہجری میں نواب جلد آسٹیاں کلب علیاں بہادر کا عہد حکومت آیا، اُردو شاعری کو ادبی فروغ ہوا۔ یہ وقت جناب امیر بینائی کے آفتاب اقبال و کمال کے عروج کا تھا۔ یہاں تک کہ حضرت امیر کو نواب کی اُستادی کا فخر حاصل ہوا۔ اُس وقت رامپور میں مرزا داغ، اسیر، حیا، متیر، جگر، زکی، قلع، عروج، حلال، شافل، تسلیم، رسا وغیرہ کا جھگڑا تھا اور کبھی کبھی حضرت غالب بھی دہلی سے تشریف لاکر اس یادگار مجزم کو اپنی صدارت سے اعزاز بخشے تھے۔

**لقصیف و تالیف** آپ کی تصانیف اکثر شائع ہوئیں اور بعض محضوریں، ایک اُردو دیوان موسوم بہ غیرتِ بابرستان جو اُس زمانہ میں مکمل و مرتب ہو گیا تھا ایامِ غم کی دست برد کی نذر ہوا و تاؤ فوجا و اشعار یاد آتے گئے وہ دوسرے مسودوں میں جمع ہوتے گئے جب کا کچھ حصہ دیوانِ منتخب

میں لکڑیاں شائع ہوا۔ غدر کے بعد دوسرا دیوان موسوم بہ مرآۃ الغیب جو دراصل پہلا دیوان سمجھا جاتا ہے  
نعتیہ دیوان اور مولود شریف کے ساتھ چھاپا۔ ۱۸۹۱ء میں دوسرا عاشقانہ دیوان موسوم بہ صنم عاشق  
چھاپا۔ تذکرہ شعرائے راسخو معروف بہ انتخاب یادگار جو نواب کلب علی خاں کی فرمائش سے لکھا گیا تھا  
۱۲۹۰ ہجری میں شائع ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ آپ نے ایک اور قابل قدر تالیف یعنی فرہنگ  
زبان اردو معروف بہ امیر اللغات کا سلسلہ اخیر زمانہ نواب کلب علی خاں میں شروع کیا، جس کا  
باقاعدہ کام نواب مشتاق علی خاں کے عہد تک جاری رہا۔ اس فرہنگ میں آپ نے اردو زبان کے  
تمام لغات اختلافی و غیر اختلافی و محاورات نہایت محققانہ اصول سے لکھنے شروع کیے تھے مگر ان کو  
کہ یہ تالیف نامتناہی ہے اور صرف دو جلدیں جن میں الف ممدودہ اور مقصورہ کے الفاظ میں شائع  
ہوئی تھیں کہ آپ کا جام حیات لبریز ہو گیا۔ حضرت امیر کے بعض خطوط بھی شائع ہو گئے ہیں جن میں  
اکثر مقامات پر لفظ زبان کے ساتھ ساتھ طرزِ ادا سے جیاں نہایت دلکش اور بے ساختہ ہے۔

سیاحت حیدر آباد و کن  
اور وفات

اس لغت کی تکمیل کے خیال سے آپ کو سیاحت حیدر آباد و کن کا شوق و انگیزہ  
چنانچہ اپنے دوست نواب فصیح الملک مرزا اداس کی تحریک اور توسل سے  
بنارس میں حضور نظام نواب محبوب علی خاں کی تقریریں آوری کے موقع پر آپ کو باریابی کا اعزاز حاصل  
ہوا، اور قصیدہ تنبیت کے پیش کرنے کا بھی موقع ملا۔ پھر اگلے سال ۱۳۱۸ ہجری میں راسخو کو خیر باد  
کہہ کر چند روز بیوی پال میں قیام فرمایا۔ اور ۱۰ جمادی الاول کو آپ حیدر آباد پہنچے۔ آپ کے صاحبزادے  
منشی لطیف احمد اختر اور جناب جلیل اس سفر میں آپ کے ہمراہ تھے۔ نواب فصیح الملک نے نہایت غلیظ  
و محبت سے استقبال کر کے اپنا مہمان کیا۔ مگر انوس صمدنوس کہ یہ سفر اس نے آیا اور وہاں پہنچے ہی آئے  
بیمار ہو کر پھر نہ سنبھلے۔ چند راتیں نہ تھکے سرشار اور مرزا اداس اور دیگر احباب شبانہ روز آپ کی تیمارداری  
میں مصروف رہے بلکہ ہمارا جہاں سرکش پرشاد پیشکا و وزیر بھی کئی مرتبہ مزاج پرسی کے لیے آئے مگر کوئی  
تدبیر کار گرنہ ہوئی اور روز بروز حالت گہرائی گئی کم و بیش یک مہینہ کی علالت کے بعد ۱۰ جمادی الآخر  
۱۳۱۸ ہجری مطابق ۱۳ اکتوبر ۱۹۰۰ء کو رگڑائے عالم باقی ہوئے، اور وہیں مدون ہوئے۔

افس تجھ کو رحم نہ آیا کچھ اے حبیل مارا کہاں امیر غریب الدمار کو  
**اولاد** آپ نے چدرائے کے یادگار جوڑے منی محمد احمد محمد قمر منی ممتاز احمد آرزو منی مسعود احمد فقیر  
 اور منی لطیف احمد اختر۔

**مکان میں** شہ ہے کہ ۱۸۹۹ء میں جناب امیر کے مسکن مکان میں اتفاقیہ آگ لگ گئی تھی اور آپ کی  
**آتشزدگی** بعض تصنیفات نذر آتش ہو گئیں۔ اس سے زیادہ افسوس اس امر کا ہے کہ بعض تصنیفات  
 اب تک شائع ہو نہ سکیں۔ اگرچہ وہ ان کے صاحبزادوں کے پاس بطور ترکہ موجود ہیں۔

**انتخاب یادگار** جیسا کہ پیشہ ذکر ہو چکا ہے آپ نے ایک تذکرہ ان شاعروں کا لکھا ہے جو ریاست رامپور  
 کے متوسل ہے، اس تذکرہ کا نام انتخاب یادگار ہے اور یہ نام تاریخی بھی ہے۔ ۱۸۵۷ء میں یہ کتاب  
 طبع ہوئی ہے جس کے معنی ہیں کہ اس کتاب کو تحریر ہوئے ۱۵ سال سے زائد ہو گئے زبان، فسانہ، عجیب  
 کی طرح مصطفیٰ و مسیح ہے چونکہ امیر عین ملی بھی لکھنے کے تھے اور اس زمانہ کے حالات سے معمولی زبان  
 میں جو روزمرہ تقریر کا ذریعہ تھی کوئی تحریر لکھنا زیادہ قابل تعریف نہ تھا، اگرچہ سر سید اپنی تحریرات  
 سے لڑ بچر میں انقلاب پیدا کر دیا تھا مگر بعض لوگ لکیر کے فقیر تھے اور انہیں قدامت پسندوں میں جناب آیت  
 پس سرور کی تقلید سے امیر مرحوم کیلئے بھی آزاد ہونا مشکل ہو گیا۔ چنانچہ انہوں نے وہی طرز اپنی کتاب  
 کا اختیار کیا جس کو ہم فسانہ عجائب میں پاتے ہیں۔ چار سو دس شاعروں کا حال اس کتاب میں قلمبند  
 کیا گیا ہے اور اس میں ۴۷۷ صفحات ہیں جسبہ حسبہ مقام سے بطور نمونہ انتخاب کیا گیا ہے۔

”نمنہ قلم پر شہسوار سخن کی تاکید ہے کہ میدان حمد الہی میں قدم اٹھا، اور تیغ زبیل پر بوقت  
 ناطقہ کی تحدید ہے کہ اس معرکہ میں جو ہر دکھا۔ مگر یہ منزل ایسی کڑی ہے کہ دونوں کو مشکل پڑی ہو  
 نہ اُسکا پاؤں نہ اس کا ہاتھ اٹھ سکتا ہے، اس عجز کو دیکھ کر عقل حیران ہے اور ول کو سکتہ ہے کہ تحریر  
 و تقریر کا تو یہ حال کہ نہ قلم کو لکھنے کی تاب نہ زبان کو گوئی کی مجال پھر کوئی کردار ہی ناپید کنار حمد تمام ہو  
 جسکی ذات کی ہدایت، صفات کی نہایت، ہر کس طرح اُسکی تسکین کا سرانجام ہو۔ اسحق وہی باطن  
 وہی ظاہر ہے۔ وہی اول ہے وہی آخر ہے، گفتگو کے بے سرو پا اُسکی شناسائی کی گنجائش کہاں پائے، قلم

میں دریا، ذرے میں مہر کیونکر سمانے، عجیب بارگاہ کبریائی ہے کہ وہاں رسائی کا طریقہ نامرئی ہے، انسان ہمت ہار دے اور اس بازی کو جیت لے۔ وادی معرفت الہی طے ہوئی کی یہی پہلی آجھڑی عین الذلالت اور اذراک اسی پر دلیل ہے۔ کہیں کہیں عبارت مٹا اور سادہ بھی ہو سکتا۔

”احمد تخلص سید عین الدین احمد ولد سید معین الدین احمد۔ سلسلہ ان کے نسب کا حضرت امام ربانی شیخ مجدد الف ثانی قدس سرہ العزیز تک پہنچتا ہے، بارہ سو پینتالیس ہجری انکا سال ولادت ہے۔ ماہ ربیع الاول کی بارہویں تاریخ بارہ سو بیاسی ہجری زمانہ رحلت ہو۔ اس حساب سے ۳۷ برس کی عمر ہوئی، میاں احمد حسین راحت سے تلمذ تھا۔ سکندر نامہ زبان اردو میں لکھا

موزوں کیا ہوا ملا۔ اس سے یہ کلام منتخب ہو کے لکھا گیا۔ اشعار سکندر نامہ

|                               |                              |
|-------------------------------|------------------------------|
| ہوا جبکہ تابندہ ہر منیر       | صف آرا ہوا شاوگردوں سیر      |
| جوان وہ جو تھے شیر صحرائے جنگ | چلے دشمنوں کی طرف بے درنگ    |
| ملے دونوں لشکر ہم اس طرح      | کہ سادوں سے بھا دوں ملے صلیح |
| کسی سمت تھے گرد آتش فشاں      | کہیں پار سینوں کے نوک بنیاں  |
| کوئی نہ بچا تھا کوئی خستہ تن  | میتھر کسی کو نہ آ یا کفن ڈ   |
| پڑی لاش پر لاش تھی اس قدر     | کہ کشتوں کے پتے ہوئے سر بسر  |

معلوم ہوتا ہے یہ کتا شائع نہیں ہوئی ورنہ ہم شاہنامہ اردو کی طرح سکندر نامہ اردو بھی بازار میں فروخت ہوتا ہوا دیکھتے۔ نہایت عمدہ اور صاف ترجمہ ہے، کاش یہ سکندر نامہ مرحوم کے وارثوں کے پاس محفوظ ہوا اور وہ اسکی اشاعت کریں تو بہتر ہو۔

پھر وہی انداز ہے:-

”تسلیم شیخ امیر اللہ ابن مولوی عبدالصمد انصاری، ان کے بزرگوں کا وطن قدیم مین آباد، مرزا محمد صغر علی خاں نسیم دہلوی ان کے استاد لکھنؤ میں نشو و نما پائی۔ حضور پر نور (یعنی نواب گلشن علی خاں والی رامپور) دام ملک ہم کی قدر دانی یہاں لکھنؤ لائی۔ بادلن برس کی

عمر ہے، چار مثنویاں اور دو دیوان اردو دان سے یادگار ہیں۔ یہ انکے منتخب اشعار میں ہے۔  
مرزا غالب کا حال لکھتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:-

”معلومات انکی زبان فارسی میں کائنات فی رابعۃ النہار آشکار ہے، شعر و نظم اردو کی چار انگ بندوتاں میں پکار ہے، تالیفات و تصنیفات کے نام یہاں لکھے جاتے ہیں۔ فارسی میں کلیات جس میں غزلیں دیف وار ہیں اور قطعات اور قصائد اور رباعیات اور مثنویاں سب قسم کے اشعار ہیں۔ قادر نامہ جو خالق باری کی طرز پر موزوں کیا ہے مہر نیمروز اور ماہ نیم ماہ یہ نثریں دو تالیفیں ہیں۔ تاریخ اول میں شاہ تیمور سے ہمایوں تک حال لکھا ہے اور تاریخ ثانی میں عبداللہ الدین اکبر بادشاہ سے بہادر شاہ کے عہد تک احوال ضبط کیا ہے۔

دستنبیو جس میں غدر کے واقعات ہیں۔ قاطع برہان جس میں برہان قاطع کی بعض لغات پر خدشات ہیں۔ پنج آہنگ اس میں فارسی زبان کی مندرجات ہیں۔ اردو میں ایک دیوان اور اردوئے معلیٰ اور عود ہندی ان دونوں میں اردو زبان کے خطوط ہیں۔ اس حاصل مرزا صاحب کی طباعی اور ذکاوت ان کے نتائج افکار سے پیدا ہے، بات سے بات پیدا کرنا تمام کلام سے ہو یا ہے۔ اس سرکار فیض آثار کے فنکار قدیم ہیں۔ جناب غفران آب نواب محمد یوسف علیخان صاحب بہادر فردوس مکان طاب ثراہ کو ان سے تلمذ ہے۔ اُس عہد میں بھی وظیفہ خوار ہے۔ بندگان ولی نعمت ابد اللہ ظلال اجلالہم کے عہد دولت میں بھی جب تک زندہ رہے موردِ پرورش پے شمار ہے۔ ہم ۷۷ برس کی عمر پائی۔ بارہ سو پچاسی ہجری میں ذیقعدہ کی دوسری تاریخ وفات پائی۔ سلطان نظام الدین حضرت محبوب الہی قدس سرہ العزیز کی درگاہ میں دفن ہوئے۔ یہ اُن کے کلام کا انتخاب ہے جس کا ہر حرف لاجواب ہے۔“

۱۔ جناب امیر کو غلط معلوم ہوا کہ ماہِ نیم ماہ بھی لکھی جا چکی ہے۔ مرزا غالب نے خود اپنے ایک خط میں لکھا ہے کہ اس نامی نام ہے، اور تاریخی واقعات لکھنے کی نوبت نہیں آئی (دیکھو حالات جناب میرزا غالب) ۱۲

انتخاب یا دوکار میں جس شاعر کا بھی کلام درج کیا گیا ہے وہ اُس کا نہایت عمدہ نمونہ ہے، اور یہ بھی التزام رکھا ہے کہ مذاقِ سخن سے نہ گرنے پائے۔ چنانچہ بعض شعراء کے کلام میں صرف ایک یا دو شعر ہی پسندِ خاطر ہو کر چھاپا گیا ہے۔

—(\*)—

## خاتمہ

اس دور کے مصنفین کی تعداد بہت کم ہے لیکن پہلے دور سے زبان کی عمدگی اور شستگی میں یہ دور سبقت لے گیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ پہلے دور کی زبان سادہ اور عام فہم ہے اور اس دور میں قافیہ بندی کا بہت زور ہے۔ نئی نئی تراش اور خراش پائی جاتی ہے، عمارت میں رنگینی بہت زیادہ ہے، فارسی کا تتبع بہت کچھ ہے۔ تاہم ہر شخص کا حوصلہ نہیں کہ اہلِ قلم بن جائے۔ اس دور کے مصنفین اعلیٰ قابلیت کے لوگ ہیں اور سب کے سب فارسی اور عربی سے بہرہ وافی رکھتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔

آزاد آبجیات میں ایک جگہ لکھتے ہیں کہ ۱۸۴۷ء میں ایک دہلی کالج سوسائٹی قائم ہوئی، اور انگریزی سے اردو میں بہت سی کتابیں اس سوسائٹی کے زیرِ اہتمام ترجمہ ہو کر شائع ہوئیں، اس سوسائٹی کا حال ہم کو کچھ نہ معلوم ہو سکا۔ لیکن اس دور کے شائع میں جو فہرست کتب ہم نے دی ہے اُس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ضرور اس سوسائٹی کا وجود تھا اور اسٹراٹھمچند صاحب اس سوسائٹی کے رکنِ اعظم تھے علاوہ ازیں جو کتابیں دہلی کی مطبوعہ ہیں وہ یقیناً اسی سوسائٹی کی طرف سے شائع ہوئی ہیں کیونکہ زیادہ تر درسی کتابیں ہیں جو طلبائے کالج کے لیے ترجمہ کی گئی ہیں، اور غالب خیال یہ ہے کہ اس سوسائٹی کے اثر سے تمام اطراف و جوانب ہندوستان میں انگریزی سے کتابیں ترجمہ ہونی شروع ہوئیں۔

جس طرح دوبارہ اول میں فورٹ ولیم کالج کے اٹھ سے ہندوستان میں اُردو شرفیسی کا رواج  
 ہوا اسی طرح اس دور میں دہلی سوسائٹی کے ترجموں کی تقلید دوسرے مقامات میں کئی  
 چنانچہ آگرہ میں زیادہ اور دیگر شہروں مثل لکھنؤ، بنارس اور کلکتہ میں کچھ کم کتابیں انگریزی  
 سے اُردو میں ترجمہ ہوئیں۔ افسوس ہے کہ مولوی ذکاء اللہ صاحب یا مولوی نذیر احمد  
 صاحب کی حیات کے زمانہ میں یہ خیال نہ پیدا ہوا، ورنہ یہ دونوں بزرگ اس معاملہ  
 پر ضرور کافی روشنی ڈالتے کیونکہ وہ خود دہلی کالج کے تعلیم یافتہ تھے، اور اب کوئی شخص  
 ایسا نہیں جو اس بارہ میں ہماری رہبری کر سکے۔ ع

اے بے آرزو کہ خاک شدہ

تیسرے دور کے مصنفین نے کچھ انگریزی زبان کے زیادہ رائج ہونے کی وجہ  
 سے اور کچھ مرزا غالب کے آخری خطوط کی تقلید میں سجع اور مقفے عبارت کو ترک کر کے صاف  
 اور شستہ الفاظ میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اگرچہ تیسرے دور کے مصنفین میں  
 تخیل، طباعی اور جو شیلے اثرات بدرجہ اتم موجود ہیں، لیکن اُن کا اندازِ بیاں دوسرے  
 دور کے بزرگوں سے بالکل نرالا اور جداگانہ ہے اور قافیہ پیمائی کا محتاج نہیں ہے۔

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے

کہتے ہیں کہ غالب کا ہی اندازِ بیاں اور

— (\*) —

## جلد اول نمائش

(جزیہ تحریر نمود)

— (۱۹۲۲ء) —









